مجاز
شخص اور شاعر

معیزہ عثمانی

اس مقالہ پر مصنفہ کو الہ آباد یونیورسٹی نے ۱۹۸۰ء میں
ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری دی

طبع اول : نومبر ۱۹۸۵ء

تعداد : ۶۰۰

ناشر : معیزہ عثمانی ۲۰۳ دائرہ شاہ اجملؒ الہ آباد

طباعت : تاج آفسیٹ پریس الہ آباد

قیمت : پچیس روپیہ

ملنے کا پتہ

ناشر :

۲۰۳ - دائرہ شاہ اجملؒ الہ آباد

اور

۲۴۹ - مسجد روڈ - ذاکر نگر

(جامعہ نگر) دہلی ۲۵ - ۱۱۰۰

کتابستان، ۳۰ چک، الہ آباد ۳ -

شاہ اجمل اشاعت گھر ۱۹۹، دائرہ شاہ اجملؒ

الہ آباد

والد محترم محمد باقر عثمانی مرحوم اور والدۂ محترمہ
کی اُن پاک دُعاؤں کے نام جو زندگی کی
پُر پیچ راہوں میں میرا سہارا بنیں!

فہرست

شخص

شاعر

دیباچہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کی تنہا یونیورسٹی ہے جس کے پاس اپنا ترانہ ہے۔ یہ ترانہ روز گایا جاتا ہے اور تقریباً ہر طالب علم کو یاد ہے۔ برسوں پہلے اس کا ریکارڈ بھی بن چکا ہے اور حال ہی میں حکومت ہند کے فلم ڈویژن نے اس ترانے کی بنیاد پر ایک ڈاکومنٹری فلم بھی بنائی ہے جس کو مسلم یونیورسٹی کے ایک اولڈ بوائے اشتیاق خاں نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ یہ ترانہ یونیورسٹی کے سب سے زیادہ مقبول شاعر اسرار الحق مجاز نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں نذر علی گڑھ کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ بات یقین اور وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی آغوش سے جتنے شاعر اٹھے اُن میں سب سے زیادہ مقبولیت مجاز کو ملی۔ (سب سے زیادہ احترام مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی کو ملا) اور سب سے زیادہ دلآویز شخصیت بھی مجاز ہی کی تھی۔ اس شخصیت میں انقلاب اور رومان کا ایک بہت حسین امتزاج تھا۔ اس کے نغموں میں بیسویں صدی کے نوجوانوں کا دل دھڑکتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ آج تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مجاز کے نام پر کوئی سمینار منعقد نہیں کیا گیا۔ اس کی یاد میں کوئی جلسہ نہیں ہوا۔ اور مجاز پر تحقیقی مقالہ بھی علی گڑھ سے دور الہ آباد میں لکھا گیا۔

ترانہ گایا جاتا ہے اور ہزاروں طالب علم اور اساتذہ اس مصرع کو لہک لہک کر دُہراتے ہیں: "یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں"۔ لیکن اس بلبل کی نغمہ سرائی کی طرف سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔

مگر یہ شکایت صرف علی گڑھ سے کیوں کی جائے۔ خود ترقی پسند تحریک نے جس کا سب سے زیادہ خوشنوا شاعر مجاز تھا، مجاز کو نظر انداز کیا ہے۔ اپنے بانی سجاد ظہیر کو اور سب سے بڑے اور مقبول ترین افسانہ نگار کرشن چندر کو نظر انداز کیا ہے۔ غیر ترقی پسند نقادوں نے مجاز کو نوجوانوں کا شاعر قرار دے دیا اور ترقی پسند نقادوں نے زیادہ تر

زورِ قلم اس کی شراب نوشی اور شخصیت کی شکست پر صرف کر دیا۔ یہی سلوک خدائے سخن میر تقی میر کے ساتھ کیا گیا ہے، جن کے کلیات کا کوئی صحیح اور مستند نسخہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ یہ کیفیت دراصل اردو زبان اور ادب کا مزاج بن چکی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ صرف حال کے لمحوں میں زندگی کرنے والا یہ مزاج کب بدلے گا اور کیسے بدلے گا۔

اس عالم میں مجاز کی شخصیت اور فن پر معیزہ عثمانی کا تحقیقی مقالہ جو کتاب کی شکل میں آپ کے سامنے آرہا ہے ایک مبارک اقدام ہے اور اس کی اشاعت مجاز کے ساتھ تھوڑا سا انصاف کر سکے گی۔

میں اس مقالے کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا کہ میں نے اب تک مجاز پر جتنی کتابیں پڑھی ہیں حالانکہ وہ بہت زیادہ نہیں ہیں ان میں پیش نظر مقالہ سب سے بہتر ہے۔ معیزہ عثمانی نے یہ مقالہ بڑی محنت اور محبت سے لکھا ہے اور مجاز کی شخصیت اور شاعری کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد انبساط کا ایک احساس ہوتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ مجاز کی شاعری تمام وقتی بے حسی کے باوجود موت کا شکار نہیں ہوگی۔ وہ "ابرِ بہار" جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اٹھا تھا بڑی شان کے ساتھ برسے گا۔

مجاز کی شاعرانہ بصیرت اپنے عہد سے بہت آگے دیکھنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اس وقت جب اقبال اور جوش جیسے انقلاب آفریں شعراء عورت کے متعلق محدود اور کسی حد تک فرسودہ خیالات کا شکار تھے۔ مجاز نے اس "جنسِ لطیف" کو کارزارِ حیات میں مرد کے رفیقِ کار کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ عورت کی ساری حسین تابناکیوں سے خیرہ ہو جانے والی آنکھیں اس کے ماتھے کے آنچل کو پرچم کی شکل میں لہراتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھیں۔ اُس وقت علی گڑھ میں جہاں سختی سے پردے پر اصرار کیا جاتا تھا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بہت جلد وہ زمانہ آئے گا جب اس یونیورسٹی میں خواتین لکچرر اور پروفیسر کی حیثیت سے تعلیم دیں گی اور شعر اور تنقید کی دنیا میں نام پیدا کریں گی۔ آج کے زمانے میں وہ قومیں ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتیں جن میں عورت اپنے وقار سے محروم ہوگی اور یہ بات مجاز پر واضح تھی، اس لئے اس نے کہا تھا کہ "ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارا ہے" ہم اس شاعری کو رومانی کہہ کر اس کی

اہمیت کم نہیں کر سکتے۔ یہ انقلابی مزاج کا رومان تھا۔

مجاز کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاعر کی ذاتی شکست کا شکار نہیں ہو سکی۔ اس میں امنگ اور حوصلہ باقی رہا اور آخر رومانیت دردمندی میں تبدیل ہوئی اور اس دردمندی نے نظامِ کہن کی تبدیلی کے احساس کو زندہ رکھا اور دل کو "آماجگہ یاس" نہیں بننے دیا۔ جس خوبصورت ہاتھ نے اپنے وینسانہ ڈرائنگ روم میں مجاز کو پہلا جام دیا تھا اور جن آنکھوں کے اشاروں نے اس کے دل میں نغموں کا طوفان برپا کر دیا تھا جب انھوں نے اپنا رخ بدل لیا تو مجاز نے یہ کہہ کر معاف کیا ہے

مجھے شکوہ نہیں دُنیا کے اُن زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے ذوقِ رسوا کی پذیرائی

اور یہ کہہ کر ان کا دل رکھ لیا کہ "قوانینِ کہن آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے۔" اس میں بھی ایک سماجی بصیرت ہے۔ مجاز کی شاعری پر صرف رومانی انداز سے جب جب نظر ڈالی جائے گی یہ یقینی بات ہے کہ نقاد کا قلم بھٹک جائے گا۔ اور وہ شاعر کے ضمیر کی روشنی نہیں دیکھ سکے گا۔

فیض نے اپنے ایک خط میں سعادت حسن منٹو کی موت پر ایک بہت بلیغ بات لکھی ہے :—

"ہمارے شعرا جنھیں دورِ حاضر کے فن کار کی شکستِ دل کا نہ احساس ہے نہ اس سے کوئی ہمدردی غالباً یہی کہیں گے کہ منٹو مر گیا تو اس کا اپنا قصور ہے۔ بہت پیتا تھا۔ بہت بے قاعدہ زندگی بسر کرتا تھا۔ صحت کا ستیاناس کر لیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ کوئی سوچے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ ایسے ہی کیٹس نے اپنے کو مار رکھا تھا۔ برنز نے بھی موزارٹ نے بھی۔ اور بھی کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب معاشرتی حالات کی وجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں تو دونوں میں سے ایک کی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ دوسری صورت سمجھوتے بازی کی ہے جس میں دونوں کا کچھ حصہ ایک دوسرے

ہے اور تیسری صورت ان دونوں کو یکجا کر کے جد و جہد کا مضمون پیدا کرنے کی ہے جو صرف عظیم فن کاروں کا حصہ ہے۔" لے

مجاز دونوں کو یکجا کر کے جد و جہد کا مضمون پیدا نہ کر سکا۔ اس کے اسباب تھے جن کے بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجاز کو ہوش و خرد کی دنیا سے ڈنڈے مار کے دیوانگی کے ریگستان میں ڈھکیل دیا اور وہ صرف یہ کہہ سکا۔ ع

"وہ ریگزارِ خیال میں ہے کبھی کبھی ہم خرام میری"

اور اس پر ماتم کرتا رہا! "کیا قیامت ہے کہ اک دوست رقیب آج بھی ہے" لیکن اس کے بعد بھی اس حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ "خونِ دل نذرِ چمن بندیٔ دوراں کر"

میں نے غالباً ۱۹۳۳ء میں ایک نظم کہی تھی جس کا عنوان تھا "ٹوٹا ہوا ستارہ" اور وہ ستارہ نہایت خوشی اور بیباکی کے ساتھ اپنے دل کی آگ کے ساتھ اپنے دل آگ میں جلتا ہوا خلا سے گزر رہا ہے۔ اس کا آخری شعر تھا ؎

لیکن ایسے انجمن روشن جبین و تابناک

جب مجاز نے یہ نظم سنی تو مجھے اپنے گلے سے لگایا اور کہا کہ "تم نے میرے دل کی بات کہہ دی"۔ برسوں بعد اس کی نظم "اعتراف" میں یہ مصرع آیا۔ ع

"میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار"

مجاز نے اپنی یہ نظم نہایت شکستہ آواز میں لیکن ترنم کے ساتھ مجھے سنائی اور نظم ختم کرنے کے بعد پوچھا۔ "اب تو کسی کو مجھ سے شکایت نہیں ہوگی میں نے اپنے قاتل کا پتہ بتا دیا ہے"۔

میں معیزہ عثمانی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میرے دوست کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس سے زیادہ اس عہد کے ایک خوبصورت نغمے کو پہچاننے کے لئے قلم اٹھایا ہے۔

سردار جعفری

بمبئی ۱۵ر نومبر ۱۹۸۲ء

۱۰۔ سیتا محل۔ پاسن جی پائل روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۳۶

پیش لفظ

کیا کیا ملائے خاک میں انسان چاند سے
سچ پوچھئے اگر تو زمیں آسماں ہے اب (داغ)

وقت کے محیط و بیکراں سمندر میں انسانی زندگی اپنی بے ثباتی کے باوجود
تحریک و عمل کی مظہر ہے اور وقت کی رد و کد بعض انسانی کارناموں کو مٹا نہیں سکتی۔
شخصیتیں خاک میں مل جاتی ہیں لیکن ان کے کارنامے رہتی دنیا تک قائم رہتے ہیں۔
ایک سے ایک عظیم انسان دنیا میں پیدا ہوئے ہیں لیکن کوئی بھی کسی کی خالی جگہ کو
بہ جنسہ پُر نہیں کر سکتا اور خود فطرت بھی کسی چیز کو دُہراتی نہیں۔ مجاز کی بھی ایسی ہی
بے بدل شخصیت ہے جس نے اپنے دور و نسل کے تقاضوں کی پوری پوری ترجمانی کی ہے؛
لیکن وہ غیر یقینی اور ناساز گار حالات سے مطابقت پیدا نہ کر سکے اور وقت سے پہلے ان کے
طوفانی تھپیڑوں کی زد میں آکر ان کی شمعِ حیات بجھ کر رہ گئی۔ ان کے نجی حالات اور
شاعرانہ سرکشی و بانکپن میں جو تضاد ملتا ہے اُس میں ایک ایسی کشش ہے جس کے لئے
سیر حاصل مطالعہ اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ۱۹۷۵ میں ایم۔ اے کرنے کے بعد
مجھے ریسرچ کے لئے اس موضوع کی پیش کش ہمارے استاد محترم جناب (ڈاکٹر)
ظلِ حسنین صاحب نے کی اور محترمہ فردوس فاطمہ (مرحومہ) نے میری ہمت افزائی کی
اور اپنی نگرانی میں رجسٹریشن کرادیا، لیکن مجھے سخت افسوس ہے کہ ان کا وقت سے پہلے
انتقال ہو گیا اور یہ کام ان کی نگرانی میں مکمل نہ ہو سکا جس کی وجہ سے مجھے کافی
دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ریسرچ کے سلسلہ میں مواد کی فراہمی ایک مسئلہ ہے۔ جرائد و رسائل کی
نشان دہی اور پھر ان کا کسی ایک لائبریری میں یکجا مل جانا ایک ناممکن امر ہے۔
اس پر دور دراز شہروں کا سفر، قیام اور دوسری سہولتوں کی عدم موجودگی بذاتِ خود

ایک پرابلم ہے۔ پھر ہمارے سماج میں خواتین کے لئے اور بھی مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ خصوصاً جن کو ازدواجی زندگی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لائق تحسین ہیں وہ لوگ جنھوں نے میری اِن تمام دشواریوں کو سمجھا اور مجھے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کیں۔ مواد کے سلسلہ میں میں نے دلی۔ علی گڑھ۔ لکھنؤ اور الہ آباد کی لائبریریوں سے استفادہ کیا۔

میری تگ و دو اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے ابتدائی مراحل میں مواد کی فراہمی میں محترم فرید الحق صاحب، انصار ہرداتی صاحب، رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ (مرحومہ) پروفیسر محمد حسن صاحب، شارب ردولوی صاحب، معین احسن جذبی صاحب، علی جواد زیدی صاحب، مسعود اختر جمال صاحب، رفعت سروش صاحب اور اجمل اجملی صاحب نے اپنے قیمتی وقت دے کر ذاتی و معلومات کے ذریعہ میری رہنمائی کی۔ ان حضرات کی معاونت کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں ان کا شکریہ ادا کر سکوں۔

اس مقالہ کی تکمیل کے سلسلہ میں سب سے پہلے میں اپنے نگراں واستاد محترم جناب (ڈاکٹر) ظل حسنین صاحب کا شکریہ ادا کر دینا چاہتی ہوں جن کے بصیرت افروز مشوروں نے مجھے قدم قدم پر نوازا ہے اور استاد محترم جناب سید محمد عقیل رضوی صاحب صدر شعبۂ اردو کی بھی تہ دل سے ممنون ہوں۔ جنھوں نے اس مقالہ کی تکمیل میں مختلف مراحل پر میری مدد کی ہے۔ اور استاد محترم جناب ڈاکٹر احمد حسن صاحب کے پُرخلوص تعاون کی بے حد شکر گذار ہوں۔

استاد محترم پروفیسر گیان چند جین صاحب نے جس طرح اس کام کے سلسلہ میں تکنیکی مراحل پر میری مدد کی ہے اس کے لئے میں احسان مند ہوں۔

اب اگر میں حسین فاروقی، لطیفہ حسین اور مظہر الحق صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں تو بڑی بے انصافی ہو گی بلکہ یہ کہہ دینا بیجا نہ ہو گا کہ اگر قدم قدم پر ان حضرات کا پرخلوص تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا تو یہ مقالہ کسی بھی حالت میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا۔

ایک بزرگ شخصیت جناب عبدالحق صاحب نے مقالہ کی چار کاپیاں اپنے قلم سے لکھ کر میرے اوپر احسان کیا ہے۔

یہ حقیر سی کاوش پیش خدمت ہے۔

معیزہ عثمانی

شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

۲۰۳ دائرہ شاہ اجمل، الہ آباد

تاریخی پس منظر

شعر و ادب ہمیشہ خارجی ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر داخلی جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس لئے شعر، شاعر اور ماحول یہ تینوں ہی وہ بنیادی کڑیاں ہیں جنھیں شعر و ادب کے کسی بھی مطالعے میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ شعر شاعر کے ذاتی مطالعے، زندگی کے تجربے اور دلی جذبات و کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور جب یہ تینوں باتیں بہ یک وقت جمع ہو کر الفاظ کے پیکر میں سامنے آتی ہیں تو دل سے نکل کر دل پر اثرانداز ہوتی ہیں خواہ وہ نظم کی شکل میں ہوں یا نثر کی صورت میں۔ یہ ادبی تخلیقات بنیادی طور پر شاعر کے جذبات، خیالات، احساسات، تجربات اور فکر کی پیداوار ہوتی ہیں۔ جسے وہی خالق یا شاعر اپنے جمالیاتی نگارخانے میں سنوار کر ایک فنی روپ دے کر ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

ہر فرد اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اس لئے شعری یا نثری تخلیق کا خالق بھی اپنے ماحول کا پروردہ ہے اور اس کی شخصیت، اس کے خیالات، اس کے جذبات اور احساسات کی نشوونما میں اس زمانہ کے حالات اثرانداز ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہے کہ ایک عام فنکار اور ایک عہد آفریں اور عہد ساز فن کار میں فرق ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ایک بڑا فن کار اپنے گرد و پیش، ماحول اور زمانے کی مخلوق ہوتے ہوئے بھی ایک نئے دَور کی داغ بیل ڈالنے والا اور اس کا خالق بھی ہوتا ہے۔ اس طرح شعر کو سمجھنے کے لئے شاعر کو سمجھنا اور شاعر کو سمجھنے کے لئے اُس ماحول کو سمجھنا نہایت ضروری ہو جاتا ہے جس میں فن کار نے آنکھیں کھولیں، شخصیت اور فن کی ارتقائی منزلیں طے کیں اور پھر زمانے نے جو کچھ دیا اسے شعر کی صورت میں پیش کر دیا۔ مثال کے طور پر اگر ہم قدیم شعرائے اردو کو لیں جن کی شاعری میں عام طور سے گل و بلبل کی داستانوں کا ذکر تھا، وہ بھی اپنے زمانے کے حالات کی شدت کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے اور گرد و پیش کے حالات اور اُن سے

تاثرات اشاروں میں ہی سہی اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کیے ہیں۔ اسی سبب سے اس دور کی اقتصادی بے چینی، سیاسی انتشار اور معاشی بدحالی کی جھلکیاں شہر آشوبوں اور غزل کے منفرد اشعار میں جابجا نظر آتی ہیں۔ مثلاً

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے (ولی)

اب زمانہ ہے بے طرح بگڑا
کیا بنے روزگار کی صورت (آبرو)

تو ہے بیچارہ گدا میر ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا (میر)

ان اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر کے دماغ کو حالات نے کتنا متاثر کیا تھا۔ مصحفی نے شاہانِ اودھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازباز کو غلامی کا پیش خیمہ سمجھا ہے

ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

ماحول کوئی بندھی ٹکی اور جامد چیز نہیں۔ اس کے بہت سارے گوشے اور پہلو ہوتے ہوتے ہیں۔ ماحول کو سمجھنا ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اس کی کھوج و تلاش ایک مشکل کام ہے اس لئے کہ اس کی بہت سی تہیں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے انسان کی زندگی اپنے گھر کی چاردیواری میں شروع ہوتی ہے۔ پاس پڑوس۔ محلہ اور شہر کے گرد و پیش سے روشناس ہوتی ہے جہاں وہ اُٹھتا بیٹھتا اور لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔ پھر اس کی زندگی میں ایک اور عنصر آتا ہے جو درسگاہ سے شروع ہوتا ہے جہاں وہ تعلیم حاصل کرتا ہے لیکن ان محدود حلقوں کے علاوہ کسی فن کار کو شدّت سے متاثر کرنے والے اس کے اپنے ملک کے وہ حالات ہوتے ہیں جن میں وہ جنم لیتا ہے اور زندگی کی ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا بچہ جو آگے چل کر ادیب یا فن کار بننے والا ہے ان اثرات کو قبول کرتا ہے اور یہ سارے عوامل اس کی ذہنی تربیت میں حصہ لیتے ہیں اس لئے اس کے ذہن اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے ماحول کے

سبھی عناصر کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

یہ ماحول ایک دو دن کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ ارتقا کی منزلوں سے گذرتا ہر دور کی کامیابیاں اور کارنامے سمیٹتا مسلسل تغیر پذیر اور متحرک حقیقت ہوتا ہے۔ ہم جب اس کی کسی مخصوص منزل میں پہنچتے ہیں تو ہمیں یہ زمانہ پچھلی تمام منزلوں کے نقوش اپنے کاندھے پر لادے، حال کے نقوش سمیٹتا لمحہ بہ لمحہ مستقبل کی طرف بڑھتا محسوس ہوتا ہے۔ اپنے گرد و پیش کے حالات، ملک میں رونما ہوتی ہوئی سماجی، سیاسی تبدیلیوں سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ مجاز بھی اس سے مختلف نہ تھے، انھوں نے اپنے ملک کے تاریخی تغیرات و عوامل کا مطالعہ کیا۔ اپنے ماضی کی روایات اور پرانی تہذیب جو اس وقت کے متوسط طبقے کی اساس تھی، اس کی چھاؤں میں پروان چڑھے اور اس زمانے کے حالات نے ان کی شخصیت کے ارتقا میں ایک اہم رول ادا کیا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں لوگ ہندوستان کے اس زوال کو ابھی نہ بھلا سکے تھے جس نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں ان کی تہذیب، تمدن، معاشرت، عزت و ناموس سب کو ایک کس مپرسی اور انحطاط کے دور میں داخل کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی سماج میں تیزی کے ساتھ جو تبدیلیاں آنے لگی تھیں، ان میں ایک طرح کا ٹھہراؤ اور جمود پیدا ہو چلا تھا۔ سیاسی اور قومی بیداری کے نتیجے میں مختلف تحریکیں جنم لے رہی تھیں جن میں سر سید کی علی گڑھ تحریک۔ راجہ رام موہن رائے اور کشیپ چند سین وغیرہ کی تحریکیں اور بعض دوسری اصلاحی تحریکیں تھیں۔ نئی چیزوں کی مخالفت اور پرانی قدروں سے وابستگی کا دور ابھی باقی تھا جس نے تقریباً ہر گھر میں ایک سماجی کشمکش کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ اس طرح اسے ہندوستان کے ریناساں (نشاۃ الثانیہ) کا دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف شکست خوردگی، مجبوری، مایوسی کا وہ احساس دھیرے دھیرے کم ہوتا جا رہا تھا جس نے پوری قوم کو انگریزوں کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔ حب الوطنی کا جذبہ اور آزادی کی لگن کا برملا اظہار تحریر و تقریر کی صورت میں کیا جانے لگا تھا۔ انگریزی تعلیم نے نت نئے علوم کے دروازے کھول دئے تھے اور صنعتی ترقی کا وہ دور شروع ہو چکا تھا جس نے آگے چل کر تہذیب کی صورت بدلنے اور پرانے نظام کی جگہ نئے سرمایہ دارانہ نظام کو مضبوط تر بنانے میں زبردست رول ادا کیا ہے۔ حالانکہ برطانوی

سامراج نے نئے نظامِ تعلیم کو اِس نیت سے رائج کیا تھا تاکہ انگریزی نظامِ حکومت کو پائیدار اور مستحکم بنایا جا سکے، لیکن اس نے متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن کے دریچے کھول دے اور انھیں یہاں کی زندگی میں گھٹن کا احساس ہونے لگا اور دل میں بغاوت کا جذبہ سر ابھارنے لگا۔" [۱]

اس حقیقت کا اظہار کارل مارکس نے بھی اس دور کے ہندوستان کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے :۔

" اگرچہ برطانیہ کا مقصد انتہائی بدنیتی پر مبنی تھا لیکن اس نے تاریخ کے غیر محسوس ہتھیار کے طور پر ہندوستان کی ترقی میں مدد دی۔" [۲]

میکالے ایسے انگریز دانشور ہندوستان میں مغربی تعلیم کے عروج کے خواہش مند نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان کے بالکل برعکس لارڈ لٹن اور کرزن وغیرہ اس کے سخت مخالف تھے کہ "اہلِ ہند تعلیم یافتہ ہو کر اپنے حقوق سے آگاہ نہ ہوں اور آزادی کا مطالبہ نہ کریں۔" [۳] اس کشمکش میں ایک کمیشن برائے اصلاحِ تعلیم مقرر کیا گیا۔ جس میں وہی لوگ شامل تھے جو بقول حسرت موہانی "اصلاح کے بجائے تخریب کے درپے تھے۔" [۳] جس کا شدید احساس سر سید کو بھی تھا کہ حکومت کو نظامِ ملک انتظام دفتر کے لئے چند ایسی پتلیاں درکار تھیں جو انگریزی لکھ سکتی ہوں۔" [۴]

اردو زبان اور شاعری نے بھی نئے خیالات اور اپنے زمانے کے سیاسی و اقتصادی حالات کا اثر قبول کیا۔ محمد حسین آزاد اور حالی اُن اوّلین شاعروں میں ہیں جن کا دل ہندوستان کی غلامی پر رو دیا اور آزاد نے حُبُ الوطنی کی اہمیت اور اُس کی تعریف و توصیف اپنی نظم حبِ وطن میں بیان کی ہے۔ حالی کا دل بھی حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبے سے سرشار تھا اور شبلی کے اس بیان سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ :۔

" حُریت و آزادی کا لفظ آج بچے بچے کی زبان پر ہے لیکن اُس زمانے میں یہ لفظ

---

[۱] نیشنل موومنٹ اینڈ کانسٹی ٹیوشنل ڈیولپمنٹ آف انڈیا، از آر۔ این۔ اگروال، سکنڈ ایڈیشن صفحہ ۲۵

[۲] مارکس اور ہندوستان صفحہ ۱۰۴

[۳] مسٹر مارلے کی مجوزہ اصلاحوں کی حقیقت، حسرت موہانی۔ نوائے آزادی صفحہ ۹۲۔

[۴] نوائے آزادی صفحہ ۱۰۹۔

جُرم قرار دیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے حالی نے ہندوستان کی غلامی کا ماتم کیا۔"

دلّی جو ہندوستان کا دل سمجھی جاتی تھی جس کے کوچے اوراقِ مصوّر تھے۔ جب تباہی و بربادی کی آماجگاہ بن گئی تو حالی اس کی زبوں حالی کو برداشت نہ کر سکے اور وہ اس کا ذکر بڑے پُردرد انداز میں کرتے ہیں:

بیسویں صدی کی ابتدا سے افلاس، قحط اور غربت کے مارے ہندوستانی عوام میں قومی جد و جہد کا ایک نیا موڑ شروع ہو گیا۔ یوں تو بیسویں صدی کا آغاز گویا سارے ایشیا کے لئے ایک نیا پیغام تھا، چین میں بغاوت ہوئی۔ ترکی میں انقلاب آیا۔ ایران نے بیداری کی کروٹ لی۔ جاپان نے روس کو شکست دے کر یورپ کی برتری کو ختم کر دیا۔ ان حالات سے ہندوستان کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔

شاعروں اور ادیبوں نے اپنے مضامین نظموں اور دوسرے فن پاروں کے ذریعہ ہندوستان کے عوام میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں کچھ ادیب اور شاعروں نے بہت اہم رول ادا کیا جن میں آزاد، حالی، شبلی، عزیز لکھنوی، اکبر الہ آبادی، اقبال، چکبست، حسرت، جوش، پریم چند، اسمٰعیل میرٹھی اور صفی لکھنوی وغیرہ کے نام نمایاں طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ یہی زمانہ تھا کہ سودیشی تحریک کا بھی آغاز ہوا اور عوام سے زیادہ ہمارے شاعر و ادیب اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ حالی نے اسے اس سُرنگ کے راستہ کو بند کرنے کا ایک طریقہ تصور کیا جس کے راستہ سے ملک کی دولت غیر ملکوں میں کھنچی چلی جا رہی تھی اور اکبر نے بھی اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔

اکبر

تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دُھن میں

تحریک سودیشی کے علاوہ بھی عام سیاسی دھارے سے اکبر نے اپنے کو کبھی بھی الگ نہ ہونے دیا۔ علی گڑھ تحریک سے اور سر سید سے متاثر ہوئے بغیر بھی وہ نہ رہے، جب تک وہ علی گڑھ نہ گئے تھے۔ سر سید پر اعتراضات کرتے رہتے تھے لیکن وہاں پہنچنے پر سر سید کے اوصاف حمیدہ نے ان پر وہ اثر کیا کہ کہہ اُٹھے

سید کے دل میں نقش ہوا اس خیال کا
ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام

صدمے اٹھائے، رنج سہے، گالیاں سُنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام

شبلی کا سیاسی شعور بہت بلند تھا، اُن میں قومیت کا احساس تھا۔ وہ کانگریس کے ہمنوا تھے اور انگریزوں کے دشمن۔ اُن کی تحریروں سے متاثر ہو کر نوجوان طبقہ باقاعدہ سیاست سے دل چسپی لینے لگا تھا۔ شبلی کی عظمت کا اعتراف علی سردار جعفری نے بھی کیا ہے:

"اگر شبلی نے آزادی کے جذبے سے سرشار ہو کر اور مادّی بنیادوں پر ادب کا جائزہ نہ لیا ہوتا تو فردوسی کی ایک ایسی شاندار تصویر ہرگز پیش نہیں کی جا سکتی تھی۔ چونکہ شبلی عملی طور سے قومی تحریکِ آزادی میں شامل تھے اور سیاسی شاعری بھی کر رہے تھے، اس لئے انھوں نے ماضی کے اسلحہ خانہ سے اپنے لئے اور آنے والی نسلوں کے لئے صحیح ہتھیار کے انتخاب میں غلطی نہیں کی اور ایران کی ایک ہزار برس کی ادبی تاریخ سے فردوسی کو چُن لیا، شبلی کی ناقدانہ عظمت کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔"[1]

اقبال جیسے عظیم شاعر نے بھی مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کو دیکھ لیا تھا اس لئے اُن کی شاعری کی ابتدا حُبُّ الوطنی کے جذبہ سے ہوتی ہے ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

"برطانوی سامراج اور انگریزی سرمایہ داری کا بھیانک پن سر سید اور حالی کی نگاہوں سے اوجھل رہا، لیکن اقبال کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا اور انھوں نے اس پر بھرپور حملہ کیا۔ سامراج کے دشمن سرمایہ داری کے نقاد کی حیثیت سے اقبال کی شاعری کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ حقیقت کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ ۱۹۰۵ء ہی میں اقبال نے اس نظام کی آنے والی موت کا اعلان کر دیا تھا:" ؎

---

[1] ترقی پسند تحریک۔ سردار جعفری ص ۱۰۱

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دُکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اک زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا[۱]

اقبال کی شاعری میں حُبّ الوطنی کا جذبہ ہے۔ وہ تغیّر کو عینِ حیات سمجھتے ہیں اور اس کا خیرمقدم بھی کرتے ہیں۔ پہلی بار انھوں نے اپنی شاعری میں انقلاب کا لفظ سیاسی اور سماجی تبدیلی کے معنی میں استعمال کیا۔

مزدوروں اور کسانوں کے آنے والے دور کو اردو ادب میں جس شاعر نے سب سے پہلے محسوس کیا۔ ان کی بے بسی پہ بے چین ہوا۔ انھیں ان کی اہمیت کا احساس دلایا وہ اقبال تھے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو۔ کھیتی بھی تو۔ باراں بھی تو۔ حاصل بھی تو

اقبال نے سب بندۂ مزدور کو یہ پیغام دیا ؎

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس انتشار اور بدحالی کے دور میں اقبال کی شاعری کے اس تصور نے عوام میں فکری اور عملی بیداری کا جذبہ پیدا کیا۔ انھیں اپنی غلامی کھلنے لگی اور وہ برطانوی تسلط سے جلد از جلد آزادی حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرنے لگے۔ اقبال کی نظموں کے علاوہ بھی اس دور میں اور بھی بہت سی نظمیں کہی گئیں جس کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی۔ بقول سردار جعفری:

" اردو والوں نے آزادی کی جد و جہد کو قومی دائرہ تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے دائرے بین قومیت سے ملانے اور اس طرح ایک زیادہ جاندار اور ہمہ گیر شعور کو عام کیا۔"[۲]

انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان کی سیاست میں ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ نئی تعلیم نے قومیت کا احساس جگا دیا تھا۔ کھلے طور پر اخبارات حکومت پر اعتراض کرتے اور ان کے ذریعے حکومت سے مطالبات بھی ہونے لگے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں آنند موہن بوس کی صدارت

۱ے ترقی پسند ادب۔ سردار جعفری ص ۱۱۱ ۲ے صبا۔ حیدرآباد کانفرنس نمبر۔ سردار جعفری ص ۸۹

میں کلکتہ میں انڈین ایسوسی ایشن نے اس سلسلہ میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ عام حالات اور بیداری کی تیز روی کو دیکھ کر انگریزوں نے مصلحتاً اس دھارے کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے ایک انگریز افسر ہیوم کے ذریعہ انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈلوائی کیونکہ اس وقت کے حالات نہایت تشویشناک تھے اور برطانوی دانشوروں کو ہیوم کی ڈائری کے اقتباسات کے مطالعہ سے اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ یہ صورت حال انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے[1]۔

ہندوستانی عوام کے افلاس اور عام تباہی کی خبریں بیرون ملک تک پہونچنے لگی تھیں۔ دوسری طرف ہمارے اپنے ملک کے دانشوروں میں بھی اس پستی اور افلاس سے چھٹکارا پانے کا جذبہ ابھرنے لگا تھا۔ ان میں دو بنیادی نظریوں کے لوگ پائے جاتے تھے۔ ایک مذہبی اور پرانی تہذیب کے احیاء کا پرستار تھا اور دوسرا مغربی اور خاص طور پر انگریزی سرمایہ دارانہ جمہوریت کا حامی۔ پہلے نقطۂ نظر کے لوگوں کا خیال تھا کہ اگر ہم اپنی پوری قوم کے ماضی کے سرمایہ پر نظر ڈالیں تو ان میں ہم کو ایسی اقدار ملیں گی جن پر صحیح طور پر عمل کرکے پوری قوم کو قومی سماجی اور انفرادی اعتبار سے مغرب کی کسی بھی قوم کے ہم پلہ لایا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود اس طبقے میں کچھ لوگ جدید انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ جس میں سرسید کی تحریک بھی کچھ اسی طرح کی تحریک تھی اور پورے ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں میں اسی قسم کی اصلاحی، احیائی اور تعلیمی تحریکوں کا دور دورہ تھا۔ جیسے شمالی ہند میں آریہ سماج، برہمو سماج کی تحریکیں۔ مسلمانوں میں علی گڑھ تحریک، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن حمایت اسلام (پنجاب) اور ان سے منسلک لسانی تحریکیں جیسے انجمن ترقی اردو، ناگری پرچارنی سبھا وغیرہ سبھی انھیں رجحانات کی ترجمان تھیں۔

دوسری طرف انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ملک میں سماجی، اصلاحی تحریکوں کے ساتھ ساتھ سیاسی اصلاح کی تحریکیں بھی آگے بڑھیں۔ بنگال اور مہاراشٹر میں نوجوانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ بن گئے، جو بیرونی تسلط کے خلاف دہشت انگیزی اور تشدد کے حربے استعمال کرنے لگے جس سے پوری قوم میں دو متضاد سیاسی نظریے عود کر آئے۔ ایک اعتدال پسند، دوسرا انتہا پسند کہلانے لگا۔ ان دونوں نظریوں میں بھی وہی پرانے خیالات کا میل تھا یعنی ایک طرف احیاء پرستی، دوسری طرف مغربی جمہوریت کا تصور۔ ان نئے گروہوں

---

[1] ہیوم کی سوانح عمری صفحہ ۲۱۰۰۸ = انڈیا ٹوڈے۔ از رجنی پام دت۔ صفحہ ۴

کے ذہنی و عملی رہنما آربندو گھوش، بال گنگادھر تلک، لالہ لاجپت رائے اور حسرت موہانی وغیرہ تھے جو اعتدال پسندوں کی بہ نسبت انتہا پسند تھے۔ دوسری طرف شبلیؔ، مولانا ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں وغیرہ تھے جو قوم کو محض تعلیمی اور سماجی اصلاح تک محدود نہ رکھ کر وطن دوستی آزادئ وطن اور سامراج دشمن جذبے سے سرشار کر کے قومیت کے دھارے پر ڈال دینا چاہتے تھے۔ یہ انتہا پسند گروہ جان و مال کی پرواہ کئے بغیر جلد از جلد بیرونی تسلّط سے پیچھا چھڑا لینا چاہتا تھا اور جنگ آزادی کو فیصلہ کن انداز میں لڑنا چاہتا تھا۔ نتیجہ میں تلک کو ۱۹۰۸ء میں ایک انقلابی مضمون شائع کرنے کے جرم میں چھ سال کی سزا ہو گئی جس سے مہاراشٹر میں اور خاص طور پر بمبئی میں کافی ہل چل مچ گئی۔ سوتی کارخانوں اور ملوں میں مزدوروں نے ان کی حمایت میں ہڑتالیں کیں جس کو روسی رہنما لینن نے بھی سراہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال میں بھی سکون مٹ گیا اور حکومت نے سیاسی مقدمے چلائے لیکن یہیں سے ہندوستان کی مکمل آزادی کی بنیاد پڑ گئی۔

ادھر ایشیائی اقوام میں بھی سامراج دشمنی کی لہر اور جمہوری تحریکوں کا تصور جاگ اٹھا تھا۔ روسی سامراجیوں کی جاپان کے ہاتھوں شکست، پہلا انقلاب روس ۱۹۰۵ء۔ ایران میں سامراجیوں اور مطلق العنان بادشاہت کی مخالفت اور جمہوریت کی مانگ۔ مصر اور سوڈان میں انگریزوں کے خلاف بغاوتیں۔ ترکی کے حصے بخرے کرنے کی انگریز فرانسیسی و روسی سامراجیوں کی مشترکہ سازش اور اس کے لئے جنگیں۔ ان سامراجی عوامل کی بنا پر ایشیائی عوام کے دلوں میں ایک زبردست سامراج دشمن ہیجان سا پیدا ہو چلا تھا اور ہندوستان میں بھی قومی تحریک آزادی اعتدال پسندوں کے دائرۂ عمل سے نکل کر انتہا پسندوں کے ساتھ چل پڑی تھی۔ انھیں حالات میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور کانگریس کے اعتدال پسندوں نے حکومت برطانیہ سے تعاون و وفاداری کا پیمان اس امید پر باندھا کہ حکومت برطانیہ جنگ کے بعد قومی آزادی کے لئے اپنا رویہ تبدیل کرے گی لیکن اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا اور گاندھی جی ایسے اہنسا اور عدم تشدد کے پجاری نے بھی مجبوراً ۲۸ جولائی ۱۹۲۰ء کو عدم تعاون کا اعلان کر دیا کیونکہ بقول روماں رولاں گاندھی جی کو حکومت کی غضبناکی کا خوف نہ تھا لیکن عوام الناس کی خفگی کا ڈر ضرور تھا۔"[1]

---

[1] مہاتما گاندھی از روماں رولاں صفحہ ۶۰

جنگ کے بعد کے حالات دگرگوں تھے۔ افراطِ زر اور بے روزگاری سے پورا ملک ایک بحرانی کیفیت سے دوچار تھا۔ ملوں، کارخانوں میں ہڑتالیں شروع ہو گئیں اور دسمبر ۱۹۱۸ء سے جنوری ۱۹۱۹ء تک سوا لاکھ مزدوران ہڑتالوں میں شریک تھے اور ۱۹۲۰ء کے پہلے چھ مہینوں میں تقریباً دو سو ہڑتالیں ہوئیں جن میں ۱۵ لاکھ مزدور شامل تھے۔[1]

دوسری طرف ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس نے سارے ایشیا کی محکوم قوموں میں ایک بیداری کی لہر دوڑا دی۔ وسطی ایشیا کی قوموں نے روسی سامراجیوں کا جوا اُتار پھینکا اور پورا ایشیا برطانوی سامراج کے جوے کو اتار پھینکنے کو مضطرب تھا۔ ایران اور ترکی کو روس کی مزدور کسان نواز حکومت کی مدد و حمایت برطانوی سامراجیوں سے چھٹکارا پانے کے لئے حاصل تھی۔ چین میں سامراجیوں کے خلاف مسلح جدوجہد جاری تھی اور ہمارے ملک میں بھی قومی آزادی کی تحریک زوروں پر تھی جن میں ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکیں تھیں۔ قومی آزادی کے حصول کے لئے ہندو مسلم اور سکھ عوام متحد تھے اور ان کا خون مل کر بنگال، یو۔پی، مالابار، بمبئی اور امرتسر میں سرزمینِ ہند کو لالہ گوں کر رہا تھا اور ملک میں انقلاب یقینی نظر آ رہا تھا۔ بقول لالہ لاجپت رائے "دنیا کی کوئی زندہ شے اپنی حیات میں انقلاب سے بچ کر نہیں بھاگ سکتی"۔[2]

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد برطانوی حکمرانوں کا رویہ کچھ سخت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ رولٹ بل باوجود ہندوستانی لیڈروں کی مخالفت کے کالے قانون کی شکل میں پاس کرنے پر بضد تھے۔ جس کے خلاف ۳۰ مارچ اور ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو زبردست ہڑتالیں ہوئیں اور ۱۳ اپریل کو وہ تاریخی دن آگیا جس نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے موڑ کو جنم دیا۔ لیڈروں کے بیانات نے مقرروں کی شعلہ بیانیوں اور شعراء کی آتش نوائیوں نے جو کام نہیں کیا تھا اس روز کے حادثہ نے کر دیا۔ یہ جلیان والا باغ کا حادثہ تھا کیونکہ بقول رومان رولاں "انگریز حکمراں گویا پاگل پن کی آندھی میں بہہ رہے تھے"۔[3]

ایک طرف عدم تعاون کی تحریک جاری تھی اور ساتھ ہی حکومت سے اپیلیں بھی کی جا رہی تھیں لیکن اعتدال پسندوں کی اپیل کی طرف حکومت کا خاموش و سرد رویہ دوسری طرف جگہ بہ جگہ سیوا دل کا قیام، ہڑتالیں، پکٹنگ اور ولایتی مالوں کا بائیکاٹ۔ حکومت نے سیوا دل کو غیر قانونی

---

[1] انڈیا ٹوڈے۔ رجنی پام دت صفحہ ۔ [2] تاریخ کانگریس از پٹا بھائی سیتا رمیا صفحہ ۱۷۔

[3] مہاتما گاندھی از رومان رولاں صفحہ ۲۵

قرار دیا اور ہزاروں مزدوروں و طالب علموں کو جیلوں میں ٹھونس دیا۔ ۱۹۲۱ء کے شروع ہوتے ہوتے تیس ہزار سیاسی قیدی جیلوں میں پہنچ چکے تھے۔[۱]

۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد اشتراکی نظریات بھی ہندوستان تک پہونچے اور یہاں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ لوگ عوامی حکومت اور مساواتی نظام کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ اشتراکیت میں انھیں اپنے خواب کی تعبیر نظر آنے لگی۔ جلد ہی کمیونسٹ پارٹی بھی قائم ہو گئی اور اب جنگ آزادی کے لئے تنزاقاد جنگ کے حربہ کا استعمال بھی روا سمجھا گیا اور حسرت موہانی نے اپنی ایک تقریر میں اس کا کھلم کھلا اظہار بھی کیا۔[۲] حالانکہ گاندھی جی کسی بھی قسم کے تشدد کے مخالف تھے اور وہ برطانیہ سے سارے تعلقات یک لخت منقطع نہیں کر دینا چاہتے تھے۔ بقول جواہرلال کہ اکثر لیڈروں کے ذہن میں سوراج کے جو معنی تھے وہ آزادی سے بہت کم کوئی چیز تھی۔ گاندھی جی بھی اس کے متعلق بہت مبہم تھے۔[۳] نتیجہ میں کانگریس پر ایک تعطل طاری رہا۔ مزدور اور کسان بھاؤں نے اپنے طور پر سیاسی مطالبات کے لئے جد و جہد شروع کر دی۔ ان کے اپنے لیڈر وجود میں آنے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس کانپور میں ہوئی جس میں حسرت موہانی نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا اور تفصیلی لائحہ عمل کی وضاحت کی۔ ۱۹۲۷ء تک ملک میں جگہ جگہ ٹریڈ یونینیں قائم ہو رہی تھیں۔ سائمن کمیشن کے خلاف مظاہروں میں عورتیں بھی حصہ لے رہی تھیں۔ ہڑتالوں میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ان حالات نے کانگریس کے جمود کو بھی توڑا اور انتہا پسند جنھیں بایاں بازو کہا جاتا تھا کو کانگریس میں تقویت پہونچی اور وہ پیش پیش آ گئے اور کانگریس نے اپنا نصب العین اور منزل مقصود صرف مکمل آزادی کو قرار دے لیا اور اس کا اعلان بھی کر دیا۔

۱۵ فروری ۱۹۳۰ء کو احمد آباد کے اجلاس میں سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے کا اعلان کیا گیا اور ہزاروں مردوں اور عورتوں کو جیل کا منہ دیکھنا پڑا کیونکہ وائسرائے نے اسے قانون کی خلاف ورزی اور امن عامہ کے لئے 'خطرہ' قرار دے دیا۔[۴] نتیجہ میں یکے بعد دیگرے کانگرس کے تمام بڑے بڑے لیڈر جیل بھیجے جانے لگے۔ بیرونی حکمرانوں پر ایک پاگل پن سا سوار ہو گیا۔ اس دوران کم از کم ایک درجن مختلف آرڈی ننس نافذ کئے گئے۔ درمیان میں حکومت سے مصالحتی

---

[۱] انڈیا ٹوڈے۔ رجنی پام دت صفحہ ۵۱۷

[۲] علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر صفحہ ۹۶۔ [۳] انڈیا ٹوڈے از رجنی پام دت صفحہ ۵۱۴۔

[۴] ہندوستانی سوراج کے لئے جد و جہد از سبھاش چندر بوس۔ صفحہ ۲۴۰

مذاکرات بھی ہوئے لیکن حکومت نے اپنے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ چنانچہ سول نافرمانی کی جدوجہد زور پکڑ گئی۔ پورے ہندوستان میں بیداری کی ایک لہر موج زن تھی۔ سوشلزم کا نظریہ درمیانی طبقے کے دانشوروں میں عام ہو گیا تھا اور کانگرس کا بھی ایک حصہ اس سے متاثر ہو چکا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی بھی وجود میں آ چکی تھی۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی بھی قائم ہو گئی۔ اس کے علاوہ دوسری پارٹیوں اور تنظیموں نے بھی اپنے منشور کی بنیاد سوشلزم پر رکھی اور ایک نیا ہندوستان وجود میں آنے لگا۔

اس پُر آشوب زمانے میں جب پورا ہندوستان ایک زبردست سیاسی و سماجی انتشار میں مبتلا تھا۔ عوام کا دل وطن دوستی اور سامراج دشمنی کے جذبے سے پُر تھا۔ وہ کسی صورت غلامی کی اس بیڑی کو کاٹ پھینکنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھے۔ تمام دُنیا میں انقلابات رونما ہو رہے تھے۔ تمام حساس طبقے خاص طور پر شاعر اور ادیب اپنی اپنی تخلیقات کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں جذبۂ آزادی پیدا کر رہے تھے۔ اخبارات جن میں ابوالکلام آزاد کا 'الہلال' ظفر علی خاں کا 'زمیندار' اور مولانا محمد علی کا 'ہمدرد' نوجوانوں کے خون کو گرما رہے تھے۔ جگہ جگہ تقریریں ہو رہی تھیں۔ ستیہ گرہ اور مرن برت کا سلسلہ جاری تھا۔ ساری دُنیا عظیم ہندوستان کے عظیم عوام کی آزادی سے دلچسپی اور حمایت کا اظہار کر رہی تھی۔ اب ہندوستان کی آزادی آفاقی دلچسپی کا باعث بن گئی تھی۔

ان سماجی، سیاسی اور اقتصادی تبدیلیوں کے ساتھ ہندوستان کے ادب میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں کسی بھی طور اُردو ادب نے خود کو سیاسی تحریکات سے الگ نہیں رکھا، بلکہ پورے زور و شور سے اس کے ادیب و شاعر، وقت اور اس کے مطالبات کی ترجمانی کر رہے تھے اور سیاسی نظمیں بھی لکھی جا رہی تھیں۔ ان میں چکبست اور درگا سہائے سُرور جہاں آبادی، اقبال، شبلی، پریم چند کے افسانے اور بعد میں جوش ملیح آبادی، مجاز لکھنوی، روش صدیقی، سیماب اکبر آبادی، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری نے قومی، سیاسی اور باغیانہ نظمیں کہیں جو آنے والے دور کا سنگ میل تھیں۔ جو نوجوانوں میں ذہنی، سیاسی اور جذباتی تبدیلیوں کی نشان دہی کر رہی تھیں اور ان کے ذہن میں آزادی کا ایک خوش آیند تصور پیش کر رہی تھیں۔

سماجی پس منظر

مطرب بھی ہے، شراب بھی، ابرِ بہار بھی
شیراز بن گیا ہے شبستانِ لکھنؤ

مجازؔ

سماجی پس منظر

ادبی تخلیق اور اس کے خالق کے کردار میں کچھ ایسے ثقافتی عناصر صدیوں سے گھُل مل کر فن پاروں کو تشکیل دیتے رہے ہیں جن کو اس کی شخصیت اور فن کے مطالعے میں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جیسے تاریخی روایات، مذہب، طرزِ فکر، طرزِ معاشرت، تفریحات، طریقۂ تعلیم، رسوم و رواج، صنعت و حرفت، فن و ہنر، ذرائع معاش اور طریقِ پیداوار وغیرہ۔

ان تمام عوامل سے خاص و عام کا خمیر بنتا ہے۔ یہ کچھ شعوری اور غیر شعوری طور پر ہمارے کلچر یا ثقافت کا جز بن جاتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا شاہی پسند، شاہی اطوار اور شاہی لباس ہر دور میں پسندیدہ نظر سے دیکھے گئے اور ان کو کم و بیش اپنانے اور نقل کرنے کی کوشش جاری رہی۔ مغلیہ سلطنت کے دور میں یہ عوامل خلط ملط ہو کر عوام کی زندگی میں شامل ہوئے۔ اُس سلطنت کے زوال کے بعد ہی عناصر اودھ کی تہذیب کے فروغ میں معاون ہوئے۔

محمد شاہ کے زمانہ میں (۱۷۲۲ء) میر محمد امین برہان الملک کو اودھ کا صوبیدار مامور کیا گیا اور اودھ کی سلطنت کی داغ بیل پڑی۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا محمد مقیم صفدر جنگ ان کی جگہ صوبیدار منتخب ہوئے۔ ان کے دور میں اودھ کی رونق مزید بڑھی۔ صفدر جنگ کے بعد ان کے صاحبزادے شجاع الدولہ (۱۷۵۳ء) اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور وہ سکونت کی غرض سے فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئے مگر ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں شاہ عالم کے ساتھ ان کو بھی انگریزوں کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی۔ بعد میں صلح ہو گئی لیکن انھوں نے کسی مصلحت کی بناء پر لکھنؤ کے بجائے فیض آباد ہی کو دار الحکومت بنائے رکھا۔ فیض آباد میں درباری ٹھاٹھ باٹ، رونق، عیش و عشرت کی فراوانی اور علم دوستی کی خبر سے لوگ دُور دُور سے آ کر آباد ہونے لگے۔ یہاں تک کہ دہلی کے باکمالوں نے بھی اپنے وطن عزیز کو خیر باد کہنا شروع کر دیا اور ادھر ہی کا رُخ کیا۔

۱۷۷۵ء میں باپ کے انتقال کے بعد آصف الدولہ مسند نشین ہوئے اور انھوں نے لکھنؤ کو اپنا مستقر بنایا۔ تمام اہلِ فن جو فیض آباد میں جمع تھے لکھنؤ منتقل ہونے لگے۔ فیاضی اور عیش پرستی کے مظاہرے شروع ہو گئے۔ شعراء، صنّاع، موسیقار، علماء، فن کار، دستکار اور دیگر اہلِ فن کی قدردانی ہونے لگی۔ شاہی سرپرستی کی وجہ سے فنِ تعمیرات کو بھی عروج حاصل ہوا، کیونکہ یہ شاہان اودھ بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر تاجدارانِ دلی کی شان و شوکت اور کارناموں سے متاثر تھے۔ لکھنؤ کو مستقل دار الحکومت قرار دینے کے بعد اس شہر کو خوب آراستہ کیا گیا۔

اس پورے دور میں فن موسیقی تمدن کا جزو بن گیا تھا۔ اس کو ترقی دے کر اس کی ہر دل عزیزی کو آخری منزل پر پہونچا دیا گیا۔ اجودھیا اور بنارس میں مذہبی امور کے سہارے یہ فن ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا، لیکن شاہانِ اودھ کی قدردانی سے اسے عروج کی انتہائی منزل مل گئی۔[۱]

ان رقص و سرود کی محفلوں نے عوام کے مزاج میں ایک لطافت اور تعیش پیدا کر دیا۔ مزاجوں میں نزاکت اور دلوں میں سوز و گداز بدرجۂ اتم پیدا ہو گیا۔ ساتھ ہی عیش و آرام اور طوائفوں کی قربت جیسی مضر عادتیں بھی پڑ گئیں۔ ان فنون سے متوازن انداز میں صحت مند عناصر کی ترویج کے بجائے معاشرے میں بگاڑ سا آنے لگا۔ ہر رئیس ایک طوائف ملازم رکھنا اپنی شان سمجھتا تھا۔ جنھیں مقدور نہ ہوتا وہ خود بالا خانوں پہونچنے لگے۔

اس شاہی دور میں پورے معاشرے کا مزاج نفاست اور نزاکت کے سانچے میں ڈھل رہا تھا اس لئے معاشرتی زندگی میں جدت اور ندرت آتی جا رہی تھی۔ اس دور میں کھانے پینے کے علاوہ سامان آرائش، عمدہ مشروبات اور پہننے اوڑھنے کے زیورات و لوازمات کی ترقی میں فن اور تجربے کا پتہ ملتا ہے۔ نئے نئے فیشن کے لحاظ سے "لکھنؤ مشرق کا پیرس کہا جانے لگا تھا"[۲] اس سلسلہ کی تمام صنعتیں عروج پر نظر آتی ہیں۔

اودھ کی تہذیب کی نشو و نما میں ہر مذہب و ملت کا حصہ تھا۔ یہ ایک مشترکہ تہذیب تھی۔ صدیوں کے ربط ضبط کے بعد ایک خاص صورت میں نمایاں ہو رہی تھی۔ اس پر دلی کی شائستگی، ضبط اور ٹھہراؤ کا بھی اثر تھا۔ لکھنؤ میں پوری قوم کو رزم گاہوں سے فرصت مل چکی تھی اس لئے نشست و برخاست پر زیادہ زور رہا۔ نتیجہ میں اس کے آداب بہتر سے بہتر وضع ہوتے چلے گئے، جس کا اثر پورے سماج پر پڑا اور ایران و دلی کا طرز معاشرت، وضع قطع، انداز گفتگو اور آداب محفل ہندوستان کی اکثریتی طبقے کی ثقافت و تہذیب سے خلط ملط ہو کر پورے لکھنؤ پر چھا گیا اور پورا اودھ اس سے متاثر تھا۔ لوگوں سے ادب سے ملنا، بڑوں کا ادب، چھوٹوں سے شفقت، عورتوں سے عزت و تہذیب سے پیش آنا یہاں کی تہذیب کا جزو اعظم بن گیا۔ لوگوں کے گھروں پر محفلیں جمتیں جہاں علم و فن اور زبان و ادب پر بحثیں ہوتیں، ایک دوسرے سے استفادہ کرتے، تلفظ الفاظ، دلکش انداز بیان اور

---

۱ گذشتہ لکھنؤ - مولانا عبدالحلیم شرر، صفحہ ۱۹۸۔ ۲ گذشتہ لکھنؤ از مولانا عبدالحلیم شرر صفحہ ۲۸۶۔

زبان کی شائستگی کا خاص خیال رکھا جاتا، یہاں تک کہ عام ملنے جلنے اور مزاج پرسی میں بھی نکھرے ہوئے فقرے کہے جاتے۔ جواب میں انکساری اور تشکر کے جملے ادا کرتے، محفلوں اور نشستوں کا رنگ ایسا رہتا کہ سنجیدگی اور لطف آخر تک باقی رہتا۔

"کسی ملک اور کسی قوم کی تہذیب و معاشرت کا اندازہ اس کے طرزِ گفتگو سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ تہذیب و شائستگی کا تقاضا یہ ہے کہ زبان پر کوئی بھی فحش یا مکروہ لفظ نہ آنے پائے اور زبان میں ایک خاص لطافت، شائستگی اور نرمی ہو۔ لکھنؤ کی زبان کو سن کر بھی اس کی تہذیب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس دور میں لکھنؤ میں جتنی صاف، شستہ اردو بولی جاتی تھی اتنی ہندوستان کے اور کسی شہر میں نہیں جس کا اثر آج بھی لکھنؤ میں باقی ہے۔"[1]

لکھنؤ کی سرزمین بذاتِ خود علم و فن کے لئے موافق تھی اور اہلِ علم کو راس آئی۔ ہر شعبۂ حیات میں علمی فنی ترقی رونما ہوئی۔ علم نے شعور میں بالیدگی پیدا کر دی تھی۔ علم و فن کی پود کہیں سے بھی آئی یہاں سرسبز و شاداب ہوتی چلی گئی۔ اہلِ لکھنؤ نے ان کی بارآوری و آبیاشی میں اس قدر محنت در یافت کی کہ اس کی ایک انفرادی حیثیت تسلیم کی گئی۔ اس میں اہلِ علم و ہنر کی توجہ اور دلچسپی اور شاہانِ اودھ کی سرپرستی نے علم و فن کو منزلِ عروج پر پہونچا دیا۔ شعور کی بالیدگی سے ہر شعبۂ حیات میں تنوع اور جدت کے ساتھ ساتھ فکر بلیغ پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں اخلاقی قدریں متاثر ہوئیں اور ان میں تیزی سے تبدیلیاں آنے لگیں:۔

"لکھنؤ کی علم دوستی صرف اس لئے نہ تھی کہ اودھ کے حکراں کی سرپرستی اسے نصیب تھی بلکہ ایک خاص وجہ یہ تھی کہ یہ سرزمین ہی علم کو راس آ گئی۔ یہاں شاہی یا نوابی ہونے سے بہت پہلے بھی عربی علم و ادب کی اشاعت ہو رہی تھی۔"[2]

ڈاکٹر اعجاز صاحب کا اشارہ اورنگ زیب کے دور میں فرنگی محل کے ملا نظام الدین سہالوی کی طرف ہے جنھوں نے عربی کے علم و فضل کا دروازہ کھولا تھا اور اسے ہندوستان کی اعلیٰ ترین درس گاہ بنا دیا تھا کہ یہاں بخارا، خوارزم اور ہرات و کابل سے علماء تحصیل علم کے لئے آنے لگے اور اس کی شاگردی پر فخر کر رہے تھے۔ شاہانِ اودھ سے قبل ہی لکھنؤ علم و حکمت، فلسفہ، منطق و کلام، فقہ و اصول اور دوسرے علوم کا مرکز بن چکا تھا بقول مولانا عبدالحلیم شرر مجتہدین کا آغاز بھی فرنگی محل سے ہی ہوا۔

---

[1] گذشتہ لکھنؤ از مولوی عبدالحلیم شرر صفحہ ۲۴۳ [2] اردو شاعری کا سماجی پس منظر ڈاکٹر اعجاز حسین صفحہ ۲۹۲

لکھنؤ کے پہلے مجتہد مولوی دلدار علی صاحب نے ابتدائی کتب درسیہ فرنگی محل ہی میں پڑھی تھیں۔[1]

"زبان اور شاعری کے ساتھ لکھنؤ نے علم و فضل میں بھی ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی۔ اگر سچ پوچھئے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا بغداد و قرطبہ اور اقصائے مشرق کا نیشاپور و بخارا تھا۔"[2]

لکھنؤ کے پڑھے لکھے لوگوں کا ذہن عربی علم و فن سے کافی حد تک متاثر تھا اور ساتھ ہی فارسی چونکہ سرکاری زبان تھی اس لئے اس کا پڑھنا پڑھانا عام علمی مشغلہ تھا۔ ہر خواندہ کہلانے والے شخص کو فارسی جاننا ضروری تھا۔ شعوری و لاشعوری طور پر بچے، بوڑھے اور جوان سبھی فارسی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے جمالیاتی حس اس دور میں بدرجۂ اتم کو پہنچی ہوئی تھی۔ ہر چیز میں حُسن کی تلاش تھی۔ نتیجے میں اُردو نے بھی فروغ پایا۔ اس میں بھی اصنافِ سخن اور زبان کا حُسن پیدا کیا گیا۔ حالانکہ اس کا درجہ عربی اور فارسی سے کمتر سمجھا جاتا تھا۔ ناسخ جو ایک صاحبِ علم تھے انھوں نے کچھ لسانی تبدیلیاں اردو میں کیں اور اس کو مکروہ و غلط الفاظ سے پاک کیا۔ آہستہ آہستہ اُردو پورے اودھ کی عام زبان بنتی چلی گئی۔ ہندی کے فصیح الفاظ مستعمل ہو گئے اور تمام زمینداروں اور جاگیرداروں کے گھرانوں کی اردو مادری زبان بن گئی۔ اس زبان نے اس حد تک ترقی کی کہ الفاظ اور جملوں، روزمرہ اور محاوروں کے نت نئے طریقے استعمال میں آئے۔ اس میں سماجی، معاشی، علمی، معاشرتی، اخلاقی ہر قسم کے مضامین شامل ہو گئے اور اس کو ان کے بیان میں دسترس حاصل ہو گئی جو تمدن اور تہذیب کے ساتھ ساتھ زبان کی بھی ترقی کی ضامن ہیں۔ زبان میں برجستگی، چُستی و نرمی کے ساتھ ساتھ قنوطیت و لطافت جیسی صفتیں پیدا ہو گئیں۔ ایسے ذو معنی الفاظ اور جملے وضع ہو گئے جو ذرا سے ردّ و بدل سے مختلف معنی دینے لگے اور اُن سے مزاح اور بذلہ سنجی میں ایک تنوّع و جدّت پیدا ہو گئی جو عام مزاج پر گراں بھی نہیں گذرتی اور لطف دینے لگی۔ استعاروں اور کنایوں کا استعمال بڑی خوبی و دلکشی سے عام طور پر ہونے لگا۔

"جو زبان جتنی زیادہ ترقی کرتی ہے اسی قدر اس میں مذاق و ظرافت کے پہلو بڑھتے جاتے ہیں۔ کلام میں ظرافت جن طریقوں سے پیدا ہو جاتی ہے ان کا محصور کرنا بہت دشوار ہے۔ زیادہ تر بنائے ظرافت ایسے الفاظ ہوا کرتے ہیں جو مختلف معنی رکھتے ہوں اور انھیں معنوں سے کسی پر تعریض

---

[1] گذشتہ لکھنؤ۔ مولانا عبدالحلیم شرر صفحہ ۱۲۲
[2] گذشتہ لکھنؤ۔ مولانا عبدالحلیم شرر صفحہ ۱۱۹

ہوتی ہو اور کبھی ظرافت میں ایسے الفاظ سے بھی کام نہیں لیا جاتا بلکہ کسی انسان یا چیز کو کسی ایسی شے سے تشبیہ دی جاتی ہے جو باوجود غیر متناسب ہونے کے مشابہ ہو۔ پھر اس تشبیہ کو ایسے عنوان اور پہلو سے ادا کرنا کہ اس میں بعوض تشبیہ کے استعارے کی شان پیدا ہو جائے علی ہذا القیاس کبھی اپنے آپ کو یا کسی اور کو اس قدر بڑھانا یا اتنا گھٹانا کہ اصلی درجے سے دور ہو جائے۔ ان سب باتوں کے لئے سلیقے کی ضرورت ہے۔ اچھا سلیقہ رکھنے والا سخت سے سخت تعریض کر جاتا ہے اور ناگوار سے ناگوار تشبیہ دے دیتا ہے مگر کسی کا دل میلا نہیں ہوتا یا کسی کو اظہار ناگواری کی گنجائش نہیں ملتی۔ خلاف اس کے کہ اگر کسی بدسلیقہ شخص نے یہ کام کرنا چاہا تو لوگ بگڑ کھڑے ہوتے ہیں اور عداوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا جیسا سلیقہ لکھنؤ کے عوام الناس کو ہے اور جگہ کے خاص لوگوں میں بھی نظر نہیں آتا۔" [1]

ادبی نشستوں اور محفلوں اور ان میں استادوں کے درمیان اور ان کے شاگردوں کے مابین ادبی چشمکیں ہوتیں مگر ان میں اس کا خاص خیال رکھا جاتا کہ کوئی مکروہ اور تہذیب سے گرا ہوا لفظ استعمال نہ ہو اور بات کہہ دی جائے اور محسوس بھی کر لی جائے لیکن جواب کا امکان نہ ہو یا جواب آسان نہ ہو، اس فن کو بھی کمال کو پہنچا دیا تھا۔ مسلسل بحثوں میں ایک دو جملوں سے ساری محفل کا رنگ بدل دینا، مختلف عنوان پر مختلف زاویے سے باتیں اور بحث کرنا اور ان میں ظرافت کے پہلو نکال لینا یہاں کے خاص و عام میں پایا جاتا اور اسی پر محفلوں میں رنگ جمنے اور چہکنے کا دارومدار ہوتا چونکہ علم و فن کا چرچہ صرف خاص تک ہی نہ تھا بلکہ یہاں کا معمولی پڑھا لکھا جتنی علمی استعداد اور جمالیاتی حس رکھتا تھا دوسرے شہروں میں پڑھا لکھا طبقہ بھی نہ رکھتا تھا۔ اس کی وجہ یہاں کی تہذیب و تمدن، مزید براں عربی فارسی کی استعداد اور اردو کی ہر دلعزیزی تھی۔

"اہل لکھنؤ میں شوخی و ظرافت بہت ہے۔ وہ اپنے کلام میں صدہا عنوان سے ظرافت پیدا کرتے ہیں اور جو اس فن میں جتنا زیادہ کمال دکھاتا ہے اتنا ہی زیادہ اہل سخن کی محفلوں میں چمکتا اور ممتاز ثابت ہوتا ہے۔ لکھنؤ والوں میں یہ ملکہ طبیعت ثانیہ بن کے ان کی فطرت و جبلت بن گیا ہے اور لطافتِ کلام کے ساتھ ساتھ بذلہ سنجی و ظرافت میں جیسا بے تکلف اور مستمر استدراق ان کا نظر آئے گا اوروں کا نہیں ہو سکتا۔" [2]

---

[1] گذشتہ لکھنؤ۔ مولانا عبدالحلیم شرر صفحہ ۳۳۔

[2] ایضاً ایضاً صفحہ ۳۴۔

اس دور کے زبان و ادب کا اگر اجمالی جائزہ لیا جائے تو یہ دونوں ہی عربی علم و فن سے پوری طرح متاثر نظر آتے ہیں۔ فارسی کی اچھی استعداد ملتی ہے اور ان دونوں زبانوں کے اثر سے اردو ایک نکھری و نکھری حیثیت میں نظر آتی ہے۔ اس تمدن میں جمالیاتی حس کی کمی نہ تھی۔ ہر شے میں حسن کی تلاش عام تھی۔ جو کمی حسن و صنعت میں نظر آتی اُسے کوشش اور ریاض سے پوری کرتے۔ فنون لطیفہ سے بے انتہا رغبت تھی۔ دستکاری و صناعی سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔ مذہبی و اخلاقی قدروں کا احترام لازم سمجھا جاتا تھا، لیکن ساتھ ہی نفس پرستی و جنسی میلانات کی بھی کمی نہ تھی۔ ان تمام خصوصیات اور عوامل کے امتزاج نے اودھ کی ساری فضا کو رنگین اور معاشرے کو مہذب و صاحب علم بنا دیا تھا، لیکن مصلحت و عاقبت اندیشی اور سنجیدہ مسائل پر غور و فکر بہت کم ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ اس دور کی فارغ البالی و آسودگی تھی۔ عیش و عشرت کی جستجو نے حسن اور خصوصاً حسنِ بازاری اور لذت پرستی کو عام زندگی کا جز بنا دیا۔ نفاست و لطافت روز بروز بڑھتی گئی۔ ان رجحانات اور مذاقِ خاص و عام کے امتزاج سے پورا معاشرہ اور اُس کا ادب متاثر نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ شاعری کی تمام اصناف غزل، مثنوی، قصیدہ، واسوخت، رباعی و مرثیہ وغیرہ سب کے سب اسی تمدن کے سانچے میں ڈھلتے نظر آتے ہیں اور ان میں جگہ جگہ معاشرے کے رسوم، اخلاق، علم اور جذبات و احساسات کی آئینہ داری ملتی ہے۔

عربی فارسی کو علمی زبان کی حیثیت حاصل تھی لیکن روزمرہ اور عام بول چال کی زبان اُردو تھی جو عربی و فارسی کے زیر سایہ پروان چڑھ رہی تھی۔ الفاظ کا ذخیرہ انھیں زبانوں سے اس میں منتقل ہو رہا تھا اور انھیں دونوں زبانوں کی علما، کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری طور پر اس کی سرپرستی بھی کر رہے تھے۔ گرامر کے لحاظ سے بھی اُردو پر یہی دونوں زبانیں حاوی تھیں۔ اُردو چونکہ پیدائش سے ہی ترقی پسند واقع ہوئی تھی اس لئے اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرنے کی صلاحیت موجود تھی جس کی وجہ سے ہر دور میں جو تبدیلیاں آئیں اُنھیں اس نے لبیک کہا۔ یہ زمانے کے تقاضے پوری کرتی ہوئی ہمیشہ معاشرے کے دوش بدوش چلی۔ پرانے الفاظ اور تراکیب کو اپنایا بھی۔ اور جو خاص و عام کے زبان زد نہ رہ گئے انھیں یہ ترک بھی کرتی گئی۔ ساتھ ساتھ روزمرہ اور عام بول چال کے لحاظ سے عربی و فارسی اور دیگر زبانوں کے الفاظ میں ترمیم و تنسیخ کر کے اُسے ٹکسالی بنائی گئی۔ صوتی اعتبار سے مکروہ اور بھدے الفاظ کو ترک کر دیا لیکن سنسکرت اور دوسری مقامی زبانوں کے ایسے الفاظ عام طور پر اکثر نیچ طبقے میں رائج تھے انھیں فصیح شکل میں مستعمل دکھا جس سے زبان کو الفاظ کی تراش و خراش سے ایک نئی زندگی ملی اور زیادہ وسیع مفہوم ادا کرنے کی اہل بن سکی۔ لیکن عربی و فارسی کے غلبے

کی وجہ سے اردو کو یہ نقصان اس دور میں ضرور پہونچا کہ وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے جن کا ذخیرۂ الفاظ کافی بڑا تھا، خاطرخواہ استفادہ نہ کر سکی۔ ان لسانی تبدیلیوں کے دور میں تمام اصنافِ سخن میں زبان و الفاظ پر کافی زور نظر آتا ہے۔ معنی آفرینی اور تخیل کی بلندی کی طرف توجہ کم رہی۔ عام انسانی مسائل اس وقت کے شعراء کی دست رس سے باہر رہے اور وہ علمی و ادبی مقابلوں اور قافیہ پیمائیوں میں کھوئے رہے، لیکن جمالیاتی و لسانی شعور نے نصف صدی کے قلیل عرصے میں زبان کو درجۂ اتم کا نکھار عطا کر دیا جو شاید صدیوں کے ریاض سے نہ پیدا ہو سکتا اور لسانی اختلافات تقریباً مفقود ہو گئے یا بے حد کم ہو گئے۔ ادب کے لئے زبان ہموار ہو گئی۔ یوں تو الفاظ کے ردّ و قبول کے ساتھ زبان کی ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔

دوسری طرف جب دلیؔ کے بزمِ ادب کی شمع لکھنؤ پہونچی تو یہاں ہاتھوں ہاتھ لی گئی اس سے کئی تابندہ چراغ روشن ہوئے اور دُنیائے ادب کو مسلسل فیضیاب کرتے رہے۔ دلی کی مجلسِ ادب سیاسی و اقتصادی انتشار کی نذر ہو کر بکھر گئی تھی اور صرف لکھنؤ میں اسے عافیت و پناہ نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف لکھنؤ والوں نے بھی فراخ دلی کا ثبوت دیا اور انھیں ان کے حسب مرتبہ داد و تحسین بھی ملی تو اہلِ دلی نے کمال محنت کے ساتھ ساتھ اپنے فنی تجربوں، عظمتِ فن اور کمال ہنر سے اہلِ لکھنؤ اور شعرائے لکھنؤ کو فیض یاب کیا۔

غرض دلیؔ اور لکھنؤ والوں کی آپس کی مفاہمت اور احترام کے باوجود شاعری کے رنگ میں جو فرق نظر آتا ہے وہ سیاسی حالات کا نتیجہ تھا۔ دلیؔ والے پریشان حال تھے۔ ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان کے دل دُکھے ہوئے تھے۔ اس کے برخلاف لکھنؤ والے عیش و عشرت اور آسودگی کے دور سے گذر رہے تھے، اس لئے دہلی والوں کے برعکس ان کے کلام میں وہ درد اور نشتریت نہیں ملتی، ہاں کہیں کہیں روایتی غم ضرور ملتا ہے جو زیادہ دیرپا تاثرات نہیں ہوتا۔

"اس دور میں مستقبل کے شعراء، خواہ براہِ راست دہلی کے باکمال اساتذہ سے مستفیض ہوئے۔ یا بغیر شاگردی کے معنوی شاگرد تھے، سبھوں نے بزرگوں کی عظمتِ فن کا احترام خندہ پیشانی و کشادہ دلی سے کیا۔ کسی نے زبانِ حال سے کسی نے زبان قال سے کیا۔"[۵]

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

غرض بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنا ہر ایک نے باعثِ فخر سمجھا، لیکن باوجود احترام و متابعت کے لکھنوی شعراء اور دلیؔ شعراء کی طرزِ فکر میں فرق آ ہی گیا۔ اختلافِ رنگ و طبع لازمی تھا۔ یہ اختلاف،

اختلاف کے لئے؛ تھا بلکہ ماحول کا تقاضا تھا۔ بدلے ہوئے حالات کا عکس تھا۔ سکون و انتشار کا فرق تھا جو اس طرح نمایاں ہوکر شاعری کے سانچے میں ڈھل گیا۔"[1]

لکھنؤ کے ادبی کارناموں میں سب سے شاندار کارنامہ غزل ہے۔ حالانکہ مثنوی اور مرثیوں کو جو فروغ اس دور میں ہوا وہ پہلے کہیں نہیں ہوا۔ تمدن کی چھاپ آپ کو اس دور کی تمام اصنافِ سخن پر ملے گی۔ اس کی تمام اچھائیاں اور برائیاں ہر اصناف میں جھلکتی نظر آتی ہیں۔ غزل کی ادبی روایت فارسی غزل گوئی سے ماخوذ ہے۔ بعد میں استادوں نے ریاض اور مشق سے اس کو آراستہ پیراستہ کیا۔

اس دور کی غزل میں رومانی ذہن پوری طرح حاوی تھا۔ عاشقانہ شیفتگی اور محبت کا جذبہ کم کم نظر آتا ہے اس لئے جس طرح کے جذبات تھے اسی طرح کے الفاظ کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ اردو غزل نے بھی اس دور کے تمدن سے ہم آہنگی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ وہ اپنے دور کی پروردہ نظر آتی ہے۔ اپنی معاشرت و تہذیب کی علمبردار تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ معاشرت بذاتِ خود زوال پذیر تھی اور اس کے مذاق اور زندگی کی اس دور کی غزل کافی حد تک عکاس ہے لیکن یہ حقیقت بھی ذہن و نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ زوال آمادہ دور کی خاکستر میں بھی ایسی چنگاریاں ملتی رہی ہیں جو آگے چل کر شعلۂ جوالہ بنی ہیں۔

اودھ کا وہ تمدن جو علوم و فنون، غایت درجے کی جمالیاتی حس، حسن پرستی، فارغ البالی، آسودگی، مذاقِ سلیم، اکثریتی طبقے کے رسوم و رواج کا بہترین امتزاج، پھر زبان و ادب سے دلچسپی، ان تمام صفات سے مزین تھا اور زبانِ اردو اس کی آئینہ دار تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی بھی شاعر و ادیب جو اس تہذیب کی چھاؤں میں پروان چڑھتا یا اس سے مستفیض ہوتا اور اس کی مجموعی خصوصیات سے بے بہرہ رہ جاتا۔ مجاز کیا بلکہ اس دور کے تقریباً تمام شاعر و ادیب اور ان کی پوری جماعت اسی تمدن کی پروردہ تھی۔ جو فن کار براہِ راست تعلق نہ رکھتا تھا وہ اس سے کسی نہ کسی طور پر متاثر تھا۔ آج نوابی کا دور ختم ہو چکا ہے لیکن اودھ کی تہذیب اپنے گہرے اثرات و نقوش چھوڑ گئی ہے۔

---

[1] اُردو شاعری کا سماجی پس منظر۔ ڈاکٹر اعجاز حسین صفحہ ۲۹۹

خاندانی پس منظر

اور

حالاتِ زندگی

۱۔ خاندانی پس منظر
۲۔ بچپن
۳۔ تعلیم
۴۔ معاشی حالات
۵۔ شامِ غریبانِ لکھنؤ

مجاز کی شخصیت

۱۔ شخصیت
۲۔ مجاز مشاعروں میں
۳۔ رونقِ انجمنِ یار ہوں میں
(کافی ہاؤس کی شامیں)
۴۔ ہم پی بھی گئے، چھلکا بھی گئے،
۵۔ مجاز کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ
۶۔ مجاز ایک بذلہ سنج۔

رہِ حیات بہت پیچ و خم سے گذری ہے
کسی طرف کوئی سیدھا سا راستہ نہ گیا

خاندانی پس منظر اور حالاتِ زندگی

ہندوستان کی تہذیب کی ترویج و ارتقاء میں جو مختلف عوامل کارفرما نظر آتے ہیں اُن میں صوفیاء کرام اور علماء دین کا بھی بہت نمایاں حصّہ رہا ہے۔ انھوں نے اپنی سادگی، سچائی، انسان دوستی، اخوّت، شفقت و محبّت اور ایثار جیسی اعلیٰ انسانی اقدار کے ذریعہ ہندوستان کی ایک بڑی مخلوق کا دل جیت لیا اور علمِ دین کو لوگوں میں برابر پھیلاتے رہے۔ ان کے پیغامات اور علوم بغیر تفریق قوم و ملّت سب کے لئے یکساں طور پر سرچشمۂ فیض بنے رہے۔ یہ علماء مختلف ادوار میں مختلف بادشاہوں کے ہمراہ یا ان کے دعوت ناموں پر ہندوستان تشریف لائے اور یہیں بود و باش اختیار کرلی اور ان کی آنے والی نسلیں ہندوستانی تہذیب و تمدن سے ہم آہنگ ہو کر ایک نئے ہندوستان کی نشوونما میں معاون ہوئیں۔ خواجہ معین الدینؒ چشتی اجمیری کے پیرِ مرشد خواجہ عثمانؒ ہارونی جنھیں عثمان ثانی بھی کہتے ہیں ایران کے رہنے والے تھے۔ ایک بار خواجہؒ اجمیری کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے تھے۔ غالباً اُن کی اولاد میں سے جو علماء اور صوفیاء اس وقت موجود رہے ہوں گے ضرور بادشاہ یا خواجہ اجمیریؒ یا اور دوسرے علماء کرام کے دعوت نامے پر ہندوستان تشریف لائے ہوں گے۔ انھیں کی اولاد میں سے کچھ علماء دولت شرقیہ کے دور میں جونپور یا اس کے قرب و جوار میں تشریف لے گئے اور شاہزادگانِ شرقیہ کی تعلیم و تربیت و تحصیلِ علم کے لئے مامور کئے گئے اور پھر اُن کی نسلیں ہندوستان اور خاص طور سے مشرقی ہندوستان میں مختلف مقاموں پر جاکر آباد ہوئیں۔

مجازؔ کے آباؤ اجداد کا سلسلۂ نسب جیسا کہ بتایا جاتا ہے خواجہ عثمان ہارونیؒ سے ملتا ہے جو خود ایک بلند مرتبہ صوفی شاعر تھے۔ ان کی سخن وری کا اندازہ ان کی مشہور غزل جس کا مقطع نیچے دیا جاتا ہے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ؎

منم عثمان ہارونی کہ یارِ شیخ منصورم
ملامت می کند خلقے و من بردار می رقصم

ممکن ہے یہاں شعری تصرّف کے لحاظ سے عثمان ہروانی کی جگہ انھوں نے عثمان ہارونی نظم کیا ہو اور اس غزل کی مقبولیت ہی اس بات کی بنا اور وجہ ہوسکتی ہے کہ بعد میں لوگوں میں یہ عثمان ہارونی مشہور ہوگئے ہوں اور اسی سے ان کی اولاد نے ہارونی اور ہروانی دونوں لکھنا شروع کردیا ہو۔

ان کی اولاد میں خواجہ محمد افتخار افضل الملک اور ملّا محمود جونپوری جیسے جید عالم اور

صاحب سیف شامل ہیں۔ اول الذکر خواجہ محمد افتخار بہ زمانۂ ابراہیم شاہ شرقی ۱۴۲۹ء میں صوبہ دار تاتار خاں کے ساتھ راجاؤں کی سرکوبی و سرزنش کے لئے رودولی تشریف لائے اور رودولی کے راجاؤں پر فتح حاصل کی۔ خواجہ صاحب کی شجاعت و دلاوری اور اُن کے حُسنِ انتظام کی تعریف بادشاہ کے گوش گذار ہوئی جس کے صلہ میں انھیں بادشاہ کی طرف سے گاؤں کے گاؤں بحیثیت جاگیر عطا ہوئے جو بعد میں نسلاً بعد نسلٍ چلتے رہے۔ یہ جاگیریں اور زمینداریاں قصبہ رودولی کے گرد و پیش کے مواضعات میں تھیں جو لکھنؤ سے تقریباً نوّے کلومیٹر اور فیض آباد سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر لکھنؤ، فیض آباد کی مین ریلوے لائن پر واقع ہے اور یہ ضلع بارہ بنکی کا آخری قصبہ ہے جس سے ایک طرف ضلع فیض آباد اور دوسری طرف ضلع سلطان پور کی سرحدیں ملتی ہیں۔

"خواجہ محمد افتخار ہارودلی کو ایک جاگیر ۱۴۳۲ء میں سلطان شاہ محمد ابراہیم جونپور سے ان کی خدمات کے صلے میں ملی جو انھوں نے راجپوتوں کے نکالنے میں انجام دی تھیں۔"[1]

اودھ کے بعض مردم خیز قصبات جو کافی مشہور ہیں جیسے رودولی، سندیلہ اور کاکوری وغیرہ۔ ان میں رودولی کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اکثر لکھنوی کہا کرتے تھے کہ "رودولی تو لکھنؤ کا ایک محلہ ہے کوئی الگ قصبہ نہیں ہے۔" اس کی خصوصیت کیا ہے۔ اس کے پیچھے ایک تاریخ ہے۔ فیض آباد جو رودولی سے بمشکل ۲۰۔۲۲ میل دور ہے، اودھ کا دارالسلطنت تھا، لہٰذا قریب ترین قصبہ رودولی ہونے کی بنا پر تہذیب و تعلیم اور دوسری معاشرتی و سیاسی تبدیلیاں ہر صورت میں رودولی تک پہونچتی رہی تھیں۔ جب شجاع الدولہ کے دور میں اودھ کا دارالحکومت لکھنؤ کو منتقل ہوا تو ساری منتقلی اسی راستے سے ہوئی اور لکھنؤ کا براہِ راست تعلق رودولی سے برسہا برس تک رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تمدن و تہذیب سے اس قصبہ کو اس قدر فیض پہونچا کہ یہی اس کی ثقافتی میراث بن گئی۔ اودھ اور اس کی تہذیب کے عیوب ہوں کہ محاسن سبھی بعینہٖ اس قصبے میں اپنائے جانے لگے۔ خواہ علوم و فنون کی سرپرستی ہو کہ لہو و لعب سے دلچسپی:

"یہاں کی تہذیب، زبان، اخلاق، طرزِ گفتگو، آداب و ملاقات پر فیض آباد اور لکھنؤ کی چھاؤں پڑتی ہے۔ بڑی نرم و نازک لکھنؤ کی زبان بولی جاتی ہے جس میں اچھی خاصی دلکشی ہے اور وہ تمام خصوصیات یہاں کی تہذیب میں موجود ہیں جیسا کہ لکھنؤ کے لئے لکھا گیا ہے یعنی آداب و سلام

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر بارہ بنکی صفحہ ۲

کے قاعدے، نشست و برخاست کے انداز، استقبال و مزاج پرسی کے اسلوب، آداب مجلس کے طور طریق (لکھنؤ کی میراثی تہذیب صـ۲۰۳) پر یہاں عمل ہوتا ہے۔"[1]

خلاصہ یہ کہ یہاں کی تعلیم، زبان و ادب، مذہبی عقائد، طرز و فکر، طرز معاشرت، رسم و رواج کی روایات، صنعت و حرفت، فن و ہنر اور معاش کے مختلف ذرائع سب کے سب اسی تمدن و معاشرے کی دین تھے۔

اس قصبے کا ہر شریف گھرانہ سندی تعلقہ دار تھا۔ اس کا گزیٹر میں نام تھا خواہ چودھری محمد علی ہوں، چودھری ارشاد حسین ہوں یا چودھری احمد حسین سب کے سب متمول اور باعزت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ان میں ایک سے ایک عالم و ادیب بھی پیدا ہوئے۔ ان عالموں کی صحبت میں یہاں کے خاص و عام میں علم و ادب کا اس قدر چرچا تھا کہ اگر آپ کو یہاں کے کسی آدمی کی علمی استعداد کا پتہ نہ ہو تو آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ شخص کتنا پڑھا لکھا ہے، کیونکہ یہاں کا معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی پچاسوں شعر صائبؔ، حافظؔ اور عرفیؔ کے آپ کو سنائے گا اور متعدد اشعار اردو کے نامور اساتذہ کے اس کو ازبر ہوں گے۔

"زمانۂ سابق میں یہاں بڑے بڑے علماء، ادیب، شاعر گذرے ہیں جن کی شہرت اس وقت تک ہے۔ اور ان حضرات نے اپنی لیاقت و قابلیت کی وجہ سے کافی نام پیدا کیا۔"[2]

یہاں لوگوں میں ادبی ذوق کافی بلند تھا۔ مشاعروں کا دور دورہ تھا۔ اکثر و بیشتر مشاعرے مختلف انجمنوں کی طرف سے ہوا کرتے جس میں ملک کے بلند پایہ شعراء حضرات شرکت کرتے اور داد تحسین حاصل کرتے۔ کسی قسم کی بے ادبی، ہوٹنگ اور ناشائستہ حرکت ان مشاعروں میں نہ ہوتی۔ بہت ستھرے مذاق کا ثبوت سامعین دیتے جس سے شعراء کی ہمت افزائی ہوتی اور وہ اپنے بہترین کلام سے ان مشاعروں کو نوازتے۔

"دوران مشاعرہ کسی طرح کی کوئی ایسی بات نہ ہوتی جو آدابِ محفل کے خلاف ہو یا کسی کی عزت و احترام میں فرق آجائے۔ سامعین عام طور سے خواہ نشست ہو یا مشاعرہ نہایت توجہ، شائستگی اور سلیقہ مندی کے ساتھ ہر شاعر کا کلام سنتے ہیں اور موقع و محل سے شاعر کو دادِ سخن دیتے ہیں، ان کا دل بڑھاتے ہیں جس سے شاعر بھی خوش ہو کر دل لگا کر پڑھتا ہے۔ نہ ہلڑ، نہ ہنگامہ۔ نہ ہوٹنگ۔ نہ سیٹیاں بجتی ہیں اور نہ یہ آواز ہوتی ہے کہ نہیں سنیں گے نہیں سنیں گے۔ مقطع پڑھئے، بور نہ کیجئے۔ ہر فرد تہذیب، شائستگی، متانت، سنجیدگی،

---

[1] اپنی یادیں رُدولی کی باتیں۔ علی محمد زیدی۔ صـ۱۳۷
[2] ایضاً ایضاً ایضاً صـ۱۱۸

کا ثبوت پیش کرتا ہے، اور یہ ایک ایسی صفت ہے جس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔"[1]

جہاں تک رُدولی کی زبان کا تعلق ہے یہ لکھنؤ سے متاثر تھی سوائے مصدروں وغیرہ کے جس پر اودھی کا اثر غالب تھا۔ لکھنؤ کی اُردو زبان بولی جاتی تھی۔ عوام میں کچھ ہندی کے الفاظ بھی بولے جاتے تھے۔ عورتیں واحد متکلم کا صیغہ بولتی تھیں۔ مجموعی طور پر یہاں کی زبان بہت سادہ، رواں اور شیریں تھی۔ بقول مولانا تقی شبّر کے:

"ردولی اور لکھنؤ کی منجھی ہوئی ٹکسالی زبان کا روزمرہ اور محاورہ، لہجہ اور ساخت یکساں ہے۔ دونوں میں اگر فرق ہے تو صرف ہیئت افعال کا فرق ہے۔ لکھنؤ والے کھڑی بولی آتا ہوں، جاتا ہوں وغیرہ بولتے ہیں۔ ردولی والوں کی بولی اودھی کا تتبع کرتی ہوئی آدت ہیں جات ہیں پر عمل پیرا ہیں، لیکن شائستہ طبقہ زیادہ تر آتے ہیں جاتے ہیں بولتا ہے۔ ردولی کی زبان میں "ہمیں" واحد متکلم کا صیغہ مرد قطعاً نہیں بولتے البتہ عورتیں بڑے ٹھسّے سے بولتی ہیں اور ان کو زیب بھی دیتا ہے۔"

"ردولی کی زبان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے لہجے میں نمود، اثر اور روانی بلا کی پائی جاتی ہے۔ ہر طرح اور ہر ڈھنگ کی بات ادبی چاشنی کے ساتھ کہنے کا اسلوب اس زبان میں پایا جاتا ہے۔"[2]

بیسویں صدی کے آغاز میں جاگیردارانہ نظام کی گہری چھاپ اس قصبے اور اس کے معاشرے پر موجود تھی۔ اس وقت کی ردولی آج کی اس اُجڑی ہوئی رُدولی سے یکلخت مختلف تھی۔ یہاں کے زمیندار گھرانے جو سب کے سب تعلقہ دار اور جاگیر دار تھے، کی آراضیات قصبے کے باہر دیہی علاقوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں، وہی عیش و عشرت اور فراغت کی زندگی گزار رہے تھے۔ کارندے دیہی علاقوں سے مختلف مد کی رقمیں وصول کر کے لاتے اور ان محل نما مکانوں میں رہنے والے مرد و زن کے لئے سامانِ عشرت مہیا کیا کرتے۔ ان کے پاس اس قدر فراوانیِ دولت ہوتی کہ باہر کی دُنیا کی پریشانی و آشفتگی کو محسوس بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس عیش و آرام کی وجہ سے ان کے دل میں پست و غریب طبقے کے لئے کوئی ہمدردی و رحم کا احساس بھی قطعاً نہ رہ گیا تھا بلکہ اس کی جگہ رعونت و فرعونیت جیسا جذبہ غالب تھا۔ مساوات کے وہ بالکل قائل نہ تھے یہاں تک کہ نشست و برخاست میں بھی حفظِ مراتب برقرار رکھتے اور غریبوں کو اپنے برابر نہ بیٹھنے دیتے۔ چودھری محمد علی کے ایک واقعے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جس کا ذکر انھوں نے خود سید علی محمد زیدی سے کیا تھا:

---

[1] اپنی یادیں ردولی کی باتیں۔ علی محمد زیدی صفحہ ۱۱۸

[2] اپنی یادیں ردولی کی باتیں۔ مولفہ سید علی محمد زیدی۔ صفحہ ۱۳۷-۱۳۸

"چودھری صاحب کے مطب میں محلّے کا ایک بقّال اکثر دوا لینے آیا کرتا تھا اور زمین پر بیٹھ کر اپنا حال بیان کرتا۔ اعلان خاتمہ زمینداری کے دوسرے دن صبح کے وقت دوا لینے کے لئے بقّال آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ چودھری صاحب نے دیکھتے ہی اپنی کرسی چھوڑ دی اور زمین پر بیٹھ گئے اور اس سے کہا کہ کل تک یہ جگہ میری تھی آج سے تمہاری ہو گئی ہے۔ اس نے لاکھ معذرت کی اور کرسی سے اٹھنا چاہا مگر چودھری صاحب نے اس کو کرسی سے اٹھنے نہ دیا اور زمین پر بیٹھے بیٹھے اس کو دیکھا۔ دوا دی اور پھاٹک تک رخصت کرنے گئے۔"[1]

غرض کہ قصبے کی تمام آبادی کسی نہ کسی حیثیت سے انھیں زمینداروں اور تعلقہ داروں کے زیر اثر تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نظام زندگی انھیں زمینداروں کے اشاروں پر قائم ہے۔ ان کی شادی وغم پورے قصبے کے شادی وغم ہوتے۔ ان لوگوں کی مذہبی رسومات اور تمام تقریبات بڑی دھوم سے منائی جاتیں اور قصبے کی اجتماعی زندگی کا جز معلوم ہوتیں۔ دیکھنے سے ہی معاشی خوشحالی، زمیندارانہ جاہ و جلال، نفاست، لطافت، خوش سلیقگی، وضعداری، آن بان اور عیش و عشرت کا دور دورہ نظر آتا تھا۔ ہر ہر موقعے پر نئے نئے انداز اور طریقے، تقریبات و رسوم کی ادائگی کے نکالے جاتے۔ بے فکری کی ایک عام فضا تھی۔ زمیندار پورے قصبے کا ناخدا ہوتا تھا۔

ردولی کے تعلقہ داروں، زمینداروں کی زندگی کے ٹھاٹ باٹ کا اندازہ لگانا ہو تو چودھری محمد علی ردولوی کی شان و شوکت کا حال ان کی صاحبزادی بیگم اخلاق نے چودھری صاحب کی زندگی میں قلم بند کیا تھا، ملاحظہ ہو:۔

"جوانی میں پھولوں کا، عمدہ کپڑوں کا، بہترین عطر کا بڑا شوق تھا۔ جامہ وار جامدانی کی شیروانی اور انگرکھے پہنتے تھے۔ مشک اور اگر وغیرہ کے سب سے قیمتی عطر استعمال کرتے تھے۔ پہلے چنبیلی کے پھولوں کا پورا بستہ لگتا تھا جس پر آرام فرماتے تھے۔ حقہ ایسا پیتے تھے کہ مثل دوسرا شاید ہی کہیں دکھائی دے۔ خود ردولی میں نیچے بند کو سکھا کر بتلی نے کے بڑے سبک اور خوبصورت نیچے بنواتے تھے۔ لکھنؤ وغیرہ میں دوستوں کو بھی بھیجا کرتے تھے۔ چاندی کا چنبر نیچے چاندی کی تھالی جس میں رنگ رنگ کے پھول نفاست سے رکھے ہوتے اور چاندی ہی کا حقہ۔ بیلے کے پھولوں کا ہار نے میں لپٹا ہوا عجیب بہار دکھاتا تھا۔"[2]

---

[1] اپنی یادیں ردولی کی باتیں۔ مولفہ سید علی محمد زیدی صفحہ ۳۵ [2] نقوش شخصیات نمبر ۵۵ء

مجازؔ نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ردولی کے ایک ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جس پر شاہانِ اودھ کے ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد کرنیں پڑ رہی تھیں۔ نوابی کا وہ دور تو ختم ہو چکا تھا جس نے یہاں کے ہر انسان کو تعیش پسند بنا دیا تھا لیکن دل و دماغ میں بسی ہوئی وہ شان و شوکت اور نفاست جو صدیوں سے ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھی اور وہاں کی تہذیب بن گئی تھی۔ اب بھی باقی تھی جس کے نتیجے میں اودھ کا ہر جاگیردار تعلقہ دار اور زمیندار گھرانہ ایک ذہنی کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔ اس بدلتے ہوئے سماج کے مطابق اپنے ذہنوں کو ڈھالنا انھیں مشکل نظر آ رہا تھا۔ ایک طرف پرانی قدریں اور ان سے جذباتی وابستگی، دوسری طرف بدلتے ہوئے حالات، نئی قدروں کا خیر مقدم کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ مجازؔ کا تعلق بھی ایک ایسے ہی متوسط درجہ کے زمیندار گھرانے سے تھا جہاں خوشحالی اور معاشی بے فکری کی کمی نہ تھی۔ انھوں نے خود اپنے گھر میں اور دوسرے گھرانوں میں خوشحالی، ٹھاٹھ اور بے فکری کی زندگی دیکھی تھی۔

"یہ خاندان اور یہ قصبہ جس میں مجازؔ نے جنم لیا دونوں ہی کچھ اپنی خصوصیات رکھتے تھے۔ زمینداری کے خاتمہ سے پہلے ردولی کی تمام تر آبادی زمینداروں اور تعلقہ داروں پر مشتمل تھی۔ وہاں کے ماحول میں جاگیردارانہ نظام کی تمام خوبیاں اور خامیاں سمٹی ہوئی تھیں۔ بظاہر وہاں کا کلچر اور تہذیب کی سطح بہت بلند تھی۔ وہاں کی زندگی میں سلیقہ تھا، خوش مذاقی تھی۔ لوگ اچھا کھاتے تھے اچھا پہنتے تھے۔ رکھ رکھاؤ، وضعداری میں خاطر تواضع میں یقین رکھتے تھے۔ پرانی روایتوں سے آخر دم تک چمٹے رہنے میں اعتقاد تھا۔ رسم و رواج کی پابندی ایمان تھا۔ دکھاوے اور نمائش کو اہمیت حاصل تھی۔ ہر خوشی اور غم کے موقع پر دھوم دھام کی تقریبیں ضروری تھیں۔ ہر تہوار پر برادری بھر میں حصے بٹنے لازمی تھے۔ یہ ڈھانچہ زمینداری کی کمزور بنیادوں پر کب تک کھڑا رہتا۔ آخر کو بیٹھ گیا اور آج ردولی میں سوائے عمارتوں کے کھنڈر اور افسردہ و اداس چہروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔"[1]

مجازؔ کے مزاج میں جو سرکشی، بانکپن اور نفاست کا رجحان تھا وہ بھی اسی ماحول کی دین تھا۔ اسکے باوجود مجازؔ ترقی پسند تھے اور اشتراکیت سے متاثر تھے۔ سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کے خلاف ان کے دل میں نفرت کا جذبہ تھا اور وہ ایک نئے نظامِ حیات کی تشکیل میں کوشاں رہے۔ پھر بھی انھیں اپنے تعلقہ دارانہ اس ردولی کے زوال کا بڑا افسوس تھا:۔

---

[1] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۸

"اس خود فراموشی کے عالم میں بھی جب کبھی دوست اُن کے بچپن کی ردولی کا ذکر چھیڑتیں، وہ بہت دل چسپی سے اس میں حصہ لیتے، ہر چھوٹے بڑے کو پوچھتے۔ اب سے آٹھ دس سال پہلے تک وہ اکثر ردولی جایا کرتے تھے، لیکن اب باوجود اصرار کے بھی وہ وہاں نہیں جاتے تھے۔ انھیں اپنے وطن کے زوال پر بہت دکھ تھا۔" [1]

قصبے میں اندر کی طرف عام سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک محلہ آباد ہے جس کو "خواجہ حال" کہتے ہیں، اس میں مجاز کے مورثین کے دو تین مکانات تھے۔ ایک مکان بہت بڑا پختہ تھا جو آج ٹوٹا پھوٹا، ویران و سنسان کھڑا ہے، اب اس میں کوئی نہیں رہتا، لیکن نوابی عہد میں جن دنوں یہ سہ منزلہ عمارت تعمیر ہوئی تھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس زمانے میں یہ قصبے کی سب سے بڑی عمارت تصور کی جاتی تھی اور 'تکیہ' کے نام سے موسوم تھی۔

تکیہ سے شمال میں مخدوم عبدالحق صاحبؒ کی درگاہ کو جانے والی ایک پختہ سڑک ہے۔ مغرب کی جانب دو تین سیڑھیاں چڑھ کر ایک چبوترہ ہے جس کے درمیان ایک عالیشان پھاٹک ہے جو آج بھی مکینوں کی عظمت کی نشان دہی کرتا ہے۔ اسی پھاٹک کے اندر داخل ہو کر صحن کی داہنی جانب ایک عمارت ہے جس کو مجاز کے والد سراج الحق صاحب مرحوم نے بنوایا تھا جو باہری مکان کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ بائیں طرف نبی خانے کی عمارت ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس عمارت میں ایک طاق پر موئے مبارک رکھا تھا جس کو کسی سعید و مبارک موقعے پر زیارت کے لئے کھولا جاتا تھا اور اسی نسبت سے یہ پورا مکان نبی خانے کے نام سے موسوم ہو گیا۔

صحن میں تکیہ کی جانب جانے کے بعد ایک بروٹھا [2] ہے جس سے گذر کر پھر تھوڑی سی کھلی ہوئی زمین ہے اس میں ایک پختہ کنواں ہے اس کنویں سے دو تین گز کے فاصلے پر پھر ایک بروٹھا ہے جہاں سے مجاز کے زنانہ مکان کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ یہ مکان بھی کافی کشادہ اور پختہ ہے اس میں بڑے بڑے دالان اور دہال کمرے ہیں۔ یہ بھی چودھری سراج الحق صاحب کا آبائی مکان ہے، لیکن سراج الحق صاحب نے اپنی شادی کے کچھ دنوں بعد تکیہ کے مکان کے اپنے حصے کے عوض تینوں بھائیوں کے اس مکان کے حصّہ کو حاصل کر لیا تھا۔ چونکہ سراج الحق صاحب کی بیوی ان کے چچا کی لڑکی تھیں اور اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں اس لئے مجاز کے والد صاحب کو یہ مکان پورا اپنے اور اپنی بیوی کے حصے میں مل گیا

---

[1] جگنی بھیا حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۱۸

[2] بروٹھا = چھایا ہوا با مسقف راستہ (COVERED PASSAGE)

اور ہنیں مجاز اور دوسرے بچوں کی ولادت ہوئی۔ یہ مکان اب بھی بہتر حالت میں ہے۔ زنانہ مکان کو فروخت کر دیا گیا ہے اور فی زمانہ اس میں ایک زنانہ اسکول قائم ہے۔

بیرونی حصے میں کچھ زمین سڑک سے متصل تھی جس پر چند دکانیں بنوادی گئی تھیں جو مجاز کی یاد میں محمدیہ اسکول ردولی کے نام وقف کردی گئیں اور اب اس خاندان کے باقی لوگوں کا بھی ردولی سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے۔

محلہ خواجہ حال کے ان دونوں مکانات تکیہ اور بنی خانے میں چودھریوں کا ایک معزز گھرانا آباد تھا۔ اس گھرانے میں ایک بزرگ چودھری احمد حسین (مرحوم) اپنی ذہانت اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے قصبہ میں مشہور تھے۔ مرحوم متوسط زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام تھے نعمت رسول، رحمت رسول، معین الحق اور سراج الحق۔ یہ سب اولادیں ذہین تھیں۔ بیگم حمیدہ سالم لکھتی ہیں کہ "معاملہ فہمی اور کارکردگی میں اس خاندان کی بیٹیاں اس قدر مشہور تھیں کہ قصبے میں اب تک ان کی مثال دی جاتی ہے۔"[1]

انگریزی تعلیم کا چونکہ اس زمانے میں رواج نہیں تھا اس لئے صرف مکتب اور مولوی کی تعلیم کو ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ عربی، فارسی اور حساب کی اس قدر واقفیت ضروری سمجھی جاتی تھی کہ زمینداری کا کام بخوبی چلایا جاسکے۔ اس زمانے کی تعلیم کا یہی معیار تھا۔ دوسرے علوم پڑھنا ضروری نہ تھا۔

چودھری احمد حسین مرحوم کی دو اولادیں بچپن سے ہی غیر معمولی طبیعت کی مالک تھیں۔ ایک مجاز کے چچا تھے جو رنگین مزاج اور آزاد منش تھے۔ دوسرے مجاز کے والد جو بے حد سنجیدہ، بُردبار، کم سخن اور محنتی انسان تھے۔ چودھری احمد حسین کو دونوں کی طرف سے فکر لاحق تھی "مجاز کے چچا تو قابو میں نہ آسکے۔ پڑھنا لکھنا ترک کر دیا۔ باپ کی زندگی میں چھپ کر اور اس کے بعد کھُلم کھلا جائداد کی ایک ایک پائی عیش و عشرت اور رنگ رلیوں کی نذر کردی۔"[2] کہتے ہیں کہ چودھریوں کے اس خاندان کی ہر نسل میں ایک بہکا ہوا فرد ضرور ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت روایت جُڑی ہوئی ہے:۔

"کبھی خاندانی جنّات دادا کسی کی دُلہن اُڑا لائے تھے۔ ایک منچلا لڑکا بار بار جاتا اور کہتا۔ "جنّات دادا دُلہن دکھاؤ۔" جنّات دادا آخر کو جھنجھلا اٹھے اور ایک کنکری اٹھا کر پھینکی جو اس لڑکے کے ماتھے پر لگی۔ اُس وقت سے اس خاندان کی ہر نسل میں ایک دیوانہ پیدا ہونے لگا۔"[3]

---

[1] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۸
[2] ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً
[3] ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً

چودھری سراج الحق صاحب اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ سب سے بڑے بھائی کا انتقال بہت جلد ہوگیا تھا جن کی اولاد میں فرید الحق صاحب وکیل ہیں جو ان دنوں لکھنؤ میں مقیم ہیں اور ردولی بھائی زمینداری اور مکان پر قابض تھے۔ سراج الحق صاحب محنتی اور نیک سیرت آدمی تھے۔ تعلیم سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ گو کہ چودہ برس کی عمر میں چچازاد بہن سے شادی کر دی گئی لیکن علم دوستی اور لگن میں کوئی فرق نہ آیا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ایک تعلقہ دار گھرانے میں ایک انگریزی کے استاد رکھے گئے۔ چودھری سراج الحق صاحب نے ان سے استفادہ حاصل کیا اور اپنے شوق، محنت اور لگن سے پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔ ان کے اس شوق کو دیکھ کر ان کے والد احمد حسین صاحب نے ان کو مزید تعلیم کے لئے لکھنؤ بھیج دیا۔ اور ان کے ماہانہ مصارف کے لئے ۱۵ روپیہ بھیجتے تھے جو ان کی ضروریات کے لئے کافی ہوتے تھے۔ لکھنؤ سے انھوں نے بی۔ اے پھر ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کرلی۔ ردولی کے یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنے خاندان میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور زمینداری کے آبائی پیشے کے علاوہ کسی دوسرے پیشے کو اختیار کیا۔

چودھری سراج الحق صاحب تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دنوں تک لکھنؤ کوئنس کالج میں درس و تدریس کا فرض انجام دیتے رہے۔ بعد میں محکمہ رجسٹریشن میں ہیڈ کلرک ہوگئے اور ۱۹۲۹ء تک اسی شعبہ میں اسسٹنٹ رجسٹرار کے عہدہ پر مامور رہے۔ اسی دوران کچھ دنوں کے لئے آگرہ تبادلہ ہوگیا اور پھر علی گڑھ ملازمت کے آخر دنوں تک وہ علیگڑھ میں ہی رہے اور وہیں سے ۱۹۳۵ء میں رٹائر ہو کر لکھنؤ واپس آگئے، نیو حیدرآباد کالونی میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ تین چار سال بعد اسی کالونی میں انھوں نے ایک مکان اپنے بھتیجے فرید الحق صاحب وکیل کی اعانت سے گیارہ ہزار روپیہ میں خریدا جو ایک بنگالی ٹھیکیدار کی ملکیت تھا۔ اور اس کا نام "دارالسراج" رکھا سراج الحق صاحب کا بھی اسی مکان میں انتقال ہوا۔ یہ مکان اب راجہ سنگرامؤ (جونپور) کی ملکیت ہے۔ ان کو بھی یہ مکان غالباً راس نہیں آیا۔ آج بھی خالی پڑا ہے۔ راجہ صاحب کا چوکیدار صرف وہاں رہتا ہے۔ [1]

چودھری سراج الحق صاحب کی شادی جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے ان کی چچازاد بہن سے ہوئی تھی اور وہ کوئی خاص تعلیم یافتہ نہ تھیں۔ ان کی تعلیم گھریلو تھی لیکن طبعاً بہت تیز، ذہین اور

---

[1] یہ تمام معلومات مجاز کے چچازاد بھائی فرید الحق صاحب وکیل سے حاصل ہوئی جو نشاط گنج میں مقیم ہیں۔

زمانہ شناس تھیں :۔

"ہماری ماں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بالکل ان پڑھ لیکن بہت تیز، ذہین، زمانہ شناس، فطرتاً شوقین مزاج، تفریح پسند اور طبیعت پر جذباتیت کا رنگ غالب۔" [1]

چودھری صاحب کی پانچ اولادیں زندہ رہیں۔ اسرار الحق مجاز۔ انصار ہارونی جو آجکل دہلی میں مقیم ہیں ایم۔ایل۔اے بھی رہ چکے ہیں۔ عارفہ خاتون جن کا انتقال ۱۹۵۱ء میں ہوا صفیہ خاتون جو جان نثار اختر کی شریک حیات تھیں اور ان کا انتقال ۱۹۵۳ء میں ہوا۔ حمیدہ سالم جو ڈاکٹر ابو سالم سے منسوب ہیں اور آجکل روس میں ہیں۔ چودھری صاحب کے ان سبھی بچوں میں ماں باپ دونوں کی خصوصیات کا ملا جلا رنگ شامل ہے۔

بچپن

معصوم بچے جو دیکھنے میں انتہائی ناسمجھ اور کم فہم نظر آتے ہیں حقیقتاً بے حد حساس اور ذہین ہوتے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ بچپن کے واقعات جلد ذہن سے نکل جاتے ہیں اور بچے سب کچھ بھول کر پھر اسی طرح مسکرانے لگتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ سطح آب ضرور پُر سکون ہو جاتی ہے لیکن تہ میں تلخ تجربات کے سنگریزے چھوڑ جاتی ہے جو اس کی نکھرتی ہوئی شخصیت کو ہمیشہ کے لئے متاثر کر دیتے ہیں۔

مجاز ایک خوش حال زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا بچپن اسی جاگیردارانہ ماحول میں گذرا اور ان کے حساس ذہن نے جس کے گہرے اثرات قبول کئے۔ ان کی فطرت میں حسن پرستی عیش و سہل پسندی کا رجحان تھا وہ اسی اودھ کی تہذیب و تمدن کی دین تھا جہاں ناچ رنگ کی محفلیں اور تیتر و بٹیر بازی یہ سب باعثِ فخر سمجھی جاتیں۔ ساتھ ہی ساتھ جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کے غریب کسانوں پر گوناگوں مظالم ان کی نظروں سے گذرے۔ ان کی محنت و مشقت کی کمائی کو عیاشی کی نذر ہوتے دیکھا اور انھوں نے اپنے بچپن سے ہی ان ساری بے انصافیوں کو محسوس کیا۔ نتیجے میں ان کے دل میں اس نظام کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھرنے لگا جو وقت کے ساتھ شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ اور ان کے دل و دماغ کو اشتراکیت کی طرف مائل کر دیا۔

مجاز کا بچپن بے حد لاڈ پیار اور عیش میں گذرا۔ ان کے ماں باپ دونوں ہی ان سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ ان سے بڑا ایک بچہ جو ڈھائی سال کی عمر میں انتقال کر گیا تھا اس لئے ان کا لاڈ و پیار

---

[1] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ صد ۱۸۲

کچھ اور زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ ان کی ماں نے ان کو منتوں اور مرادوں سے پایا:۔

" محرم کی ساتویں تاریخ کو نقیر بنتے، دسویں کو پائک بنتے۔ ایک کان میں بُندا ڈالا گیا جو سات سال کی عمر میں اجمیر شریف میں لے جا کر اتارا گیا۔ ہر بیماری پر صدقے اترتے، خیراتیں ہوتیں۔ نو دس سال کے ہوئے کہ اٹھارہ سالہ بڑے بھائی کا درخت سے گر کر انتقال ہوگیا۔ پھر کیا تھا ماں اور نانی دیوانہ وار ان کو تمام حوادث و خطرات سے بچانے کی ہر ممکن کوشش میں لگ گئیں۔ مجال نہ تھی کہ گھر سے اکیلے باہر قدم نکال لیں۔ ہر وقت ایک نوکر ان کے ساتھ رہتا تھا۔ عمر کے آخر دن تک کوئی صبح ایسی نہ گذری جب ماں نے ان کے لئے دو رکعت شکرانہ کی نہ پڑھی ہوں۔ ابّا چھ سات سال سے ڈھائی آنہ روزانہ ان کے سرہانے رکھے جاتے جو صبح خیرات کر دئے جاتے۔ غرض کہ ان کی ہر سانس کے ساتھ ماں کی دعائیں وابستہ تھیں اور ہر قدم کے ساتھ تمنائیں اور آرزوئیں۔ بچپن سے ہم سب نے یہ محسوس کیا کہ گویا ماں کی زندگی کا محور وہی ہوں۔"[1]

مجاز بچپن میں رات رات بھر جاگ کر گذار دیتے تھے۔ ان کی ماں کو ان کی اس عادت کے باعث جانے کتنی راتیں جاگ کر گزارنی پڑی ہوں گی اور وہ اپنی اسی جاگنے کی عادت کی بناء پر جگن کہے جانے لگے تھے۔ بچپن میں عام بچوں کی طرح بے حد شریر تھے اور لاپرواہ طبیعت کے مالک تھے۔ کسی غیر معمولی رجحان یا میلان کا پتہ نہیں ملتا تھا۔

" بہنوں کو چھیڑنا، بھائی سے لڑنا سب کے مٹھائی کے حصے چھپ چھپ کر کھا لینا، کھلونوں کو توڑ توڑ کر ان کے اندر کی ماہیت سے واقف ہونا، گلی ڈنڈا اور دھول دھپا ان کے محبوب مشغلے تھے۔ آپا میری بڑی بہن ان سے بہت بڑی تھیں سو ان سے ڈرتے تھے اور ان کے رعب میں رہتے تھے۔ ان کا برتاؤ بھی بہن سے زیادہ ماں کا سا تھا۔ صفیہ آپا اور انصار بھائی سے ان کا اوپر تلے کا سا معاملہ تھا۔ بچپن میں ایک منٹ بھی تو ان تینوں کی آپس میں نہ بنتی۔ صفیہ آپا کی گڑیوں کی چٹیا پکڑ کر نچانے میں انھیں خاص لطف ملتا تھا۔ غرض کہ ہر وقت ان تینوں کے مقدمے پیش ہوتے رہتے تھے۔ ہر فیصلہ زیادہ تر جگن بھیا کے حق میں ہوتا تھا کیونکہ ابا کے علاوہ کوئی بھی غیر جانبدارانہ فیصلہ نہیں دیتا تھا۔ جگن بھیا سب ہی کے لاڈلے تھے۔"[2]

حمیدہ سالم کی اس عبارت کو پڑھ کر ایک شوخ و شریر بچے کی تصویر ابھرتی ہے جو بھائی بہنوں

---

[1] جگن بھیا از حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۸۱

[2] جگن بھیا از حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۸۱

سے لڑنے، جھگڑنے اور ماں سے ہمیشہ اپنے حق میں فیصلے کرانے کا عادی ہو۔ کھلونوں کی توڑ پھوڑ، گلی ڈنڈا کھیلنا، دوسرے کے حصہ کی مٹھائی کھالینا جس کی عادت ہے۔

مجاز بچپن سے ہی حُسن کے شیدائی تھے۔ غالباً یہ جمالیاتی میلان انھیں ماں سے ملا تھا اور کچھ زمانے کی بھی دین تھی اور ان کا یہ میلان کچھ غیر معمولی سا تھا۔ حمیدہ سالم نے ان کی حُسن پرستی کے سلسلے سے ایک واقعہ لکھا ہے :-

"کوئی خوبصورت بی بی دیکھ لیں پھر دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ان کے پاس گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ کھیل کود، کھانے پینے کسی چیز کا ہوش نہ رہتا۔ میری پیدائش کے وقت لکھنؤ سے ایک خوبصورت دلہن ردولی بیاہ کر آئیں۔ اُن کا نام حمیدہ تھا۔ ان کے پیچھے جگن بھیا کا دیوانگی کا عالم تھا۔ میرا نام زکیہ رکھا گیا تھا۔ ضد کر کے بدلا اور حمیدہ رکھ دیا جانے محض چاہت میں یا اس امید پر کہ شاید نام ہی کی لاج کی خاطر میں حسین نکل جاؤں۔" [1]

شوخ و شریر ہونے کے ساتھ ساتھ مجاز بچپن سے بیحد ذہین و طبّاع اور حساس بھی تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ردولی کے ایک مکتب سے شروع ہوئی لیکن کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے جہاں گولاگنج میں منشی احترام علی کاکوری کی زنانی والی کوٹھی کے سامنے والے مکان میں رہے۔ بعد میں کرائے کے دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے جو محلہ کچے احاطے میں واقع تھا اور یہیں مجاز نے امین آباد ہائی اسکول سے دسویں کا امتحان پاس کیا وہ اس زمانے میں ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے۔

"پڑھائی میں ہوشیار، حساب میں بہت تیز تھے۔ جماعت میں ہمیشہ اچھے طالب علموں میں شمار ہوا۔ ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ کھیل کود کی وجہ سے گھٹنے ہمیشہ زخمی رہتے تھے اور ماں بیچاری نئے نئے پائجاموں میں پیوند لگاتے لگاتے اور رفو کرتے کرتے عاجز تھیں۔ لانگ جمپ اور ہائی جمپ کی مشق ہر وقت رہتی تھی۔ گھر کے نہ جانے کتنے پلنگ ان کی اس مشق کی نذر ہوتے تھے۔ پلنگ کھڑے کر کے اُن پر سے کودتے تھے۔ غرضکہ گھر میں ہم سب کے لئے ہر وقت وہ تفریح کا اور دلچسپی کا سبب بنے رہتے۔" [2]

مجاز کے بچپن کے بارے میں تمام معلومات ان کے بھائی انصار ہارونی، چچازاد بھائی فریدالحق صاحب اور حمیدہ سالم کے مضمون "جگن بھیا" سے حاصل ہوئی ہیں۔ ان تمام لوگوں کی باتوں اور خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجاز کا بچپن بالکل عام بچوں کی طرح تھا۔ کوئی بات بہت غیر معمولی نہ تھی۔

---

[1] جگن بھیا از حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۰۳ [2] جگن بھیا از حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۰۴

ان کے شاعرانہ ذوق کا احساس بھی ان کے بچپن کے کسی واقعہ سے نہیں ہوتا، ایک ہی چیز ان کے بچپن میں غیر معمولی تھی، وہ اُن کی حُسن پرستی کی فطرت تھی جو زندگی بھر قائم رہی اور یہ فطرتاً رومان کی طرف انھیں راغب کئے رہی، جس کی جھلک ان کی شاعری اور خاص کر "نورا"، "نمائش" اور "بتانِ حرم" جیسی نظموں میں نظر آتی ہے۔ ؎

کیا کہوں میں رات کس محفل میں تھا گرمِ نوا نغمہ و نکہت کا وہ طوفان وہ ٹھنڈی ہوا

دیدنی تھا نازنینانِ تمدن کا ہجوم بے حقیقت تھے نگاہوں میں مہ و مہر و نجوم

نازپروردہ حسیں افکار غم سے بے نیاز مہ جبینانِ حرم قیدِ حرم سے بے نیاز

جن کی اک جنبش سے بُنیادِ حرم میں ارتعاش

جن کی اک ٹھوکر سے زنجیرِ قدامت پاش پاش (مجازؔ)

("بتانِ حرم")

غرض کہ مجازؔ ان سب باتوں کے باوجود بچپن سے کچھ غیر معمولی تھے۔ بے حد لاابالی۔ دوسروں کی چیزیں اپنے مصرف میں لے لینا اور اپنی چیزیں دوسروں کو دے دینا ان کی عادت تھی۔ جاگیردارانہ اثر کے باوجود گھر کے نوکروں چاکروں سے بالکل برابر کے سے تعلقات رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتے۔ ایک کان کچھ خراب رہتا تھا جس کی وجہ سے کچھ اونچا سُننے لگے تھے۔ ان کے ایک ماموں انھیں "بہرے او" کہہ کر اور دوسرے "سڑے او" کہہ کر پکارتے تھے۔

بہرحال مجازؔ نے جب بچپن سے جوانی میں قدم رکھا تو وہ ایک ہونہار طالب علم تھے۔ ماں باپ کی محبت و شفقت کی کمی نہ تھی، متموّل گھرانے کے فرد تھے، شکل و صورت بھی تھی، باپ کی جائداد بھی تھی۔ مزید برآں اُن کے والد سرکاری ملازم بھی تھے، کسی بات کی کمی نہ تھی۔

تعلیم

مجازؔ نے جس زمانہ میں لکھنؤ کے امین آباد اسکول سے ہائی اسکول پاس کیا اسی زمانے میں ان کے والد کا تبادلہ اسسٹنٹ رجسٹرار کی حیثیت سے آگرہ ہوگیا، لہٰذا مجازؔ کو بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ آگرہ جانا پڑا جہاں انھوں نے ۱۹۲۹ء میں سینٹ جانس کالج میں ایف۔ ایس سی میں داخلہ لیا۔ انجینیرنگ کے کورس کی مناسبت سے ریاضی و طبیعیات وغیرہ کا مضمون منتخب کیا۔ ۱۹۳۱ء تک آگرہ ہی میں قیام پذیر رہے۔ یہ زمانہ ان کی ادبی زندگی کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کالج میں جذبیؔ کا ساتھ ہوا اور اتفاق سے فانیؔ بدایونی بھی اس وقت ان کے پڑوس ہی میں رہتے تھے۔ ان سے بھی ربط بڑھا۔ آل احمد سرورؔ بھی کالج میں زیر تعلیم تھے گو وہ ان سے ایک سال سینیر تھے۔

ان سے بھی میل مراسم ہوئے۔ اس کے علاوہ میکش اکبر آبادی، حامد حسن قادری مرحوم وغیرہ سے بھی تعلقات قائم ہوئے۔ ان لوگوں نے ان دنوں آگرہ میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کر رکھی تھی۔ اس ادبی ماحول اور فطری رجحان کے باعث مجاز کی دل چسپی شعر و شاعری سے بڑھنے لگی۔ طبیعت کا فطری رجحان جو اب تک اپنے کمروں کو پھولوں کے گلدان سے سجا کر رکھنے۔ بچوں کو ڈرائنگ تیار کر کے دینے، دیواروں پر میرے لئے گھروندا سجاتے اور اچھی صورتیں دیکھ کر خوش ہوتے، پر مطمئن تھا، ابھرا اور اپنا صحیح راستہ ڈھونڈنے پر مائل ہوا۔"[۱]

۱۹۳۱ء میں مجاز کے والد کا تبادلہ علی گڑھ کا ہو گیا۔ مجاز کو اپنی تعلیم کی غرض سے تنہا بورڈنگ میں رکنا پڑا۔ یہ تنہائی ایک تجربہ تھی کیونکہ اب تک انھیں ہر قدم پر اپنے ماں باپ کا جا و بیجا تحفظ ملا ہوا تھا، جس کی وجہ سے وہ نفسیاتی طور پر کچھ دنوں پریشان رہے۔

"اس موڑ پر کچھ وقفہ حیران و پریشان ٹھٹھک کر رہ گئے۔ پڑھائی میں ابتری پیدا ہونی شروع ہوئی۔ زندگی کا نظام درہم برہم ہونے لگا۔ امتحان میں فیل ہوئے۔ خود بتاتے تھے کہ امتحان کی کاپیاں سادی چھوڑ آتے تھے۔ رات رات بھر شعر و شاعری کی محفلیں گرم کرتے رہتے تھے۔ صبح کو پرچہ کیونکر حل ہوتا وہ بھی حساب کا کیمسٹری کا۔"[۲]

شعر و شاعری سے دل چسپی بڑھتی گئی، کالج کے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ ان دنوں مجاز شہید تخلص کرتے تھے اور جذبی "ملال"۔ کالج کے ایک مشاعرے میں، جس میں آل احمد سرور اور جذبی نے بھی اپنی اپنی غزل پڑھی تھی۔ مجاز کو بہترین غزل پر "گولڈ میڈل" ملا۔ ان کی غزل کا مطلع تھا:۔

"یونہی بیٹھے رہو بس درد سے بے خبر ہو کر
بنو کیوں چارہ گر تم کیا کروگے چارہ گر ہو کر"

میکش اکبر آبادی جو فانی کے شاگردوں میں تھے، سے مجاز کی ملاقات جذبی کے ذریعہ سے ہوئی لیکن یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کب ہوئی، جب تک مجاز آگرہ میں رہے میکش صاحب کے گھر جاتے رہے لیکن ان دونوں کی ملاقات کا کوئی واقعہ ایسا نہیں جو قابل ذکر ہو۔ ایک واقعہ کا ذکر میکش صاحب نے اپنے مضمون میں ضرور کیا ہے۔

"وہ شام کو ہوسٹل سے آنے کو ہوتے تو آدھ گھنٹے آئینہ کے سامنے سنورتے رہتے، یوں تو

شاید ہر آدمی کسی نہ کسی پہلو سے اپنے آپ کو اچھا لگتا ہے اور جتنا اچھا لگتا ہے اس سے زیادہ اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ خصوصاً جب وہ کسی کی نظر میں محبوب بننا چاہتا ہو۔ یہ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ وہ کس کی نظر میں محبوب بننا چاہتے تھے، البتہ ایک روز ایسا ضرور ہوا کہ وہ شام کو حسب معمول میکش یہاں آئے اور ہم سب کی طرف پشت کر کے ایک مکان کی طرف مُنہ کر کے بیٹھ گئے تھے۔ مجھے یہ بات خصوصیت سے بری معلوم ہوئی کیونکہ اس وقت کچھ ایسے لوگ بھی بیٹھے تھے جن کی میں عزت کرتا تھا اس لئے میں نے مجاز کو تنبیہہ کی اور خلافِ عادت سخت لہجے میں تنبیہہ کی مگر وہ بالکل خاموش رہے۔[۱]

اس کے باوجود میکش صاحب نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی اور جذبی صاحب نے اس سلسلہ میں کہا کہ چونکہ مجاز فطرتاً حسن پرست تھے اور میکش اکبرآبادی کے مکان کے دونوں طرف طوائفیں رہا کرتی تھیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ مجاز کے فطری رجحان نے انھیں کسی طرف مائل کر دیا ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ قصہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

اسی زمانے کا ایک واقعہ خود مجاز نے دورانِ جنون ۵۲ ۱۹ء میں یوں بیان کیا تھا:۔

اپنے ایک اور ہم جماعت کا ذکر کرنے لگے جو بیحد شریر تھا۔ ایک عیسائی لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ کسی نے بتایا کہ اس کو رام کرنے کے لئے اُلّو کا دل کھلاؤ، لہٰذا جاڑوں کی راتوں میں رات رات بھر غلیل لئے سڑکوں پر اُلّو مارتے پھرتے تھے۔ آخر ایک دن چار بجے صبح کو اُلّو ہاتھ آ گیا اس کا دل نکال کر کیک میں رکھ کر اس لڑکی کو لے جا کر کھلایا مگر وہ پھر بھی مہربان نہ ہوئی۔[۲]

مجاز نے اپنی کچھ ابتدائی غزلوں میں فانی مرحوم سے اصلاح لی جو اس وقت آگرہ میں مسلم الثبوت استاد کی حیثیت سے موجود تھے۔ ان کی ملاقات اور شرفِ تلمذ میکش اکبرآبادی کی وساطت سے ہوا تھا۔ ۵۲ ۱۹ء میں دورانِ جنون مجاز نے فانی مرحوم سے اپنے کلام میں اصلاح لینے کی تفصیلات خود بیان کی تھیں جسے ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے لکھا ہے کہ مجاز نے اپنی جنونی کیفیت میں فانی کے بارے میں بہت سارے قصے سنائے تھے۔ پہلی بار جب اصلاح لینے گئے تو فانی صاحب میکش صاحب کے یہاں آگرہ میں تھے۔ میکش صاحب کے مکان کے دونوں طرف طوائفیں رہتی تھیں اور بیچ بیچ میکش صاحب کا مکان تھا۔ پہلی غزل ڈرتے ڈرتے انھوں نے سُنائی۔ فانی نے میکش صاحب کو مخاطب کر کے کہا "میاں میکش اس لڑکے نے یہ غزل کہی ہے۔ اس کے بعد ایک غزل پر ایک مصرعہ کی اصلاح

---

[۱] مجاز مرحوم۔ میکش اکبرآبادی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۳۴۷۔ ۳۴۸

[۲] ڈاکٹر محمد حسن کی ڈائری کے اوراق۔ نقوش ۵۵۔ ۵۶

کی اور ایک شعر پر ڈو بار صاد بنایا۔ مجاز کا شعر یہ تھا: ؎

قتل کر کے وہ مستیاں اُن کی		خونِ دل بھی شراب ہونا تھا

فانی نے پہلا مصرعہ بدل دیا:

ہجر میں کیفِ اضطراب نہ پوچھ		خونِ دل بھی شراب ہونا تھا

مجاز نے ہر بار اسے بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارا لونڈا پن دیکھئے۔ لکھنوی انداز کا شعر کہا تھا جس پر ڈو صاد بنادیے تھے۔ وہ شعر یہ تھا:

ان کے جلووں میں گھر گیا آخر		ذرہ کو آفتاب ہونا تھا

اس کے بعد تیسری بار اپنے زعم میں غالب سے بھی زیادہ اچھی غزل لکھ کر ان کے پاس لے گئے۔ انھوں نے ایک نظر دیکھی اور کہا "کل آنا" ہم سمجھے تھے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ دوسرے دن جو مطلع پڑھا:

یوں مسکرائے رُخ سے اُٹھا کر نقاب کو		کچھ بجلیوں نے گھیر لیا آفتاب کو

کہنے لگے مہمل شعر ہے۔ حضرت! آپ برسوں کی راہ ایک دن میں طے کرنا چاہتے ہیں۔" پھر کہا کہ "تبسم لب پر ہوتا ہے کہ چہرے کے چاروں طرف"۔ اس غزل کی اصلاح کے بعد ہم کمرے میں جاکر ایک گھنٹہ کے قریب خوب روئے اور فانی صاحب پر سخت خفا ہوئے۔ اُن کی غزل پر غزل لکھی۔ راہ میں ملے تو طنز سے اُنھیں خوب جھک جھک کر آداب عرض کیا۔ راستے سے گذر رہے تھے۔ مجاز کا مکان راہ میں تھا۔ سلام کیا تو وہیں رُک گئے۔ مجاز نے وہی غزل جو ان کی غزل پر لکھی تھی، سُنائی۔ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ غزل ختم ہو گئی تو کہنے لگے: "میاں مجاز! اس غزل کو پھر پڑھنا۔ مجاز نے کہا۔ یہ گویا میرے لئے سب سے بڑی دادِ تحسین تھی۔ یہ غزل فانی کی غزل (جس میں قافیہ 'ثائے' اور 'سنبھالے' اور ردیف 'ہوئے تو ہیں') پر لکھی تھی اور آہنگ میں شامل ہے۔ اس کا مطلع ہے:

سینے میں ان کے جلوے چھپائے ہوئے تو ہیں		ہم اپنے دل کو طور بنائے ہوئے تو ہیں

آخری غزل کو جو مجاز نے فانی کو دکھائی تھی، اس پر فانی نے کہا تھا یہاں تمھاری غزلوں پر نشاط کا رنگ ہے۔ میرا غم تمھاری جوانی اور نشاط کو روند ڈالے گا' اس لئے آئندہ مجھ سے اصلاح نہ لیا کرو۔ صرف الفاظ اور ترکیبوں کا اشتباہ دور کر لیا کرو یا ایک آدھ مصرع سُنا دیا کرو۔[1]

ان تمام واقعات سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آگرہ کے دورانِ قیام مجاز کی زندگی کا

---

[1] گل و نغمہ، نقوش۔ ۵۵-۵۶ (ڈاکٹر محمد حسن کی ڈائری کے اقتباسات۔

نظام بگڑنا شروع ہو گیا تھا جو زندگی بھر نہ سدھر سکا۔ تعلیمی اعتبار سے تو یہ زمانہ کافی نقصان دہ ثابت ہوا۔ زندگی میں پہلی بار امتحان میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، لیکن شاعری اس ادبی ماحول میں البتہ نکھر اُٹھی۔ رات رات بھر محفلیں جمی رہا کرتی تھیں۔ ان دنوں وہ خالص رومانی غزلیں کہا کرتے تھے۔ جب کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی لیڈران کی شاعری پر اعتراضات کرتے کہ وہ زمانے کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں تو وہ جواب میں طنزیہ کہہ دیتے کہ "پٹری سے ذرا اُتر گئی ہے۔" ایسی کچھ ابتدائی غزلیں اور نظمیں آہنگ میں شامل ہیں۔ ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بقول منظر سلیم:

"ان کی شاعری کی بنیادیں اتنی مستحکم تھیں کہ اس پر اونچی سے اونچی عمارت تعمیر کی جا سکتی تھی۔"[۱]

علی گڈھ یونیورسٹی جس کی عظمت، تعلیم اور تہذیب کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں لوگ تسلیم کرتے آئے ہیں، جس کی سرزمین نے سیکڑوں شاعروں کو جنم دیا۔ مجاز کی شاعری کو بھی راس آئی اور اسے ایک نئی جلا بخشی۔ مجاز جب آگرہ سے علی گڈھ آئے تو یہ دور وہ تھا کہ پورے یورپ میں فاشزم کا زور و شور تھا اور ہندوستان میں تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔ علی گڈھ ہمیشہ سے فکر و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور تمام سیاسی تحریکوں کا مرکز بھی۔ جس کی توضیح علی سردار جعفری نے بھی ہے۔

"یہ زمانہ جتنا ہندوستان کی تاریخ میں اہم ہے اُتنا ہی اُردو ادب اور علی گڈھ کی تاریخ میں بھی۔ تحریک نے انیسویں صدی میں اردو ادب کے دھارے کو موڑا تھا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں غزل کی اصلاح کا سہرا بھی علی گڈھ ہی کے ایک سپوت حسرت موہانی کے سر ہے۔ دوسری دہائی میں وہاں کی رومانی تحریک میں بھی علی گڈھ کا اچھا خاصا حصہ ہے۔ اور تیسری دہائی میں جب ترقی پسند تحریک نے اُردو ادب کو نیا رُخ دیا تو یہاں بھی علی گڈھ پیچھے نہیں رہا۔"[۲]

آگرہ میں تنہا رہ کر جب اُن کی زندگی میں بے اعتدالیاں بڑھنے لگیں اور اُن کی دلچسپی پڑھائی لکھائی سے ختم ہونے لگی تو مجاز کے والد اُنھیں اپنے ساتھ علی گڈھ لے آئے جہاں وہ خود اسسٹنٹ رجسٹرار کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۹۳۱ء میں یونیورسٹی میں سائنس چھوڑ کر آرٹ سائڈ میں داخلہ لایا۔ پہلے اُن کے والد کا خیال انجینیرنگ کی تعلیم دلانے کا تھا، لیکن ان کے رجحان کا اندازہ کر کے شعبۂ آرٹ کو منتخب کیا۔ مضامین میں معاشیات، فلسفہ اور اُردو شامل تھی۔ یونیورسٹی کے ادبی حلقہ میں مجاز کا پہلا تعارف ۱۹۳۲ء میں ہوا۔

---

[۱] مجاز۔ حیات و شاعری۔ منظر سلیم۔ صفحہ ۳۲

[۲] لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ علی سردار جعفری۔

دسمبر ۱۹۳۲ء میں انجمن حدیقۃ الشعرا کا سالانہ مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت سر راس مسعود وائس چانسلر نے کی تھی اور جس میں مولانا حسرت، اصغر گونڈوی اور حفیظ جالندھری شریک ہوئے تھے۔ طلبا کے لئے اس میں نظم کا ایک عنوان "صبح بہار" رکھا گیا۔ مجاز کی نظم پر شروع میں حسب معمول ہوٹنگ ہوئی مگر بعد میں اس کی رنگینی اور دل کشی اور پڑھنے والے کے پُر سوز ترنم نے داد بھی حاصل کی تھی۔ یہ مجاز کا علی گڈھ میں پہلا تعارف تھا۔[1] ۱۹۳۵ء میں مجاز نے علی گڈھ یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ دو سال حاضری پوری ہونے کے سبب سے امتحان میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ بی۔ اے کے بعد انھوں نے ایم۔ اے میں داخلہ لیا جسے دل چسپی نہ لینے کی بنا پر مکمل نہ کر سکے۔

"پڑھنے لکھنے سے مجاز کو کبھی بھی دل چسپی نہ رہی۔ معلوم نہیں بی۔ اے بھی انھوں نے کس مصیبت سے پاس کیا ہو، لیکن جب انھوں نے ایم۔ اے میں داخلہ لیا تو اُن کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ اپنے اساتذہ کا بڑا احترام کرتے۔ رشید صاحب اور مولانا احسن کے ساتھ ان کی عقیدت کچھ مریدوں کی سی تھی، لیکن قدیم ادب، لسانیات اور اس طرح کے موضوعات سے وہ بھاگتے تھے۔ مجھے وہ 'ادب القدما' کہا کرتے تھے۔ ایک دن اُن سے اس موضوع پر کھل کر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ شاعری میں رس اور رچاؤ پیدا کرنے کے لئے کلاسکی ادب کے مطالعے، تجزئے اور تنقید کی بڑی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو مجاز نے بھی تسلیم کیا۔ کچھ لکھنے پڑھنے کا پروگرام بھی بنا۔ میں نے کچھ پڑھ بھی لیا۔ مجاز صرف پان کھانے، شعر کہنے اور شعر سنانے کے نذر ہو گئے۔"[2]

علی گڈھ میں مجاز کے ساتھ علی سردار جعفری، سبط حسن، جاں نثار اختر، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری، جذبی، اختر الایمان اور مسعود اختر جمال وغیرہ تھے۔

جس زمانے میں میں وہاں پہنچا نئی تحریک کے اوّلین نقوش بن رہے تھے اور ادب و سیاست مل کر ایک ہوئے جا رہے تھے۔ اختر رائے پوری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، مجاز، جاں نثار اختر، آل احمد سرور سب وہاں کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر عبد العلیم استاد وہاں تھے۔ بعد کو عصمت چغتائی بھی وہاں پہنچ گئیں اور جذبی بھی۔ یہ سب جدید اُردو ادب کے نہایت اہم اور ہوشمند معمار تھے۔[3] اس زمانے میں نوجوانوں کا اکثریتی طبقہ اشتراکیت اور سوشلزم کی طرف

---

[1] مجاز رومانیت کا شہید۔ آل احمد سرور۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۵۵۶

[2] مجاز۔ ابو اللیث صدیقی۔ نقوش۔ شخصیات نمبر ۵۹۔ ۶۰۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء۔ [3] لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ علی سردار جعفری۔

مائل تھا۔ ادیب و شاعر اپنی تخلیقات کے ذریعہ عوام کے دلوں میں سرمایہ داری کے خلاف نفرت کا جذبہ پھیلا رہے تھے۔ اور ادب کو زندگی سے قریب تر کرنے کی کوشش جاری تھی۔ ادب کو حقائق کی عکاسی کا ذریعہ بنایا جا رہا تھا۔

علی گڈھ کے قیام کا دور جگن بھیا کی ادبی زندگی اور شعور کا روشن ترین دور ہے۔ زیادہ تر اچھی نظمیں اسی زمانے میں کہیں۔ سردار بھائی، سبط بھائی اور بھائی اختر۔ ان سب کا ایک گروہ تھا۔ بہرحال یہ سب نام ایسے ہیں کہ علی گڈھ یونیورسٹی کی تاریخ انھیں بھلا نہیں سکتی۔ کوئی اچھا مقرر تھا تو کوئی چوٹی کا ادیب تو کوئی محبوب شاعر۔ سب اپنے اپنے ہتھیاروں سے فرسودہ نظام سے لڑ رہے تھے۔[1]

ان ادیبوں اور شاعروں میں سجاد ظہیر، رشید جہاں، ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر علیم، کرشن چندر، مجاز، اوپندر ناتھ اشک، جاں نثار اختر، سبط حسن، جذبی، خواجہ احمد عباس، اختر رائے پوری، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احتشام حسین، مخدوم محی الدین، حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی، مسعود اختر جمال، سلام مچھلی وغیرہ شامل تھے۔ بقول سجاد ظہیر کے۔

"پرانے اداروں کے اجارے دار محسوس کر رہے تھے کہ ان کی کشتی میں سوراخ ہو گیا ہے اور اب وہ ڈوبنے سے بچ نہیں سکتی۔ وہ شور و واویلا مچا رہے ہیں۔ وہ اس زمانے کے خواب دیکھتے ہیں جب ان کے جہاز شان و شوکت کے ساتھ تیرتے پھرتے تھے جب ان کے بادبان طوفان خوردہ، غیر محفوظ اور پھٹے ہوئے نہ تھے۔"[2]

علی گڈھ کی اس بیداری کی فضا اور ماحول سے مجاز نے گہرے اثرات قبول کیے جس کا پرتو ان کی شاعری اور شخصیت دونوں میں نمایاں ہے۔ ان کی رومانی طبیعت پر کبھی کبھی انقلاب کا سایہ بھی پڑنے لگا۔ ان کی نظم "انقلاب" اس دور کی یادگار ہے جس کو مجاز نے پہلی مرتبہ علی گڈھ یونین میں پڑھا۔ اس نظم کو مجاز نے جب پہلی مرتبہ یونین میں پڑھا تو آواز میں ایسا جوش اور اتار چڑھاؤ تھا جیسے وہ یونین سے باہر نکلتے ہی جام چھوڑ کر شمشیر اٹھالیں گے۔[3]

مجاز کی نشو و نما علی گڈھ کے جس ماحول میں ہوئی اس کی تصویر کشی ابو اللیث صدیقی صاحب

---

[1] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۸۹

[2] دیباچہ شب تاب سجاد ظہیر صفحہ ۱۲۔

[3] مجاز۔ ابو اللیث صدیقی۔ نقوش شخصیات نمبر ۵۹۔۶۰۔ اکتوبر ۵۶۔ صفحہ ۹۱۷۔

نے ان الفاظ میں کی ہے:

"یونیورسٹی سے ہٹ کر علی گڈھ بڑی خشک، غیر دلچسپ اور غیر شاعرانہ جگہ تھی۔ شہر میں تالوں کی تجارت ہوتی اور ریلوے اسٹیشن پر علی گڈھ کی مشہور ساگونی کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ساگونی جو شکر سے تیار ہوتی لیکن صورت اور مزہ دونوں میں صابون سے مشابہ ہوتی۔ لیکن اس غیر شاعرانہ ماحول میں یونیورسٹی کی دنیا الگ تھی۔ اس کے دارالاقاموں میں زندگی اپنے پورے جلال و جمال، آب و تاب اور رنگ و بو کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ ان میں کھلنڈرے، شاعر، ادیب، ملّا اور مولوی، رند و زاہد، پڑھنے والے اور بے فکرے سب ہی جمع تھے کسی کمرے میں طبلہ کھنکتا اور ستار کے تار جھنجھناتے سنائی دیتے۔ کہیں شعر و شاعری کے چرچے ہوتے، کہیں تاش کی محفل جمی ہوتی، کہیں کرکٹ، فٹ بال اور ہاکی کا ذکر ہوتا، لیکن دو چیزیں سب میں مشترک تھیں۔ خوش باشی، خوش مذاقی، تیسرے درجہ کے گھٹیا پن کا تو ذکر ہی کیا دوسرے درجہ کی بات بھی اس ماحول میں مستحسن نہیں خیال کی جاتی تھی۔ شاید علی گڈھ کی اقامتی زندگی کی شہرت اور کامیابی کا راز اسی معیار میں مضمر تھا۔[1]

علی گڈھ میں مجازؔ کے والد میرس روڈ پر رہتے تھے، جسے علی گڈھ کی سول لائن سمجھا جاتا تھا۔ بقول فرحت اللہ صاحب کے "سارے علیگڈھ کی جنت نگاہ تھی"۔ یہاں سرکاری عہدے داروں کے بجائے یونیورسٹی کے اساتذہ کی کوٹھیاں، گرلس کالج اور اس کا ہوسٹل اور طلبائے قدیم کے جو سرکاری عہدوں پر فائز ہو کر علی گڈھ تبادلہ کرالیا کرتے تھے، مکانات تھے۔

میرس روڈ بڑا ارمان پرور علاقہ تھا۔ یہاں بہت سے صنم کدے اور صنم کدوں کے طواف کرنے والے ملتے تھے۔ سڑک پر دو رویہ درختوں کی قطار، گھنیری چھاؤں، نہر، آم کے درخت، اندھیرا ہوتے ہی جگنوؤں کی چمک دمک، پپیہوں اور کوئلوں کی کوک نے اسے واقعی ایک رومانی علاقہ بنادیا تھا۔ گرلس کالج کی وجہ سے نوجوان طبقہ کے لئے یہ علاقہ اور بھی دل چسپی اور دل کشی کا سبب بنا ہوا تھا۔ لڑکے صبح سے شام تک گھومتے نظر آتے تھے لیکن غنڈہ گردی یا غیر مہذب واقعات کبھی نہیں ہوئے۔ مجازؔ کا تو قیام ہی یہاں تھا۔ ان سڑکوں پر وہ اکثر طواف کرتے تھے۔ ان کی نظم "نذرِ علی گڈھ" میں اسی فضا کا ذکر ہے۔ خصوصاً اس بند میں جہاں انھوں نے "کلیوں سے حُسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی اُبلتی ہے"، "حُسن کی برق چمکتی ہے نور کی بارش ہوتی ہے"، "ہر شام ہے شامِ مصر یہاں ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں"۔ یہ سب اُسی میرس روڈ

---

[1] مجاز۔ ابواللیث صدیقی۔ نقوش۔ شخصیات نمبر ۵۹۔۶۰۔ اکتوبر ۵۶ صفحہ ۹۱۵۔

[2] مجاز۔ ابواللیث صدیقی۔ نقوش۔ شخصیات نمبر ۵۹۔۶۰۔ اکتوبر ۵۶ صفحہ ۹۱۵۔

کی پُرفضا ماحول کی تصویر کشی ہے۔ یہ تفریحی حد تک تھا۔ اس وقت کے کسی رومانی واقعہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔

علی گڈھ کی یونیورسٹی کی یونین کو وہاں کے طلباء کی اجتماعی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہاں تمام قوم وملک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل زیرِ بحث آتے۔ طالب علم اور اساتذہ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کھُل کر کرتے۔ ہر قوم وملت کے لوگوں سے تبادلۂ خیال کا موقعہ ملتا۔ مشاعرے اور ادبی مجلسیں ہوتیں جن میں نوجوان شاعر وادب اپنا کلام سُناتے۔ داد تحسین پاتے۔

"یہاں ایسے مشاعرے ہوتے جو علی گڈھ کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتے تھے، ان میں اساتذہ اور نوجوان شاعر اپنا کلام سناتے اور داد پاتے تھے اور جو داد کا نعرہ یہاں سے بلند ہوتا اس کی گونج ملک کے دور دراز گوشوں میں پھیل جاتی۔ اسی علی گڈھ سے حسرت اور فانی اٹھے یہیں سے جگر اور اصغر کی شہرت کا آوازہ بلند ہوا۔ چنانچہ اسی یونین کے پلیٹ فارم سے مجاز کی جو نظمیں پہلی مرتبہ سُنی گئیں اُن میں "نذرِ خالدہ" ادیب خانم، "نذرِ علی گڈھ" "نمائش" "نرس نورا" رات اور ریل، "انقلاب" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۳۲ء کے قریب مجاز کی شاعری شروع ہوئی اور تین چار سال میں ان نظموں کی شہرت یونین کی چار دیواری سے نکل کر سارے ملک میں پھیل گئی۔ اُس وقت کے نوجوان شاعروں میں مجاز سے زیادہ کوئی مقبول نہ تھا۔ مشاعروں میں بار بار ان سے پڑھنے کی فرمائش کی جاتی اور اس فرمایش میں طلباء سے زیادہ ان طالبات کی آوازیں بلند ہوتیں جو یونین میں اوپر کی گیلری میں الگ بیٹھی یونین کی کارروائی دیکھتی تھیں۔" [1]

یونیورسٹی کی دُنیا جیساکہ بیان ہوچکا ہے شہر سے بالکل الگ تھی۔ اگر یونیورسٹی کو علی گڈھ سے علیحدہ کر دیا جائے تو اس کی حیثیت ایک معمولی غیر ترقی یافتہ شہر کی رہ جائے گی۔ یہاں کی ساری زندگی اور رونق صرف یونیورسٹی کی وجہ سے ہے۔ شہر بذاتِ خود پُرانے انداز کا ہے۔ لگاؤ اور دلچسپی کا کوئی سامان شہر میں نہیں ہے اور طلباء کی تفریح کے لئے کوئی مناسب جگہ نہ ہونے کی وجہ سے انکی زندگی میں دو چیزیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک وہاں کا ریلوے اسٹیشن۔ دوسرے نمائش۔

"وہاں کی مجرد اور خشک زندگی میں دو ہی رنگینیاں تھیں۔ ایک اسٹیشن جو روز کی چیز تھی، دوسرے نمائش جو سال بھر بعد آیا کرتی تھی۔ اسٹیشن علی گڈھ کی زندگی میں ایک پائیں باغ بن گیا تھا، جہاں جس کی بھی طبیعت گھبرائی اسٹیشن پر چہل قدمی کے لئے پہنچ گیا اور نمائش نے

---

[1] مجاز۔ ابواللیث صدیقی۔ نقوش۔ شخصیات نمبر ۵۹۔۶۰ اکتوبر ۵۶۔ صفحہ ۹۱۶۔

تو قومی تہوار کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔"[1]

نوجوان طلباء کا محبوب مشغلہ اسٹیشن کی سیر یا نمائش کے زمانے میں نمائش کے چکر تھے .... گھنٹوں لوگ اِدھر سے اُدھر ٹہلتے خریداری سے کوئی مطلب نہ تھا۔ ذوقِ نظر کی تسکین کافی تھی۔ مجاز کی نظم "نمائش" اسی زمانے کے تند و تیز والہانہ جذبات کی یادگار ہے۔"[2]

نمائش جو علی گڈھ کی معاشرتی زندگی و تہذیب کا ایک اہم جزو بن گئی تھی عموماً جنوری کے آخر اور فروری کے آغاز میں ہوتی جس کی رونق وہاں کے طلباء اور طالبات ہوتے "شام ہونے سے ذرا پہلے ہی بھیڑ چھٹ جاتی اور کالج کے طلبا اور طالبات، اساتذہ اور اُن کے اہل و عیال اور دیگر شرفا نمائش کا رُخ کرتے۔ اس وقت سے رات کے نو بجے تک نمائش اپنے شباب پر ہوتی، سیر ہوتی، نظارہ بازیاں ہوتیں، خرید و فروخت کم ہوتی، چہل پہل زیادہ۔ مجاز اس نمائش میں جس طرح دلچسپی لیتے تھے اُسکی جھلک ان کی نظم "نمائش" میں ملتی ہے۔"[3]

علی گڈھ کی پُرکیف زندگی میں ایسے روح پرور نظارے بس سال پیچھے نمائش ہی میں دیکھنے میں آتے تھے۔ اور جگہوں پر تو روز ہی بساطی کی دوکان پر میلے لگے رہتے ہیں۔ وہاں بساطی کی دوکان ہی نہیں۔ پھر ایسے خریدار کہاں سے آئیں جن کو دل و جان بھی کوئی مفت دے دے[4]

علی گڈھ کے دور میں مجاز کی پہلی شاہکار نظم "نمائش" ہے۔ اس کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ جس میں اسی نمائش کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

فرحت اللہ صاحب کا کہنا ہے کہ مجاز نے علی گڈھ میں بڑی آسودہ اور منضبط زندگی گزاری۔ اور آل احمد سرور کا کہنا ہے کہ "اس زمانے میں ان کا زیادہ وقت دوستوں کے کمرے میں گزرتا تھا۔ ان میں جاں نثار اختر، اختر امام اور حامد جو ٹینس کے اچھے کھلاڑی تھے یاد آتے ہیں" اور علی سردار جعفری نے بھی ان کی مشغولیتوں کا ذکر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گذارتے ہوں گے

"ہوسٹل میں طالب علموں کے کمروں میں، پروفیسروں کے گھروں میں، مشاعروں میں، جلسوں میں، ہر جگہ مجاز چھایا ہوا ہے۔"

"میرس روڈ پر ڈاکٹر رشید جہاں کے گھر پر محفل جمی ہوئی ہے، مجاز اپنی نظم سنا رہے ہیں۔"[5]

---

[1] مجاز۔ کچھ یادیں کچھ باتیں۔ فرحت اللہ انصاری۔ [2] مجاز رومانیت کا مشہد۔ آل احمد سرور۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۵۵۶۔ [3] مجاز۔ ابواللیث صدیقی۔ نقوش۔ شخصیات نمبر ۵۹-۶۰۔ اکتوبر ۵۶۔ صفحہ ۹۱۶۔
[4] مجاز۔ کچھ یادیں کچھ باتیں۔ فرحت اللہ انصاری۔ [5] ہم پر ہے ختم شام غریبانِ لکھنؤ۔ سردار جعفری مجاز ایک آہنگ صفحہ ۲۳۶۔

حیات اللہ انصاری صاحب نے بھی دورانِ گفتگو مجاز کی علی گڈھ کی زندگی کے بارے میں بتایا کہ آگرہ سے شروع ہوئی، بے اعتدالیاں ختم نہیں ہوئیں بلکہ ان میں اضافہ ہی ہوا۔ جذبی صاحب جو مجاز کے ساتھ آگرہ میں بھی رہ چکے تھے ان کا بھی یہی خیال ہے کہ مجاز کی زندگی میں کوئی خاص نظم و ضبط نہ تھا۔ اسی طرح محفلیں دوستوں کے کمروں میں جمتی تھیں۔ وہی سیر و تفریح، وہی مشاعروں کی مشغولیتیں۔ غرض کہ کسی طرح یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مجاز نے علی گڈھ میں منضبط زندگی گذاری ہوگی بلکہ آگرہ کے قیام سے جو نظامِ زندگی کا شیرازہ منتشر ہونا شروع ہوا اس میں ٹھہراؤ کبھی نہ آیا وہ بڑھتا ہی گیا۔ علی گڈھ نے بھی اس میں مزید اضافہ کیا اور یہ بے ترتیبی و بے ربطی عمر بھر ختم نہ ہوئی۔ مجاز کی زندگی میں اس دور میں آسودگی تو بے شک تھی لیکن نہ جانے کیوں فرحت اللہ صاحب نے ان کی علی گڈھ کی زندگی کو منضبط بتایا۔ ممکن ہے انھوں نے ان کی دو چار ملاقاتوں سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہو، یا وہ ان کی اسی زندگی کو منضبط سمجھتے رہے ہوں کیونکہ شراب نوشی کی کثرت سے جو حالات بگڑ گئے تھے ان کے مقابلے میں علی گڈھ کی ابتدائی زندگی ضرور بہتر کہی جا سکتی ہے۔

علی گڈھ نے جہاں انھیں ذہنی بیداری دی، شعور عطا کیا، وہیں ان کو کچھ نقصانات بھی اُٹھانے پڑے۔ شراب جیسی مضر شے کی عادت وہیں کی صحبت کی دین ہے۔ بقول فرحت اللہ انصاری "علی گڈھ میں وہ رندی شروع ہوئی جس نے اُسے دلّی میں رُسوا کیا اور لکھنؤ میں لا کر دفن کرا دیا۔"[1]

رہی شراب نوشی کی ابتدا کی بات، تو مجاز نے پہلی بار اپنے کچھ بے تکلف دوستوں کی صحبت میں شغلاً پی تھی۔

"ایک روز اختر رائے پوری جو اُس زمانے میں بہت بڑے ترقی پسند ادیب تھے یہ خبر لائے کہ ساغر آئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد یہ تجویز کی کہ رات کو ایک محفل جم جائے۔ امتحان کا زمانہ سر پر تھا اس لئے طے یہ ہوا کہ قلعے میں محفل لگے گی۔ میں، اظہر اور مجاز آفتاب ہوسٹل سے چلے۔ اختر رائے پوری، ساغر نظامی اور ایک صاحب جو ندوہ کے فارغ التحصیل تھے الگ سے روانہ ہوئے۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے، تو بوتلیں نکلیں، گلاس نکلے اور شاعری اور شراب دونوں کے دَور شروع ہو گئے۔ تقریباً بارہ بجے ہم دو آدمی اٹھ آئے۔ مولانا اور میں۔ ساغر، مجاز اور اختر رائے پوری رہ گئے۔ رات زیادہ ہو گئی تھی۔ میں آفتاب ہوسٹل میں رہ گیا۔ کچھ دیر مجاز کا انتظار کیا، پھر ہم لوگ سو رہے۔ نہ جانے تین بجے تھے کہ جا

---

[1] مجاز۔ کچھ باتیں، کچھ یادیں۔ فرحت اللہ انصاری۔

کر ٹھہرنے لگے کہ دروازہ پھر بھڑبھڑایا۔ ہم لوگ اُٹھے' دروازہ جو کھولا تو سارا کمرہ مہک اٹھا حیرت سے پوچھا کہ "ہائیں یہ کیا حال ہے؟" اس نے انتہائی سادگی سے کہا کہ میرا حال تو کچھ نہیں۔ مجاز کا حال بہت بُرا ہے۔ ہم دونوں اتر کر نیچے گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ وہ بغلی دروازے کے باہر زمین پر بے سدھ پڑے ہیں۔ اختر لپکے، مولانا کو پکارا۔ وہ باہر آئے تو اختر رائے پوری مجاز کو پیٹھ پر لاد کر مولانا کے کمرے میں داخل ہو گئے اور اندر سے سٹکنی بند کر لی۔ مولانا بیچارے ہکا بکا رہ گئے۔"[1]

مجاز کو خود اپنی حرکت پر نہایت شرمندگی تھی۔ ان کو اس بات کا خوف کھائے جا رہا تھا کہ اس شراب نوشی کی خبر ان کے والدین خصوصاً ان کی ماں کو نہ ہو جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان کی زندگی میں بالکل نیا تجربہ تھا۔ اگر عادی ہوتے تو یہ حالت کبھی نہ ہوتی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نوجوان طبقہ پرانی قدروں سے انحراف اپنی شان سمجھتا تھا اور ہر نئی چیز کو اپنانا باعثِ فخر جانتا تھا اور اشتراکیت کے زیر اثر پرولتاری طبقے کی ایسی عادتوں کو اپنانا جدت سمجھتا تھا۔ خواہ وہ معاشرے اور خود انسان کے لئے کتنی ہی مضر کیوں نہ ہوں۔

علی گڑھ میں مجاز کا قیام تقریباً ۵ سال رہا۔ یہ پانچ سال کا وقفہ مجاز کی زندگی کا بہترین دور تھا جہاں ان کو ذہنی سکون، بے فکری اور محبت کی فضا ملی ہوئی تھی جو پھر زندگی بھر نہ مل سکی۔ ان کی شاعری کو بھی بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی۔

"یہ بلبل اپنے چمن میں سب ہی کو عزیز تھا۔ استادوں کا منظورِ نظر اور طلبا کے لئے باعثِ فخر۔ گرلس کالج میں ہر زبان پر اُس کے راگ تھے۔ عورت کو نکتہ داں بنانے والا شاعر لڑکیوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مجاز کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں، اس کا قد کتنا اچھا ہے۔ وہ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے۔ کسی سے محبت تو نہیں کرتا۔ یہ لڑکیوں کے محبوب موضوع تھے۔"[2]

خصوصاً گرلس کالج کی لڑکیوں میں وہ بہت مقبول اور ممتاز شاعر تھا۔ بقول عصمت چغتائی کے:

"جب مجاز کے نام پر گرلس کالجوں میں لاٹریاں ڈالی جاتی تھیں اور اس کے اشعار تکیوں کے نیچے چھپا کر آنسوؤں سے سینچے جاتے تھے اور جب کنواریاں اپنے بیٹوں کے نام اسی کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں۔ نہ جانے کس ارمان کے بدلے ہیں۔"[3]

---

[1] مجاز۔ کچھ باتیں کچھ یادیں (ادب و تہذیب) فرحت اللہ انصاری۔ [2] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۱۹۰۔ [3] عشق مجازی۔ عصمت چغتائی۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۲۵۴۔

اسی زمانے میں مجاز کا مجموعۂ "آہنگ" شائع ہوا جس کو بیحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ عوام میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور خصوصاً گرلز کالج نے تو اسے حرزِ جان بنالیا۔

"عیدی، بقرعیدی، نمائش کے پیسوں سے چھ چھ سات سات کاپیاں خرید ڈالیں۔ تحفے میں "آہنگ"، نقد، اُدھار، عاریتاً غرض سارے بورڈنگ میں آہنگ چل پڑی۔ جدھر دیکھئے چار لڑکیاں چمن کے کونے کونے میں سر جوڑے، کبھی اندھیری رات کے مسافر کے ساتھ دشت پیمائی کررہی ہیں، تو کبھی بربطِ شکستہ کے تار سلجھائے جارہے ہیں۔ دو لڑکیاں "نذرِ دل" لئے بیٹھی ہیں تو چار خانہ بدوش کے ساتھ چند رات اور ریل کے ساتھ فرّاٹے بھر رہی ہیں، تو کوئی بھولی بھٹکی "غمگین" کسی کی یاد میں غرق مُنہ اوندھائے پڑی ہے۔ کسی طرف "انقلاب" لایا جارہا ہے تو کہیں غدار پر پھٹکاریں پڑ رہی ہیں۔ غرض دل و دماغ پر کچھ اس شان سے "آہنگ" چھائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی وبا بورڈنگ پر ٹوٹ پڑی ہے[1]"

علی سردار جعفری جو اُن دنوں مجاز کے ساتھ علی گڈھ میں تھے' ان کی شخصیت اور شاعری کی مقبولیت کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"وہ یونیورسٹی کا محبوب ترین شاعر ہے۔ جاں نثار اختر اور جذبی بھی طالب علم ہیں، لیکن مجاز کی مقبولیت اور ہی چیز ہے لیکن ہوسٹل میں طالب علموں کے کمروں میں، پروفیسروں کے گھروں میں، مشاعروں میں، جلسوں میں، ہر جگہ مجاز چھایا ہوا ہے۔[2]"

میرس روڈ پر ڈاکٹر رشید جہاں کے گھر پر محفل جمی ہوئی ہے۔ مجاز اپنی نظم سنا رہے ہیں۔ دو چھوٹی بچیاں اپنے کھلونے چھوڑ کر مجاز کے پاس آکھڑی ہوئی ہیں۔ ایک بچی کچھ کہتی ہے، دوسری اُس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے چُپ کراتی ہے "شی گراموفون بج رہا ہے۔"

ترکی کی جنگ طرابلس سے علی گڈھ کو جو جذباتی لگاؤ تھا اس نے ترکی کی افسانہ نگار خاتون کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور جب مجاز نے خراجِ عقیدت اپنی نظم "نذرِ خالدہ" کے ذریعہ پیش کیا تو یونین میں ایک سماں سا بندھ گیا۔

"ترکی کی مشہور مجاہد خاتون اور افسانہ نگار خالدہ ادیب خانم آئی ہوئی ہیں۔ یونیورسٹی یونین میں ان پر پھولوں کی بارش کی جاتی ہے اور مجاز اپنی نظم سے ان کا استقبال کرتا ہے۔ کمال اتاترک

---

[1] عشقِ مجازی۔ عصمت چغتائی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۳۲۔ [2] ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے... سردار جعفری۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۲۲۶، ۲۲۷۔

کے ترکی اور ہندوستان کی آزادی کی لڑائی ایک ہو جاتی ہے۔ نالہ، نام اردو کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتیں لیکن وہ اس زبان کی موسیقی اور ترنم سے مسحور ہو گئی ہیں اور اپنی تقریر میں آٹھ دس منٹ تک مسلسل اردو زبان اور مجاز کی تعریف کرتی ہیں۔[۵]

مجاز جو رومان پرور دل کے مالک تھے، حسین خواتین کی داد تحسین، مشاعرے کی مقبولیت اور شراب نوشی نے ان پر ایک سرمستی کی سی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔

یہ زمانہ مجاز کی شاعری کا بہترین زمانہ تھا۔ اُن کی مقبولیت اپنے پورے شباب پر تھی۔ عصمت چغتائی نے اس کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے "مجاز میں قوت ارادی کی کمی شروع سے تھی۔ دوستوں کی واہ واہ۔ حسین خواتین کی داد، مشاعروں میں مقبولیت نے ایک نشے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔"[۶]

اساتذہ اور طلباء سب میں وہ یکساں مقبول تھے اور خلافِ روایت صرف اپنی مقبولیت کے سبب پریوس کے اسٹوڈنٹ ہونے کے باوجود میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔

علی گڈھ سے ان کا رشتہ طالب علمی کے دور کے بعد بھی قائم رہا۔ دلی میں ریڈیو کی ملازمت کے دوران یہاں کی گرلس کالج کی لڑکیوں کو ریڈیو میں پروگرام دلواتے اور اکثر یہاں آتے رہتے۔ ایک بار ۱۹۳۶ء میں اردو کانفرنس میں شرکت کرنے آئے۔ اس کا ذکر آل احمد سُرور صاحب نے کیا ہے جس سے طلباء میں اس شاعر کے لئے کس قدر عزت و احترام تھا اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسی کانفرنس کے دوران میں یونین میں معزز مہمانوں کا خیر مقدم تھا۔ پنڈت کیفی نے اردو ہماری زبان، کے نام سے ایک مقالہ پڑھا۔ پنڈت کیفی کی آواز پست تھی۔ مائک کا رواج اس وقت تک نہ تھا۔ ہال میں خوب شور ہوا۔ غرض جوں توں کر کے مقالہ ختم ہوا تو صدر نے اعلان کیا کہ اب اسرار الحق مجاز ایک نظم سنائیں گے۔ مجاز نے اپنی دل نشین پُرسوز آواز میں "نذر علی گڈھ" شروع کی۔ مجمع پر ایک بے خودی سی چھا گئی۔ لوگ جھوم جھوم اُٹھے جب وہ اس شعر پر پہنچے:

"آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے"

تو ہر طرف سے بے اختیار نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ ڈائس پر ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالرحمٰن صدیقی

---

[۵] ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ۔ سردار جعفری۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۲۷۔ [۶] مجاز رومانیت کا شہید۔ آل احمد سرور۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۵۵۹۔

اور مولوی عبدالحق صاحب تشریف فرما تھے۔ ذاکر صاحب نے بے ساختہ کہا۔ مجاز صاحب پھر پڑھیے؟"
اس زمانے میں علی گڈھ کے ارباب حل وعقد اولڈ بوائز پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ خلافت کے زمانے کی طرح پھر علی گڈھ کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ مجاز کے اس شعر میں انکا جواب بھی تھا۔[1]
غرض کہ اس ارمانوں کی خلد بریں میں مجاز نے اپنی زندگی کا حسین ترین وقفہ گذارا۔ مجاز اس زمانے میں تنہائے زندگی سے بھرا ایک ایسا ساز ہے جسے نہ مضراب کی ضرورت ہے نہ کسی دستِ فن کار کی۔ چمنستانِ علی گڈھ کی ہر شے اس کے لئے ایک عنوان ہے چاہے وہ ذرے ہوں چاہے تارے ہوں۔[2]

معاشی حالات

ہر انسان اس دُنیا میں تقریباً ایک سی فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ حالات اور واقعات اُسے نہ جانے کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ نہ جانے کتنے غالب و اقبال جیسی صلاحیت رکھنے والے انسان ناموافق حالات کے ہاتھوں گمنامیوں کے غار میں دفن ہو جاتے ہیں۔ مواقع بھی انھیں کو فراہم ہوتے ہیں جن کو معاشی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ دولت کی تقسیم کی وجہ سے اس دنیا میں نہ جانے کتنے انقلابات آئے اور آتے رہیں گے۔ روس اور چین میں انقلابات آئے ہیں۔ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ جدید عالمی تاریخ کا خاص رُجحان انقلاب کا رُجحان ہے جو اس طرح ثابت ہے کہ براعظم یورپ، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کتنے ہی ممالک سامنتی اثرات اور سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ بعض کو زیادہ کامیابی حاصل ہوئی بعض کو کم۔ چونکہ پیچ و خم ایک ہیں اس لئے بقول غالب کہنا ہی پڑتا ہے:

ع ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

مسائل اور افکار ابھی لاحق ہیں۔ ہزاروں سال کی روایات، رسوم و رواج اچانک نہیں بدلتے۔ ایسے اسباب کی بنا پر یہ حقیقت زبان پر آ ہی جاتی ہے کہ آج بھی اسی انسان کو جینے کا حق حاصل ہے جس کا جیب پیسوں سے خالی نہ ہو۔ لیکن شاعر یا ادیب کا فن اس دولت کی آندھی سے ہمیشہ یکسر نیست و نابود تو نہیں ہو جاتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ناساعد حالات اس کی شخصیت کو مجروح کرتے رہتے ہیں۔ مجاز کو بھی اپنے حیات کے سفر میں معاشی مشکلات و ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا کی انھیں نسبتاً آسودگی حاصل تھی اُن کے والد اسسٹنٹ رجسٹرار تھے۔

---

[1] مجاز رومانیت کا شہید۔ آل احمد سرور۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۵۵۔
[2] مجاز۔ کچھ یادیں کچھ باتیں۔ فرحت اللہ انصاری۔

علی گڑھ کا ادبی و سیاسی ماحول بھی حاصل تھا اور کسی قدر ذہنی بے فکری بھی۔ ان اسباب نے ان کے فن کو نکھرنے کا موقع دیا لیکن جلد ہی یہ شاعر آتش نوا اپنے دور کی لڑکیوں اور نوجوانوں کا محبوب شاعر نامساعد معاشی حالات بلکہ معاشی بدحالی کا نشانہ بن کر زندگی بھر سکون کو ترستا رہا جو اسے عمر بھر نصیب نہ ہوا اور وہ عارضی یا نام کا سکون بھی جو کبھی میسّر ہوا تھا جلد ہی چھن گیا اور ہمیشہ کے لئے پارہ پارہ ہو گیا۔

علی گڑھ گرلس کالج کی لڑکیوں کی زبان پر جس زمزمہ سنج شاعر کے نغمے رہا کرتے تھے وہ ناموافق حالات کے گرداب میں پھنس کر ہمیشہ کسی ہمنوا کی تلاش میں سرگرداں رہا لیکن زندگی کی کٹھن راہوں میں اس کا ساتھ دینے کو کوئی بھی تیار نہیں ہوا کیونکہ شاعری ذہن اور دل کو مسرت اور سرور تو بخش سکتی ہے لیکن پیٹ نہیں بھر سکتی تھی۔ "پیٹ تو روٹیوں سے بھرتا ہے اشعار سے نہیں"[1] ایسے خالی جیب شاعر کے ساتھ عقیدت رکھی جا سکتی ہے "محبت" کی جا سکتی ہے لیکن عمر بھر ساتھ دینے کا عہد و پیمان نبھایا نہیں جا سکتا۔ مجاز کو اپنی اس تنہائی کا زبردست احساس زندگی بھر رہا۔ باوجود اپنے اس عزم کے۔ ؎

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں   لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں

وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ع۔ اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ مری قسمت نہیں

اس ہمنوا نہ ملنے کی شکایت اسے اپنی قسمت سے تھی۔ لیکن درحقیقت اس کے حالات کو دیکھئے تو اس کی قسمت کا قصور نہیں بلکہ اُس کی مفلسی و بیکاری اور زمانہ کی ناسازگاری تھی جس کی وجہ سے اس کی تنہائی کبھی ختم نہ ہو سکی۔

۱۹۳۵ء میں مجاز کو ایم۔ اے میں داخلہ لئے ہوئے صرف دو ماہ گزرے تھے کہ دہلی میں آل انڈیا ریڈیو قائم ہوا جس کا ڈائریکٹر فیلڈن نام کا ایک انگریز تھا جو بڑا دانشور اور ادب نواز تھا۔ ایک دفعہ لاہور میں صوبائی گورنر سے مل چکا تھا اور اقبال سے ملنے جا رہا تھا۔ اپنے ایک ملاقاتی سے کہنے لگا کہ میں لاہور کے سب سے چھوٹے آدمی سے مل کر آ رہا ہوں اور اب سب سے بڑے آدمی سے ملنے جا رہا ہوں۔"[2]

فیلڈن نے ریڈیو میں ملک کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو دعوت دی اس میں لاہور سے بخاری کو بلایا اور اپنا نائب مقرر کیا اور ریڈیو میں تقررات کے لئے ایک کمیٹی قائم کی جس میں رشید احمد صدیقی

---

[1] جگن بھیا۔ از حمیدہ سالم علی گڑھ میگزین۔ مجاز نمبر۔

[2] مجاز رومانیت کا شہید۔ آل احمد سرور۔ علی گڑھ میگزین۔ مجاز نمبر۔

اور ایس۔ کے حیدر کو بھی اس کا رکن منتخب کیا۔ یہ دونوں حضرات علی گڑھ یونیورسٹی سے متعلق تھے رشید صاحب کا شعبۂ اردو سے تعلق تھا اور حیدر صاحب جو پبلک سروس کمیشن کے چیرمین بھی تھے، شعبۂ معاشیات کے صدر تھے۔ ان لوگوں نے مجاز کو ریڈیو کے رسالے 'آواز' کی سب ایڈیٹری کے لیے منتخب کرلیا۔ اس رسالہ کا نام بھی مجاز ہی کا تجویز کردہ تھا اور ریڈیو کے پروگراموں کا آغاز بھی مجاز کی اس غزل سے ہوا تھا۔ جس کا مطلع ہے :۔

سارا عالم گوش برآواز ہے　　　　آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

اسی پوسٹ کے لیے 'آغا اشرف نے جو محمد حسین آزاد کے پوتے تھے درخواست کی تھی۔ ان کے لیے پھر ایک پوسٹ "سب ڈائرکٹر آف پروگرام کی نکالی گئی اور اسی پر ان کا تقرر ہوگیا۔ پطرس کے چھوٹے بھائی ذوالفقار بخاری ڈائرکٹر آف پروگرام ہوئے۔ فیلڈن کے جانے کے بعد پطرس ڈائرکٹر ہوگئے۔ اب بخاریوں کا زور بڑھ گیا اور پورے "آل انڈیا ریڈیو" پر ان کا غلبہ تھا۔ دو چار ماہ بعد مجاز کے علاوہ تمام عہدیداروں کی ترقی ہوئی۔ ذوالفقار علی اسسٹنٹ سکنڈ ڈائرکٹر کی پوسٹ پر فائز ہوگئے۔ آغا اشرف ڈائرکٹر آف پروگرام ہوگئے۔ اسی طرح اور لوگوں کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا۔ اس میں مجاز بھی شامل تھے۔ ان کی تنخواہ سو روپیہ سے ڈیڑھ سو روپیہ کردی گئی۔ دو چار ماہ بعد پھر ترقیاں ہوئیں۔ اس بار ذوالفقار بخاری اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہوگئے۔ آغا اشرف کو یہ امید تھی کہ وہ ذوالفقار بخاری کی جگہ اسسٹنٹ سکنڈ ڈائرکٹر ہوجائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آغا اشرف دہلی کے رہنے والے تھے اور محمد حسین آزاد کے پوتے ہونے کی بنا پر کافی باا ثر بھی تھے۔ انھوں نے احتجاجاً پنجابی وغیر پنجابی تعصب کو ہوا دی۔ مجاز نے آغا اشرف کے ساتھ کئے گئے سلوک کو زیادتی اور ناانصافی پر محمول کیا اور ان کا ساتھ دیا۔ مزید براں مجاز کے مزاج میں ایک خاص قسم کی ظرافت تھی، بذلہ سنجی تھی اور چست فقروں سے لگاؤ تھا اس لیے مجاز نے ان جھگڑوں میں اور چلے بازیوں میں حصہ بھی لیا۔ ان جھگڑوں نے بعد میں تلخی کا رخ لے لیا۔ غیر پنجابی گروپ نے جس میں چار آدمی پیش پیش تھے ان میں آغا اشرف اور مجاز نمایاں طور پر شامل تھے۔ بخاریوں کے خلاف ایک مہم سی شروع کردی۔ یہ لوگ تمام دلی کے اخباروں کے ایڈیٹروں سے ملتے۔ ان کے خلاف آرٹیکلس چھپواتے۔ دیوان سنگھ مفتون اس زمانے میں اخبار "ریاست" نکال رہے تھے۔ ان کے اس اخبار میں بھی مستقل بخاریوں کے خلاف آرٹیکلس نکالے گئے۔ کبھی ہندوستان میں کبھی نیشنل قوم میں خوب خوب مضامین نکلے۔ الغرض بخاریوں کے خلاف ان لوگوں نے ایک محاذ سا بنالیا۔ حالانکہ بخاریوں

کے خاص حریف آغا اشرف تھے' لیکن اس معاصرانہ چشمک اور پھر مخاصمت کا نشانہ مجاز کو بننا پڑا۔

"آغا اشرف کا تو کچھ نہ بگڑا۔ بخاری نے ان کا تنزل کر دیا۔ مجاز کو علیحدہ کر دیا گیا۔ رشید صاحب نے بخاری کو سمجھایا مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ اسی زمانے میں مجاز ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہو چکے تھے۔ وہ طلسماتی سازشی آدمی نہ تھے مگر انھیں غلط فہمی ہو چکی تھی کہ ادبی اہمیت کی بنا پر ملازمت پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ اشرف صاف نکل گئے، غریب مجاز اپنی سادہ لوحی کا شکار ہو گیا۔" [1]

علی سردار جعفری نے اس واقعہ کی وضاحت اس طرح کی ہے :-

ہنسی ہنسی میں پنجابی اور یو۔ پی والوں کی صف بندیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ حفیظ جالندھری اور مجاز میں چوٹیں چلنے لگتی ہیں۔ حفیظ نے تفریحاً کوئی نظم کہی مجاز نے اسی موڈ میں جواب دیا۔ ایک شعر جو حفیظ کے متعلق تھا اس کا سب نے لطف اٹھایا ؎

وہاں کا حسن تو سب کچھ ہے مانا مگر خود عشق تو جالندھری ہے

لیکن یہ دوستانہ چھیڑیں زیادہ دن قائم نہ رہ سکیں معاملات نہ جانے کیسے بگڑ گئے' آخر مجاز کو ریڈیو کی ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ [2]

دونوں، بخاری، پطرس اور ذوالفقار بہت تیز قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے ذرائع سے معلوم کر لیا کہ ان تمام اسٹیکس کی مہم کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔ دوسری ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ اس وقت تک کوئی بھی مستقل نہیں ہوا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر پطرس نے سب سے پہلے مجاز کو نوٹس دے دیا کہ آپ کی خدمت کی ادارے کو چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بعد آغا اشرف سے کہا گیا کہ آپ مجاز کی جگہ کام کرنا پسند کریں تو آجائیں لیکن وہ خود ڈائرکٹر آف پروگرام کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اس لئے انھوں نے اس پیش کش کو منظور نہیں کیا اور ریڈیو کی ملازمت ہی ترک کر دی۔ ان لوگوں کو نکالنے کے بعد بخاریوں نے اپنے اور تمام حریفوں کو برطرف کر دیا۔ اس سے متاثر ہو کر مجاز نے یہ مصرعہ کہا۔ ع

"گشتۂ خنجر لاہور ہوں میں" - یہاں لاہور سے مراد بخاریوں سے ہے۔ [3]

یوں تو مجاز کی ریڈیو سے برطرفی کا اصل سبب یو۔ پی اور پنجابی کی وہ نوک جھونک تھی جو ان دنوں وہاں ہوا کرتی تھی یا اس نظام حکومت کے ان ڈھکے چھپے ہتھیاروں کا جابرانہ استعمال کہہ لیجئے لیکن اس کے

---

[1] مجاز روایت کا شہید۔ (مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۵۵)۔ [2] ہم پرورش غم شام غریبان لکھنؤ۔ سردار جعفری۔ (مجاز ایک آہنگ صفحہ ۲۲۷ - ۲۲۸)۔ [3] تفصیلی اطلاعات۔ دوران گفتگو جذبی صاحب سے لیں جو ٹیپ میں محفوظ ہیں۔

باوجود خود مجاز کا بھی تھوڑا قصور تھا۔ انھوں نے کبھی بھی دوراندیشی اور مصلحت سے کام نہیں لیا۔ وہ وقت کے جذباتی تقاضے سے اپنے کو نہ بچا سکے۔ اگر وہ بخاریوں کی کھل کر مخالفت عملی طور پر نہ کرتے تو شاید ان کا یہ انجام نہ ہوتا۔ کیونکہ مجاز کی شراب نوشی اس سے پیدا ہونے والی بے اعتدالیوں کو تو پھر بھی بخاریوں اور خاص طور پر پطرس بخاری نے قابل برداشت تصور کر لیا تھا لیکن بقول جذبی صاحب ان کے مزاج میں جو سہل پسندی تھی اس سے وہ کام سے گھبراتے تھے۔ حالانکہ ان کا کام بالکل ذہنی سا تھا۔ پروگراموں کو انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنا اور ایک آدھ چھوٹا سا تمہیدیہ آرٹیکل وہ بھی پندرہ روز میں ایک بار لکھنا پڑتا تھا۔ اسے بھی وہ ذمہ داری سے پورا نہ کر پاتے تھے۔ ان کے پاس کام بہت کم تھا، اس لئے پطرس بخاری نے ان کو رات کی نیوز کے ٹرانسلیشن میں مدد کرنے کے لئے بھی کہہ دیا تھا، لیکن کبھی انھوں نے اس کام میں دل چسپی نہ لی اور نہ کبھی وقت سے پہنچے۔ رات کی ڈیوٹی کے جو اوقات مقرر تھے اُس سے پہلے ہی چل دیا کرتے تھے۔ انہیں سب بے اعتدالیوں کی وجہ سے مجاز کو ایک سال کے اندر ہی ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا اور مجاز ریڈیو اسٹیشن سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔ ”رخصت اے دلی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں“

اگر واقعات کے پیچھے آپ دور تک دیکھ سکیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بیرونی سامراج نے اپنے سرمایہ دارانہ نظام کے دفاع کے لئے جو قانون کے ہتھکنڈے بنا رکھے تھے ان کا بیجا اور جابرانہ استعمال ان کی مشینری یا انتظامیہ کرتی آئی ہے۔ جائز حقوق کے لئے جدوجہد کرنے کی آزادی سے محروم رکھنے کے یہ سب حیلے ہمیشہ پیش کئے گئے۔ اور حق و انصاف کی آواز اُٹھانے والوں کا گلا ہمیشہ گھونٹ دیا گیا۔ مجاز کا بھی یہی حشر ہوا۔

مجاز اس ملازمت کے دوران ایک مرتبہ معطل بھی کئے گئے اس کا قصہ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے دورانِ جنون خود بیان کیا۔ اُن کی اس معطلی کی وجہ غالباً اُن کی کثرت شراب نوشی تھی۔ اس کی کوئی صحیح وجہ دریافت نہ ہو سکی لیکن دو ماہ بعد اُن کی ملازمت بحال کر دی گئی تھی۔ اس عرصہ میں ان پر سات سو روپیہ قرض ہو گیا تھا۔

گو کہ مجاز کا قیام دلّی میں ایک سال رہا لیکن یہ قلیل عرصہ ان کے لئے بہت اہم رہا۔ اس وقت تک مجاز ”شاعرِ محفلِ وفا“ اور ”مطربِ بزمِ دلبراں“ تھا۔ دلّی کا شرابی نہ تھا۔[1] اس دوران دو باتیں ایسی

---

[1] مجاز کچھ باتیں کچھ یادیں۔ فرحت اللہ انصاری۔ قومی آواز۔ مجاز نمبر ۵۵۔

ہوئیں جن کو مجاز کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دلی میں ایک بہت بڑا سیاسی و ادبی حلقہ اُن کو ملا جو متنوع اور جدت پسند تھا۔ نئی شاعری کا دلدادہ تھا اور سیاسی طور پر وقت کے تقاضے پورا کرنا چاہتا تھا۔ ان میں کچھ عملی قسم کے سیاست داں اور دانشور بھی شامل تھے۔ یہ ملک کے خاص دھارے کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتے تھے۔ جدید میلانات کے دل دادہ اور ترقی پسند رجحانات کے حامل تھے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ یہ طبقہ پرانی چیزوں کو چھوڑ کر نئی چیزوں کو اپنانا چاہتا تھا خواہ وہ شراب جیسی مضرت رساں شے ہی کیوں نہ ہو۔ ان رجحانات کے تحت دلی میں تقریباً ہر ادیب و شاعر شراب پینا اور پلانا اپنے فن اور زندگی کا جزو سمجھنے لگا تھا۔ فارغ البالی اور روپے کی فراوانی کے ساتھ ایسی صحبتوں نے مجاز کو اس میدان میں اپنے دوستوں اور ہمعصروں سے کہیں آگے پہونچا دیا۔ وہ اس ماحول میں ایسے گھرے کہ علی گڑھ کے دیرینہ دوستوں سے بھی بے نیاز ہو کر رہ گئے۔ فرحت اللہ انصاری جو علی گڈھ میں ان دنوں زیر تعلیم تھے پابندی کے ساتھ سنیچر کی شام میں دلی جایا کرتے تھے اور وہاں مجاز اور جذبی وغیرہ کے ساتھ محفلیں جماتے تھے۔

”سنیچر کی رات کو خاص اہتمام ہوتا تھا۔ جب مجاز نے ریڈیو میں درخواست دی تھی اسی وقت اُس نے وعدہ کرا لیا تھا کہ نوکری مل گئی تو ہم لوگ سنیچر کو علی گڈھ سے دلی پہونچا کریں گے۔ میں کئی مہینے تک پابندی کے ساتھ پہنچتا رہا مگر جیسے جیسے دن گذرتے گئے ریڈیو کے احباب کا تسلط بڑھتا گیا اور سنیچر کی اہمیت گھٹتی گئی۔ یہ حضرات بڑے ہنرمند تھے۔ دن بھر مجاز کی جڑیں کاٹتے تھے اور رات بھر شرابیں لنڈھاتے تھے۔ مجاز تھا کہ نئے اور پرانے دوستوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا تھا۔“[1]

دھیرے دھیرے یہ محفلیں اُجڑنے لگیں اور مجاز صرف دلی کے دوستوں میں گھر کر رہ گئے۔

دلی میں ریڈیو کی ملازمت کے دوران مجاز کی اور دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی اُس وقت کے سیاسی حلقے میں اور شہر کے معزز اور دانشور گھروں میں بڑی قدر تھی۔ نیا نیا ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تھا۔ یہ طبقہ ریڈیو آرٹسٹوں سے متعارف ہونا اپنی شان سمجھتا تھا۔ ان فن کاروں کی اونچے اونچے گھرانوں میں اکثر و بیشتر دعوتیں ہوتیں، تعارف ہوتا، جود و کرم کا اظہار ہوتا۔ ذوق مے و مینا کی تسکین کا سامان ہوتا۔ ایسی ہی ایک محفل میں مجاز ایک زہرہ جبین کی نظر التفات کا شکار ہو گئے۔

---

[1] قومی آواز ۱۹ دسمبر ۵۵۔ مجاز شاعر محفل وخمار مطرب بزم دلبراں (فرحت اللہ انصاری)

"دلی کے ایک اعلیٰ خاندان کے فرد جو سیاسی و انقلابی سرگرمیوں میں اہم حیثیت رکھتے تھے اور ادب نواز بھی تھے۔ ان کے یہاں اکثر و بیشتر ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ مجاز بھی ان میں موجود رہا کرتے اور اُن کا تعلق بھی اسی سلسلہ سے بہت گہرا ہو گیا تھا۔

"دہلی میں ڈاکٹر انصاری کا گھر قومی رہنماؤں کا مہمان خانہ ہے۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو، سروجنی نائیڈو سب دریا گنج میں انھیں کے گھر قیام کرتے ہیں۔ مجاز اس گھر کا دوست اور محبوب شاعر ہے۔ شوکت اللہ انصاری اور اُن کی خوبصورت بیوی زہرہ میزبانی کے فرائض انجام دیتی ہیں اور مجاز اپنی نظموں سے اُن کی خاطر کرتا ہے۔ مسز نائیڈو خاص طور پر مجاز پر مہربان ہیں"۔ [1]

وہ سیاسی رہنما مجاز کی شاعری کو بہت سراہتے تھے کیونکہ اُن کے خیال میں مجاز کی شاعری وقت کے تقاضوں کو پورا کر رہی تھی۔ مجاز ان کے یہاں ادبی نشستوں کے علاوہ بھی آنے جانے لگے۔ اسی زمانے میں مجاز کو ایک خاتون سے وابستگی کا احساس ہوا جس کا ذکر حمیدہ سالم نے اس طرح کیا ہے:۔

"دلی کے قیام کے سلسلہ میں جگن بھیا کے دل نے ایسی چوٹ کھائی جس کا زخم اُن کی زندگی میں کبھی نہ بھر سکا۔ مریم اور بھائے کا ذکر کیا اس پر مزید چوٹیں لگتی رہیں اور دھیرے دھیرے ان کا پورا وجود ایک ناسور بن کر رہ گیا۔ ان کے اپنے لئے، گھر والوں کے لئے اور سماج کے لئے انھوں نے محبت کی۔ ایسی گہری، ایسی پائیدار کہ آخری لمحے تک اُن کے دم کے ساتھ رہی۔ لیکن قسمت دیکھو، ہاتھ بھی بڑھایا تو شجرِ ممنوعہ کی طرف۔ دلی کے چوٹی کے خاندان کی اکلوتی بیٹی، بے چنچل، البیلی اور خوبصورت۔ لاڈ پیار میں پلی ہوئی، عیش و عشرت کی عادی۔ ایک عدد بھاری بھرکم شوہر کی ملکیت یا مالک، جو کچھ بھی سمجھیے۔ یہ بیل منڈھے چڑھتی تو کیونکر؟ لیکن شاعر قدموں پر موتی بکھیرتا رہا، سر پر پھولوں کی بارش کرتا رہا۔ اور بدلے میں چند مسکراہٹوں کا خواہش مند ہو تو سودا مہنگا تو نہیں۔ شاعر بھی اپنی جگہ مطمئن تھا کہ ؎

میرا نغمہ باعثِ دلداریِ خوباں تو ہے　　میرا نالہ خیر　وجہِ نشاطِ جاں تو ہے

لیکن بُرا ہو اس سماج کا۔ اس کی ٹیڑھی ترچھی سمت نگاہوں کا، اس کی انگشت نمائی کا۔ ہر کھیل بگڑ کر رہ جاتا ہے۔ انسان کی آہ کا ذکر کیا، شاعر کی واہ بھی خطرے میں پڑ گئی۔ غریب انسان کا

---

[1] لے ہم پر ہے ختم شام غریبان لکھنؤ ـــ سردار جعفری۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۲۔

کہنا کیا۔ گھٹ کر رہ گیا۔ بے چارے شاعر کا دل ٹوٹ گیا۔" [1]

حمیدہ سالم کا بہن کی حیثیت سے یہ تاثر کتنا ہی جذباتی کیوں نہ ہو، لیکن اس کے باوجود مجاز پر اس واقعہ کا اثر بہت گہرا ہوا اور بیچارے شاعر کا دل ٹوٹ کر رہ گیا۔ ؎

یاس کا دھواں اُٹھا ہر نوائے خستہ سے آہ کی صدا نکلی ہر ربطِ شکستہ سے

دہلی کے اس معاشقے کے متعلق رضا صاحب انصاری سے دورانِ گفتگو چند باتیں معلوم ہوئیں کہ ان سیاسی رہنما کو ادب سے ایک خاص شغف و اُنس تھا۔ اُن کے یہاں اکثر ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ مجاز اُن دنوں بیحد مقبول شاعر تھے اس لیے وہ بھی اُن کی محفلوں میں ضرور مدعو کئے جاتے تھے۔ اُن کے خاندان کی ایک لڑکی جو بے حد خوبصورت تھی اور ادبی ذوق بھی رکھتی تھی، مجاز کی شاعری سے کافی متاثر تھی اور مجاز اُس کے حُسن سے متاثر ہی نہیں بلکہ مرعوب بھی تھے، لہٰذا چار و ناچار آمد و رفت کا سلسلہ بڑھنے لگا۔ وہ جب بھی کوئی نئی غزل یا نظم کہتے تو وہاں سُنانے کے لئے ضرور ساتھ لے جاتے اور اُس کی داد بھی حسبِ خواہش اُنھیں مل جایا کرتی تھی۔

اسی طرح ایک دن وہاں سے بُلاوا آیا جہاں سے بلائے جانے کے لئے مجاز بھی بیتاب رہا کرتا تھا مگر بے تاب ہی رہا، کبھی گیا نہیں۔ مجاز نے اس حسین ترین موقعہ کے لئے وہ حسین ترین غزل کہی جس کا مطلع ہے:

سارا عالم گوشں بر آواز ہے آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

دو تین شعروں تک بات ڈھکی چھپی رہی مگر جب مجاز نے یہ شعر پڑھا: ؎

آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم میری مے خواری ابھی تک راز ہے

تو ایک طرف کسی کی آنکھیں جھک گئیں اور دوسری طرف کسی کی آواز میں تھرتھری سی آگئی اور ساری محفل اس شکستِ جام پر جھوم اٹھی۔ [2]

اُن ملاقاتوں کے سلسلے میں مجاز اور اُس زہرہ جبین کے درمیان ایک اُنسیت اور لگاؤ کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی، لیکن بات ابھی اس سے آگے نہ بڑھنے پائی تھی کہ ان سیاسی رہنما کا انتقال ہو گیا اور اُن کے بھانجے جو اُن دنوں بغرض تعلیم لندن میں تھے اس خبر کو سُن کر لوٹ آئے۔ اور چند دنوں بعد اس زہرہ جبین کی شادی اُن سے ہو گئی۔ وہ بھی اپنے بزرگ کے نقشِ قدم پر چلے۔

---

[1] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۲۰-۱۲۱ [2] مجاز کچھ یادیں کچھ باتیں۔ فرحت اللہ انصاری۔

ان کو بھی سیاست اور ادب سے دلچسپی تھی۔ ملکی حالات تحریکِ آزادی سے متلاطم تھے۔ ایسے میں ان معاملات میں ان کی مصروفیتیں اتنی بڑھ گئیں کہ شادی کے بعد غالباً وہ التفات نہ دے سکے ہوں گے جس کی خواہش ہر شادی شدہ عورت کے دل میں ہوتی ہے۔ ان کی عدیم الفرصتی اور مجاز کی آمدورفت کی کثرت نے دونوں کے درمیان اس لگاؤ کو جس کی بنیاد شادی سے قبل پڑ چکی تھی اور مستحکم بنا دیا۔ ان لوگوں کا پورا خاندان اعلیٰ اقدار کا حامل تھا اور یہ لوگ بھلے اور شریف لوگ تھے لہٰذا ان ملاقاتوں پر ان کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا، نہ ہی ان لوگوں کو اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ ملاقاتیں اُن کے لئے باعثِ رُسوائی و ذلت بھی ہو سکتی ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو کی سروس سے برطرفی کے بعد مجاز کا زیادہ تر وقت بقولِ جذبی صاحب انھیں زہرہ جبین کے گھر پر گزرتا۔ جذبی صاحب کا جو ان دنوں دلّی میں مقیم تھے کہنا ہے کہ انھوں نے اُن سے کئی بار منع بھی کیا۔ کیوں وہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔ میرے یہاں آ کر رہو' لیکن مجاز نے اُس حُسن کی جنّت جہاں اُن کو ان بیکاری کے دنوں میں شباب و شراب دونوں کا قرب حاصل تھا چھوڑ کر جانا گوارا نہ کیا۔" انھیں دنوں کنور اشرف جو ان کے دور کے رشتہ دار بھی تھے' اُن کے یہاں آئے ہوئے تھے' انھوں نے مجاز کی یہ ساری مشغولیات، حرکات و سکنات دیکھیں اور جب وہ لکھنؤ گئے تو انھوں نے ترقی پسندوں کے حلقے میں اُن کا ذکر کیا۔ لوگوں نے مجاز کے متعلق دریافت کیا تو کنور اشرف نے جواب دیا کہ مجاز کا کیا کہنا ہے۔ وہ تو وہیں دلّی میں رہتے ہیں، مے و مینا سے شغل اور زہرہ جبینوں سے عشق کرتے ہیں۔[1] چند دنوں بعد سبطِ حسن لکھنؤ سے دلّی آئے وہ بھی ان سیاسی رہنما کے قریبی دوستوں میں تھے انھوں نے اُن سے اس بات کا ذکر کیا کہ تمام لکھنؤ میں یہ بات مشہور ہو چلی ہے کہ مجاز تمھارے یہاں پڑے رہتے ہیں اور عشق کرتے ہیں۔ اُن کو یہ بات بُری لگی اور انھوں نے اندیشۂ رسوائی سے مجاز سے یہ بات کہہ دیا کہ تم میرے یہاں آنے جانے میں احتیاط برتا کرو کیونکہ دلّی اور لکھنؤ میں بڑی غلط غلط باتیں اُڑ رہی ہیں۔

زمانے نے ہمیشہ ہر معاملے میں بدترین رُخ یا پہلو ہی ہر چیز کا دیکھا ہے۔ ممکن ہے مجاز کے دل و دماغ میں کسی غلط لگاؤ یا اُس سے فائدہ اُٹھانے کا خیال بھی نہ رہا ہو۔ اور دوسری طرف بھی ممکن ہے فن کی عزت ہی ملحوظِ خاطر رہی ہو اور خاص طور سے ان حالات میں جب کہ ایک فن کار زمانے

---

[1] بقولِ جذبی صاحب۔ دورانِ گفتگو انھوں نے یہ واقعات بتائے جو ٹیپ ریکارڈ کی ہوئی ہیں۔

کے ہاتھوں تنگ و پریشان رہا ہو۔ اس کو ایک سہارے اور دل جوئی کی ضرورت رہی ہو اور وہ اگر ان کشادہ دل و دماغ لوگوں کے درمیان میسّر آ گئی ہو۔ خیر جو کچھ بھی رہا ہو۔ مجاز جو بے حد حساس دل و دماغ کے مالک تھے انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اُنھوں نے وہاں جانا ترک کر دیا جس کو افسانوی رنگ میں فرحت اللہ صاحب فرنگی محلی نے بیان کیا ہے:۔

''یا تو یہ عالم تھا کہ مجاز کے بغیر چاندنی رات بھی اندھیری رات رہتی تھی، جب تک مجاز کے قدم ایوانِ عشرت میں نہیں پہونچتے تھے۔ وہاں نیند آتی ہی نہیں تھی۔ ساری ساری رات اُس کے انتظار میں آنکھوں میں کٹ جاتی تھی، اُس کے شعر گنگنائے جاتے تھے۔ اُس کی دُھن اُتاری جاتی تھی۔ اُس کے شانے پر سر رکھ رکھ دیا جاتا تھا۔ یا مجاز کی دور کی غزل خوانی میں بھی رسوائیاں جھلکنے لگیں اور اُسے آوارہ اور مجنوں کے خطابات ملنے لگے، نصیحتیں کی جانے لگیں۔ آخر دربان کو حکم ہوا کہ مجاز پھاٹک میں بھی قدم نہ رکھنے پائے۔'' [1]

فرحت اللہ انصاری جو مجاز کے بہت گہرے دوستوں میں تھے۔ ممکن ہے انھوں نے اس واقعہ میں رنگ آمیزی کی ہو لیکن اس کے بعد مجاز پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ کچھ تو احساسِ ندامت کہ ان کی وجہ سے ایک باعزت گھرانے کی ایک شائستہ عورت بدنام ہوئی اور کچھ ان کے اپنے اس لگاؤ اور اُنس جس میں ہوس کا شائبہ بھی نہ تھا۔ غلط پہلو سے دیکھے جانے کا صدمہ یا اس کو بے لوث محبت کی ناکامی سے پیدا شدہ مایوسیاں اور غم کہہ لیجیے:۔

''اب تک دل پر جو زخم آئے تھے وہ ذرا ہلکے تھے مگر دلّی میں ایک زخم ایسا کاری لگا کہ اس کی چوٹ ساری عمر نہ گئی۔ شروع میں دل نوازی اور لطف و کرم سب کچھ تھا، مگر مجاز کچھ اس سے زیادہ چاہتے تھے۔ آخر مایوسی ہوئی۔'' [2]

مجاز کا یہ عشق خود ساختہ و پرداختہ ہی کیوں نہ رہا ہو لیکن زمانے کے اِس سلوک نے اُس کے دل میں ایک کسک اور چوٹ ضرور پیدا کر دی جس کی بدولت بہت سی اچھی اچھی نظمیں تخلیق ہوئیں جن میں دلی جذبات و کیفیات کا بڑا موثر اظہار ہوا ہے۔ ''آوارہ'' ایک لافانی نظم ہے۔ یہ اُسی خاص دور کی یادگار اور آئینہ دار ہے۔

---

[1] مجاز۔ شاعرِ محفلِ وفا، مطربِ بزمِ دلبراں۔ فرحت اللہ انصاری۔ قومی آواز۔ ۷ دسمبر ۵۵ء

[2] مجاز۔ رومانیت کا شہید۔ آل احمد سرور۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۵۵۹۔

رضیہ سجاد ظہیر نے دورانِ گفتگو مجاز کے دہلی کے معاشقہ کو بالکل مختلف انداز میں بیان کیا ہے کہ لوگوں نے اپنے شاعرانہ تخیل سے کام لے کر مجاز اور اُن زہرہ جبین کی ان ملاقاتوں کو رومانی رنگ دے دیا حالانکہ یہ اُن کے خیال میں مجاز کا اُن زہرہ جبین سے اس قسم کا عشق نہیں تھا جس میں بوالہوسی کا شائبہ بھی رہا ہو۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ مجاز اُن زہرہ جبین کے حسن کو سراہتے تھے اور وہ اُن کے فن شاعری کو، لیکن ان ملاقاتوں اور لگاؤ کو عشق و محبت نہیں کہا جا سکتا۔ میں رضیہ صاحبہ کی اس رائے سے کچھ حد تک متفق ضرور ہوں کہ اِس عشق یا لگاؤ میں بوالہوسی و لذت پرستی ہرگز نہ رہی ہوگی لیکن اتنی خواہش ضرور رہی ہوگی: ۱؎

میرا نغمہ باعثِ دلداریِ خوباں تو ہے   میرا نغمہ خیر سے وجہِ نشاطِ جاں تو ہے

سردار جعفری نے بھی اِس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

"اس زمانے میں مجاز کی ذاتی زندگی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ واقعہ ہوا۔ اس نے عمر بھر میں صرف ایک لڑکی سے محبت کی اور وہ بھی شادی شدہ تھی اس لئے مجاز کی محبت خاموش تھی لیکن شعروں میں جھلکی پڑتی تھی۔ وہ ہوس کی منزل تک کبھی نہ جا سکا، لیکن پھر بھی ایک دن اس گھر کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔" ۲؎

مجاز کے دہلی کے قیام کے دوران ایک اور واقعہ مشہور ہے کہ وہ جس فلیٹ میں رہتے تھے اُس کے نیچے والے حصے میں ایک نرس "نورا سنگھ" رہتی تھی۔ اُس کے ساتھ اُس کی ایک بہن رہتی تھی۔ اس فلیٹ میں مجاز، جذبی اور رشید نعمانی ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ جذبی صاحب کا کہنا ہے کہ ایک روز نیچے والے فلیٹ سے جس میں نورا رہتی تھی زور زور سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ دوسرے روز شام کو میں (جذبی) ٹہلنے کی غرض سے نیچے جا رہا تھا کہ نورا مجھے اپنے فلیٹ میں کھڑی نظر آئی۔ میں نے اُس سے گذشتہ شب رونے کی وجہ دریافت کی۔ پتہ چلا کہ اس کے پیر میں موچ آنے سے پیروں میں سخت تکلیف تھی۔ اتفاق سے مجاز اُس دن علی گڑھ گئے ہوئے تھے۔ اس طرح بقول جذبی صاحب ان کا تعارف نورا سے ہو گیا۔ دوسرے دن جذبی نے رشید نعمانی سے نورا کا تذکرہ کیا۔ رشید صاحب کا اشتیاق دیکھ کر جذبی صاحب نے اُن کی ملاقات نورا سے کرا دی اور ساتھ ہی اس بات کی تاکید بھی کر دی کہ اس واقعہ کی خبر مجاز کو نہ ہونے پائے۔ ورنہ اس بات کا خدشہ تھا کہ رشید صاحب کا پتہ درمیان سے کٹ جاتا۔ لیکن جیسے ہی مجاز

۱؎ رضیہ صاحبہ سے دورانِ گفتگو باتیں معلوم ہوئیں۔ ۲؎ ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ۔ سردار جعفری۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۵۸

علی گڈھ سے لوٹ کر آئے، رشید صاحب نے فوراً نورا کی ملاقات کا تذکرہ مجاز سے کر دیا۔ مجاز نے بھی ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا اور رشید کے توسط سے مجاز کی ملاقات نورا سے ہو گئی۔ چونکہ رشید صاحب ایک روز بغیر اطلاع و خبر کے بے وقت نورا کے کمرے میں پہنچ گئے اور نورا نے ناراض ہو کر اپنے تعلقات رشید صاحب سے ختم کر لئے۔ اس طرح جذبی صاحب کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ بقول جذبی صاحب کے دونوں نرسیں انتہائی معمولی شکل و صورت کی تھیں لیکن مجاز کی عشق پرور طبیعت نے انھیں وقتی طور پر مائل کر دیا۔ وہ وقت بے وقت ان کے فلیٹ میں پہنچ جاتے اور وہیں بیٹھ کر ان دونوں کی ناز و ادا مختلف انداز میں دیکھا کرتے جس میں کبھی امید، کبھی مایوسی، کبھی اشتیاق اور کبھی بیزاری جھلکتی تھی۔ مجاز نے اس کو 'آئی ورک' کا نام دے رکھا تھا۔[1]

دہلی سے ملازمت کی علیحدگی کے بعد مجاز کچھ دنوں وہیں مقیم رہے لیکن انھیں کوئی مناسب ذریعہ معاش نہ مل سکا مجبوراً واپس لکھنؤ آ گئے۔ ان دنوں ان کے والدین نیو حیدر آباد کالونی میں مقیم تھے۔ مجاز ان کے ساتھ رہنے لگے۔ اس زمانہ میں لکھنؤ ترقی پسند ادب کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا تھا۔ سبط حسن، سردار جعفری، حیات اللہ انصاری، معین احسن جذبی، سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم، احمد علی، احتشام حسین، ڈاکٹر رشید جہاں سب ہی لکھنؤ میں یکجا تھے۔ سبط حسن انجمن ترقی اردو ہند کی صوبائی شاخ کے آرگنائزر تھے۔ علی سردار جعفری لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ حیات اللہ انصاری ہفتہ وار "ہندوستان" نکال رہے تھے۔ سجاد ظہیر بھی الہ آباد سے لکھنؤ آ گئے تھے۔ ڈاکٹر علیم، احمد علی، سید احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ لال باغ کے ایک فلیٹ میں ان سبھی نے مل کر ایک دفتر قائم کیا اور "پرچم" کا اجرا کیا، جس کے نگراں سید سبط حسن اور معاونین میں مجاز، سردار جعفری اور جذبی شامل تھے۔ اسی دوران کانگریسی وزارت قائم ہو چکی تھی۔ اس نے پرچم کے پہلے پرچے کو خرید لیا اور "آزادی" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی گئی جس میں سبھی ترقی پسندوں کی نظمیں شائع ہوئیں اور مارچ ۱۹۳۹ء میں سبط حسن، جعفری اور مجاز نے مل کر نیا ادب نکالا جو بعد میں جوش کے لکھنؤ آنے پر ان کے رسالہ "کلیم" میں ضم ہو گیا۔ یہی دور تھا جب سکندر علی وجد بھی سول سروس کی ٹریننگ کے لئے لکھنؤ آئے۔ وہ بھی جذباتی طور پر اس گروپ سے وابستہ تھے۔ مجاز اس حلقے میں بے حد مقبول تھے۔ پھر اس دور کے ان نوعمر ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کو بے انتہا شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔

---

[1] یہ معلومات جذبی صاحب سے دوران انٹرویو فراہم ہوئیں جو ٹیپ ریکارڈ ہیں۔

لکھنؤ نے مجاز کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی دل جوئی کی۔ بڑی چارہ سازی کی۔ جذبی، سردار اور سبط حسن سبھی کو بلا لیا۔ جاں نثار آتے ہی رہتے تھے۔ مخدوم تک حیدر آباد سے پہونچنے لگے۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم، احمد علی، رشید جہاں، حیات اللہ انصاری یہاں موجود ہی تھے اور بھی صف اول کے لکھنے والے لکھنؤ ہی پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ یہاں کا سیاسی ماحول بھی سازگار تھا۔ ادبی ماحول بھی سازگار تھا۔[1]

اس زمانے میں مجاز اور ان کے ساتھیوں کی سرگرمیوں کے مرکز شہر میں کہاں کہاں تھے۔ اس کا اندازہ علی سردار جعفری کے مضمون "راج سنگھاسن ڈانواڈول" سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

"ایک سرے پر فرنگی محل تھا جس کے روشن خیال اور خوش اخلاق علماء کے ساتھ نہایت ادب سے انتہائی بے باک بحثیں کی جاتی تھیں۔ دوسرے سرے پر ریڈیو کی مشہور گانے والی "گوہر سلطان" کا وہ گھر تھا جسے ہم "خرابات" کہتے تھے۔ ان دونوں سروں کے درمیان "نیشنل ہیرالڈ" "پائنیر" "ہندوستان" "دیلی" اور "نیا ادب" کے دفاتر، یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ حبیب اللہ صاحب کا گھر، پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی کا کتب خانہ، وائی۔ ڈبلو۔ سی۔ اے کا خوبصورت ہال جہاں مایا سرکار شمع محفل ہوا کرتی تھیں، یونیورسٹی کی لڑکیوں کا کیلاش ہاسٹل جہاں ہر سال ہولی کھیلنے پر جرمانہ ہوتا تھا اور نہ جانے کتنے کافی ہاؤس، رستوران اور مے خانے تھے اور یہ ساری گذر گاہیں کوچہ یار سے ہوتی ہوئی زندانوں کی طرف جاتی تھیں جس کی دیواروں کے پیچھے آزادی کی خوبصورت صبح کا اُجالا دُھندلا دُھندلا نظر آ رہا تھا اور اُس کی دل فریبی ہماری نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھی"[2] امید تھی کہ اس ماحول میں مجاز دلی کو بھول جائیں گے اور سنبھل جائیں گے لیکن یہاں بھی کئی واقعات ایسے پیش آئے جنہوں نے مجاز کی زندگی کے بکھرے ہوئے تاروں کو جُڑنے نہ دیا۔ اس ترقی پسند گروپ کے ادیبوں کے چار مشغلے تھے۔ تعلیم، ادب، سیاست اور آوارہ گردی۔ اور سبھی کسی حد تک جام و مینا سے بھی شغل رکھتے تھے۔ ساتھ ہی ایک دل نواز ینگ لیڈی کے التفات نے اس گروپ کی رنگینیوں اور دل چسپیوں کو اور بھی دوبالا کر دیا۔

اسی زمانے میں ایک خاص رات میں جب چاندنی بھی تھی اور شراب بھی اور ایک مطرب جاں نواز بھی جسے ینگ لیڈی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مجاز کی وہ نظم ہوئی جس میں اس نے کہا ہے۔

---

[1] "شاعر من دلدار مطرب بزم دلبراں" - فرحت اللہ انصاری۔ قومی آواز۔ مجاز نمبر

[2] "لکھنؤ کی پانچ راتیں" لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ سردار جعفری۔

۶۔ شیراز بن گیا ہے شبستانِ لکھنؤ

رضا انصاری صاحب نے دورانِ گفتگو بتایا کہ "ینگ لیڈی اصل میں گوہر سلطان ریڈیو آرٹسٹ تھیں جو اس گروپ میں بے حد مقبول تھیں۔

علی سردار جعفری نے اس زمانے کی بہت سی یادیں قلم بند کی ہیں۔ اکثر میں ان اصحابِ خاص کی بے کاری اور بے روزگاری کا تذکرہ بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے:

"۱۹۳۹ء کی گرمیاں تھیں، شام ہو رہی تھی۔ ہم نے دن بھر کھانا نہیں کھایا تھا۔ سگریٹ بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ہمارا نوکر محمد جو ہمارے ساتھ فاقہ کشی کا عادی ہو چکا تھا آج وہ بھی کوئی انتظام نہیں کر سکا تھا، وہ عام طور سے ہماری غیر موجودگی میں 'نیا ادب' کے پرانے پرچے نہ جانے کہاں اور کیسے بیچ آتا تھا اور کھانا پکا لیتا تھا۔ اگر غلطی سے کوئی شامت کا مارا سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی چکر لگا لیتا تو اس کی خیر نہیں تھی۔ محمد اس کو پرانے پرچے تھما کر دو تین روپئے ضرور وصول کر لیتا تھا۔ لیکن آج اتفاق سے سی۔ آئی۔ ڈی والے بھی ہمیں بھول گئے تھے۔ مجاز کے گھر کھانا مل سکتا تھا لیکن وہاں جانا اس لئے خطرے سے خالی نہیں تھا کہ مجاز ایک ہفتہ سے گھر سے غائب تھے۔ ان دنوں کا حساب دینے کو بالکل تیار نہیں تھے۔" [۱]

اس سلسلے میں ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ نیا ادب کا خریدار بنانے کے لئے دوستوں کی فہرست کے ساتھ تینوں آدمی نکلے اور سب سے پہلے ایک پولیس کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے یہاں پہونچے۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کے چھوٹے بھائی نے خاطر مدارات کی۔ ان لوگوں نے نیا ادب کا تازہ شمارہ پیش کیا۔ اُس نے بڑے تپاک سے لے لیا اور دس کا نوٹ دیا لیکن اِن لوگوں کے پاس باقی پیسوں کی واپسی کے لئے پیسے نہیں تھے۔ انھوں نے دس کی جگہ پانچ کا نوٹ دیا۔ ایک روپیہ واپس کرنا تھا لیکن وہ بھی کسی کے پاس نہیں نکلا۔ بالآخر پانچ کا نوٹ بھی واپس لے لیا اور دوسرے دن ملازم کے ہاتھ روپیہ بھجوانے کا وعدہ کر لیا اور بڑی حیرت سے بولے۔ "آپ تینوں آدمیوں میں سے کسی کے پاس ایک روپیہ بھی نہیں ہے"؟ [۲]

شام ڈھل کر رات ہو چکی تھی اور فضا میں رات کی رانی کی خوشبو پھیل گئی تھی۔ بزرگ

---

[۱] لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ سردار جعفری۔ (دوسری رات)

[۲] لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ سردار جعفری (دوسری رات)

سنسان تھی۔ میں اور سبطِ حسن دونوں خاموش تھے اور مجاز زیرِ لب گنگنا رہا تھا: ؎

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے میخانے میں چل　　پھر کسی شہنازِ لالہ رُخ کے کاشانے میں چل

یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل

سبطِ حسن نے مجاز کو دو تین بار کنکھیوں سے دیکھا اور پھر جل کر کہا۔ "ویرانہ دل میں ہوتا ہے باہر نہیں ہوتا۔" [۱]

ایک اور واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ مجاز، سبطِ حسن اور سردار جعفری نے مل کر ایک کتا پال رکھا تھا اور انگریزوں کو چڑھانے کی غرض سے اس کا نام نلسن رکھا تھا اور آخر حضرت گنج میں نشے میں دھت ایک انگریز سے ان کی ہاتھا پائی ہو گئی اور مجاز نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی نظم "راج سنگھاسن ڈانواں ڈول" کے کچھ اشعار کہے۔

دوسری عالم گیر جنگ کے آغاز کے بعد دھیرے دھیرے اس حلقے کے لوگ منتشر ہو گئے۔ اور مجاز کو پھر تنہائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی زمانے میں (۱۹۴۰ء) مجاز پر دیوانگی کا پہلا دورہ پڑا۔ حمیدہ سالم نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"قریب سے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کا پورا وجود سُلگ کر رہ گیا اور سُلگتے سُلگتے ۱۹۴۰ء میں یہ آتش فشاں پھوٹ ہی نکلا" نروس بریک ڈاون" کا یہ حملہ تھا۔" [۲]

اس نروس بریک ڈاون کا سبب عموماً دہلی کے معاشقے کی ناکامی بتائی جاتی ہے لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ کچھ تو ان حالات کے تحت غیر متوقع سلوک کا شاک اور رنج جسے عُرفِ عام میں عشق کی ناکامی کہا گیا، دوسرے ساتھ ہی یہ احساس کہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی جو شادی شدہ بھی تھی ان کی وجہ سے بدنام ہوئی۔ مزید براں اس نئے ادب کے حلقے اور رینگ لیڈی کے سلسلے سے ہوئی لغزشوں کا بھی ہاتھ تھا۔ رضا صاحب نے بھی اس تلخ حقیقت کا اظہار کیا ہے اور فرحت اللہ صاحب نے مبہم انداز میں اس طرف شکایتاً اشارہ کیا ہے۔

"ان رفیقانِ کار کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ آگے نکل جانا تو جانتے تھے مگر ساتھیوں کو ساتھ لے کر آگے چلنا نہیں جانتے تھے۔ مجاز زبان پر غالب کا شکوہ" کوئی چارہ ساز ہوتا۔ کوئی غم گسار ہوتا" نہیں لایا مگر اس کی خاموشی کچھ ایسی ہی فریاد کرتی رہی۔ ع۔

---

[۱] لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ سردار جعفری (دوسری رات)　[۲] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۹۲

"یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح"۔ ادبستانوں میں نصیحت کہ غزل خوانی چھوڑ دو شبستانوں میں یہ انتباہ کہ مجاز سے ہوشیار رہو اور تنہائیوں میں یہ مشورہ کہ "ہٹاؤ بھی اس خبط کو۔ اور جب اس خبط کو ہٹانے کی کوشش میں اس سے لغزش ہو گئی تو چٹکیاں لینا اور طعنے دینا۔ آخر اس کا دماغ خراب ہو گیا۔[1]

مجاز چونکہ حساس طبیعت کے مالک تھے اس لئے اپنی وجہ سے نہ دوسرے کی بے عزتی و رسوائی گوارا تھی، نہ ہی اپنی عزت و ناموس پر آتی ہوئی آنچ کو برداشت کر لینے کی ان میں تاب تھی۔ پہلی بار جب ان کی منظورِ نظر کے شوہر نے ان کے اس ربط ضبط پر پابندی لگائی تو ان کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا۔ دوسری بار جب لکھنؤ میں ینگ لیڈی کے سلسلے میں ان سے جو لغزشیں ہوئیں اسے لوگوں نے اور خاص طور پر ان کے رفیقِ خاص سبط حسن صاحب نے جنھوں نے پہلے واقعے میں بھی ان کو بدنام کیا تھا، اس بار لعن طعن کا نشانہ بنایا اور مجاز انھیں برداشت نہ کر سکے اور ان کا ذہن کچھ دنوں کے لئے ماؤف ہو کر رہ گیا۔

"کہتے ہیں کہ دماغ کی خرابی کے زمانے میں وہ ینگ لیڈی۔ ینگ لیڈی" کہا کرتا تھا چنانچہ نہ وہ مجاز کو دیکھنے گئیں نہ کوئی ایسا شخص جانے دیا گیا جس سے ینگ لیڈی کے خیال میں ہیجان بڑھتا۔ مگر جب مجاز اچھا ہو گیا تو ہم سب نے دیکھا کہ وہی حضرتِ ناصح ینگ لیڈی کے لئے دیوانے ہو گئے، نہ شبستان نہ ادبستان۔ ہر ایک نے اپنا اپنا جہانستان الگ بنا لیا۔ مجاز غریب پھر اکیلا رہ گیا۔"[2]

اپنے ذہنی انتشار کو مٹانے کے لئے دن دن بھر اپنی بہن حمیدہ سالم سے اخبار یا شیلی اور کیٹس کے مجموعے سنتے اور یہ خبط الگ سوار تھا کہ "فلاں فلاں مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور رقیبِ روسیاہ زہر دینے کی فکر میں ہے۔"

"ایسا لگتا کہ جیسے اندر شعلے اٹھ رہے ہوں جنھیں باتوں کے چھینٹوں سے بجھانے کی کوشش ہو۔"

علاوہ اپنے گھر والوں کے اور کسی کی قربت پسند نہ کرتے تھے۔ علاج سے فائدہ ہوا اور بڑی بہن کی شفقت و محبت ساتھ ہی نینی تال کی صحت افزا فضا نے رنگ دکھلایا اور وہ صحت یاب ہو گئے۔ ایک بار پھر نئے سرے سے جینے کا حوصلہ لے کر کارزارِ حیات میں قدم رکھا۔

---

[1] ادب اور تہذیب، مجاز چند یادیں (فرحت اللہ انصاری) [2] ادب اور تہذیب۔ مجاز چند یادیں (فرحت اللہ انصاری)

[3] زیرِ لب۔ صفیہ اختر۔

"سوائے ہم چند کے کسی کا پاس آنا گوارا نہ تھا۔ محبت میں ناکامی کا انجام پورے بھیانک انداز سے تماشے دکھا رہا تھا۔ علاج معالجہ ہوا۔ چار چھ مہینے کے لئے بڑی بہن کے ساتھ نینی تال چلے گئے اور خدا خدا کر کے تندرست و توانا ہو کر واپس آئے اور پھر نارمل زندگی بسر کرنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے لگے۔" [1]

اُنھیں دنوں آگرہ میں ایک مُشاعرہ ہوا، اس میں شرکت کرنے مجاز لکھنؤ سے آگرہ گئے، وہاں سے اُنھوں نے زہرہ جبین کے شوہر کو خط لکھا کہ آگرہ تک آ گیا ہوں، دہلی آنے کی خواہش باقی ہے۔ انھوں نے ان کو اس خواہش پر دلّی بلوایا اور ایک بار پھر مجاز دہلی جا کر انھیں زہرہ جبین کے یہاں قیام پذیر ہو گئے۔ اس بار مجاز کی حالت اور بھی دگر گوں تھی۔ مستقل بے کاری اس پر کثرت شراب نوشی نے یہ حالت کر دی تھی کہ بعض اوقات اپنے جذبات پر قابو نہ کر پاتے اور قابلِ اعتراض باتیں زبان سے نکلنے لگتی تھیں۔ خودداری اور حمیّت کا دامن ہاتھوں سے قدرے چھٹتا نظر آنے لگتا تھا۔ ہر وقت انھیں زہرہ جبین کے گھر میں پڑے رہتے اور نظرِ التفات کے خواہاں رہتے۔ انھیں دنوں ڈاکٹر کنور اشرف کی بیوی کلثوم وہیں ٹھہری ہوئی تھیں، انھوں نے مجاز کو وہاں دیکھا اور اُن کو یہ بات بالکل پسند نہ آئی۔ اور ایک دن انھوں نے صاحب خانہ سے اس بات کی شکایت کی لہٰذا ان سیاسی رہنمانے کوشش کر کے مجاز کو ہارڈنگ لائبریری میں ملازمت دلوادی اور ساتھ ہی ان کے قیام کا انتظام اپنے ایک دوست (جو بیرسٹر تھے) کے یہاں کرا دیا تھا۔ ان کی کوٹھی فوارے کے قریب تھی۔ اسی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں جو بالائی منزل پر تھا جگہ دلوادی تھی۔ اس طرح ۱۹۴۳ء میں مجاز پھر ایک بار دلّی پہنچ گئے لیکن پہلے سے بدتر حالت میں۔ حالانکہ جب وہ دلّی سے گئے تھے تو وہ یہ کہتے ہوئے گئے تھے: ؎

پھر تری بزمِ حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤں گا میں اور بہ اندازِ دگر آؤں گا میں

حمیدہ سالم کا خیال ہے کہ وہ اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے مقرر ہوئے تھے لیکن آل احمد سرور اور اردو کے شاعر رفعت سروش (جو ان دنوں آل انڈیا ریڈیو میں ہیں) کا کہنا ہے کہ مجاز کاؤنٹر کلرک تھے۔ یہاں وہ ۱۵ رمئی ۱۹۴۳ء کو ملازم ہوئے اور ۱۹۴۵ء تک یہاں ملازمت کرتے رہے۔" [2]

---

[1] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ (مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۹۲-۱۹۳)

[2] رضا صاحب کے نام ایک خط (مورخہ ۱۹ رمئی ۱۹۴۳ء) نقوش مکاتیب نمبر۔

لائبریری کی ملازمت کے ساتھ رسالہ "ادب" جس کے ایڈیٹر فصیح الدین احمد صاحب تھے، مجاز سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے، لیکن ان کا نام اس حیثیت سے نہیں چھپتا تھا۔ مجاز کا کلام اس میں شائع ہوتا رہتا تھا اور کتابوں پر ان کے لکھے ہوئے تبصرے چھپا کرتے تھے۔ اس دور کے ادیبوں اور شاعروں سے بھی ان کے تعلقات تھے جن میں آغا سرخوش قزلباش مرحوم سے جو رسالہ "چمنستان" نکالتے تھے، مجاز کے گہرے تعلقات تھے۔ انھیں کی مدد سے دوسرا شعری مجموعہ 'شب تاب' کے نام سے چھپا۔ ان دنوں مجاز مسلم لیگ سے بھی وابستہ رہے اور پاکستان کا ترانہ بھی لکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پارٹی اور اس کے ممبران مسلم لیگ کے حمایتی تھے۔

ہارڈنگ لائبریری کی ملازمت کے دوران مجاز کی اُن زہرہ جبین سے ملاقات کی ایک سے زیادہ شہادتیں ملتی ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں دہلی میں مجاز ایک بار کافی علیل ہوگئے اور ہسپتال داخل ہونا پڑا۔ اسی عرصہ میں وہ خاتون مجاز کی عیادت کو تشریف لائی تھیں۔ انھیں دنوں اے۔ آر۔ خاتون کی ناول "شمع" نئی نئی شائع ہوکر مقبول خاص و عام ہو رہی تھی، مجاز کی دل جوئی کی خاطر وہ "شمع" ساتھ لائی تھیں۔

یہ واقعہ ایک صاحب نے جو کوئی مشہور و معروف ہستی تو نہیں ہیں، لیکن اُن دنوں لکھنؤ میں مقیم تھے اور آجکل کراچی میں "جنگ" اخبار سے منسلک ہیں، بیان کیا کہ مجاز نے لکھنؤ میں یہ واقعہ خود بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ نظم "عیادت" اسی کی تحریک پر لکھی گئی ہے۔ اس کے اکثر اشعار سے اس واقعہ کی صداقت کے ثبوت ملتے ہیں۔[۱]

بیمار کے قریب بصد شانِ احتیاط　　　دلداریٔ نسیم بہاراں لئے ہوئے

ایک اور شعر ہے:

آ ہی گیا وہ میرا نگارِ نظر نواز!　　　ظلمت کدے میں شمع فروزاں لئے ہوئے

اس شعر میں شمع کا لفظ جو شاعرانہ انداز سے لائے ہیں، یہ دراصل اشارہ ہے اُسی 'شمع' ناول کی طرف جو انھوں نے مجاز کی دل جوئی کے لئے دی تھی۔ اسی طرح کا ایک اور شعر ہے:

یہ کون ہے مجاز سے سرگرمِ گفتگو　　　دونوں ہتھیلیوں میں زنخداں لئے ہوئے

---

[۱] ایک صاحب جنگ اخبار سے منسلک ہیں اُن دنوں لکھنؤ میں مقیم تھے اور اُردو زبان و ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ایک تعلق خاص رکھتے تھے۔ حال میں ہندوستان تشریف لائے تھے ان سے برسبیل تذکرہ یہ واقعہ معلوم ہوا۔

اِن کے بیان کے مطابق وہ خاتون بقول مجاز بجنسہٖ اسی انداز میں بیٹھی ان سے محوِ گفتگو تھیں جس کا ذکر اس آخری شعر میں کیا گیا ہے۔

یہ بات قرینِ قیاس یوں بھی معلوم ہوتی ہے کہ مجاز کا ایک اندازِ خاص یہ تھا کہ وہ کسی بھی شخصیت کا نام شاعرانہ طور پر اس طرح تصرف کرتے ہیں کہ نام بھی آجائے اور شعر کے معنوں میں کمو یا بھی رہے جیسے پروفیسر (ڈاکٹر) محمد حسن صاحب نے ایک واقعہ کا ذکر کیا کہ ایک صاحبہ ثریا جبین آئی۔ٹی۔ گرلز کالج میں تھیں۔ مجاز نے اُن سے بھی ربط پیدا کر لیا تھا اور اُن کی شان میں ایک شعر اس طرح کہا:

بھری محفل میں چھلکایا ہے جامِ آتشیں میں نے　　　زمیں سے اُڑ کے چومی ہے ثریا کی جبیں میں نے

زہرہ کا نام خالدہ ادیب خانم والی نظم میں اس طرح آیا ہے

ذکر جس کا زہرہ و پروین کے کاشانے میں ہے　　　وہ ستم بھی آج اپنے ہی صنم خانے میں ہے

دوسرے اکثر ان کی رومانی نظمیں کسی رومانی واقعہ یا شخصیت سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ اس لئے عیادت کے سلسلہ میں اس واقعہ کا تعلق قرینِ قیاس اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔

مجاز کے معاشقے کے سلسلہ میں ایک واقعہ پروفیسر (ڈاکٹر) محمد حسن صاحب سے معلوم ہوا کہ جن دنوں مجاز دلّی سے لوٹ کر لکھنؤ میں قیام پذیر تھے[1] انھیں دنوں ڈاکٹر محمد حسن صاحب بھی لکھنؤ میں طالب علم کی حیثیت سے مقیم تھے اور انجمن حلقۂ احباب کے روحِ رواں تھے اور اس انجمن کے صدر جناب احتشام صاحب (مرحوم) تھے۔ انجمن کی طرف سے ایک بار کیلاش ہاسٹل میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب احتشام صاحب (مرحوم) کر رہے تھے اور کنیز عطاء اللہ جو انجمن کی ممبر بھی تھیں بہت سی لڑکیوں کے ساتھ مشاعرے میں شریک تھیں، مجاز کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور ان کو اس کا علم ہو گیا تھا کہ اس مشاعرہ میں لڑکیاں بھی شریک ہو رہی ہیں لہٰذا وہ اپنی فطرت کے مطابق مشاعرہ میں قبل از وقت پہونچ گئے۔ کنیز عطاء اللہ بیحد خوبصورت خاتون تھیں، مجاز انھیں دیکھ کر کافی متاثر ہوئے اور مسلسل انھیں دیکھتے رہے۔ جلسہ ختم ہونے سے ذرا پہلے وہ تمام لڑکیوں کے ساتھ جانے لگیں تو مجاز احتشام صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ احتشام صاحب! ایک شعر ہو گیا ہے

کون اُٹھ کر چلا یہ محفل سے　　　جس طرف دیکھئے اندھیرا ہے[1]

اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ مجاز اکثر کیلاش ہاسٹل جانے لگے۔ بات یہاں تک

---

[1] یہ واقعہ پروفیسر (ڈاکٹر) محمد حسن نے دوران ایک انٹرویو کے بیان کیا تھا۔

بڑھی کہ باقاعدہ پیام و سلام اور خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا اور خود مجاز کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ صبح و شام کنیز عطاء اللہ کے نام کا ورد کیا کرتے۔ آخر میں نوبت بہ ایں جا رسید کہ ڈاکٹر رشید جہاں مجاز کے ہمراہ کنیز عطاء اللہ کے یہاں جاتی ہوئی دیکھی گئیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اُن کے پاس مجاز کا پیغام شادی کے لئے لے کر گئی تھیں اور کنیز عطاء اللہ اس شرط پر راضی ہو گئیں کہ مجاز انھیں بدنام نہ کریں اور ہر کس و ناکس کے سامنے اُن کا نام نہ لیں۔ مجاز اس بات پر رضامند ہو گئے لیکن مشکل سے دو چار روز وہ اس پر قائم رہے۔ اس کے بعد وہ پہلے دن سے دونی شدت کے ساتھ ان کا نام لے لے کر پکارنے لگے۔ بقول پروفیسر محمد حسن صاحب مجاز اپنے پہلے عشق کے تئیں اس قدر وفادار تھے کہ جب کبھی شادی یا دوسرے عشق کا سلسلہ سنجیدہ رُخ اختیار کرتا تو ان کی وفا کو ٹھیس پہونچتی اور وہ ایسا کرنے سے باز آجاتے۔ اور اپنے کو گنہ گار مجرم عشق گردانتے اور ان کا ضمیر انھیں ملامت کرنے لگتا اور وہ اعتراف کر لیتا۔ ع۔ مَیں وفادار نہیں ہاں مَیں وفادار نہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شادی نہ ہونے اور عشق کے پروان نہ چڑھنے کی تمام تر ذمہ داری دوسری رکاوٹوں کے ساتھ ساتھ خود مجاز کی وفاداری پر تھی جس کی وجہ سے وہ زندگی بھر کسی کا دامن نہ تھام سکے۔ ان کے اپنے عشق کی "عصمت" جس کا ان کو بڑا خیال تھا ان کی وفاداری تھی۔ لہٰذا تمام تر رکاوٹوں اور دشواریوں کے باوجود اگر کہیں کوئی تحریک یا اُمید ہوتی تو ان کی اپنی "وفا" خود ان کی راہ میں حائل ہو جاتی۔ پروفیسر (ڈاکٹر) محمد حسن صاحب کے خیال کے مطابق مجاز نے جو اپنے شعری مجموعے "شب تاب" کا انتساب عصمت کے نام کیا ہے وہ عصمت وہی ان کی "وفا" ہے۔[1]

مجاز جن کے وفادار تھے اُن زہرہ جبین سے ۴۴۔۱۹۴۵ء کے دوران مجاز کی ملاقاتوں کے رفعت سروش صاحب بھی شاہد ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ان کو اکثر و بیشتر ٹیلیفون کیا کرتے تھے۔ اس میں ممکن ہے کوئی معیوب باتیں نہ رہی ہوں لیکن تبدیل ہوتی ہوئی روایات اور سماجی ڈھانچہ، پھر یہ روشن خیال خاندان جس نے تفننِ طبع کی خاطر ادب اور آرٹ سے دلچسپی لینا شروع کر دی تھی، تو ادیب و شاعر کیسے متاثر نہ ہوتا؟:-

"اس طبقے کے نئے گھران نے باپ دادا کے آبائی پیشے طوائف بازی سے اُکتا کر علم و ادب سے لطف لینا شروع کر دیا۔ اب اُن کی محفل میں بجائے مُنّی جان کے مُجرے کے مشاعرے اور ادبی جلسے ہوتے

---

[1] یہ تمام واقعات و معلومات پروفیسر محمد حسن صاحب سے دورانِ گفتگو جے۔ این۔ یو۔ دلی میں بہم پہنچی ہیں۔

ہیں۔ بجائے مرغ اور بٹیر کے ادیب و شاعر پالے جاتے ہیں"۔[1]

مجاز اپنی اس ملازمت سے قطعی مطمئن نہیں تھے اور کہتے تھے۔"یہ قبرستان ہے۔ ان الماریوں میں مُردے سجے ہوئے ہیں"۔ ان دنوں وہ اپنے ایک وکیل دوست عطاء الرحمٰن صاحب کے ڈرائنگ روم میں رہا کرتے تھے۔ غالباً یہ کوٹھی چاندنی چونک میں تھی اور یہ وہی کوٹھی رہی ہوگی جس کا ذکر قدبلی صاحب نے مجاز کی رہائش کے سلسلے میں کیا ہے:۔

"ان دنوں وہ اپنے ایک وکیل دوست عطاء الرحمٰن کے ڈرائنگ روم میں چاندنی چوک میں رہتے تھے۔ لکشمی رسٹورنٹ کے سامنے اسی مکان کے نیچے ایک پنواڑی کی دوکان تھی جس سے وہ دیسی شراب اُدھار لیتے تھے اور جب جیب میں پیسے ہوتے تو لکشمی ریسٹورنٹ یا میجسٹک سینما کے اوپر والے بار میں شغلِ مے فرماتے"۔[2]

ماں بہنوں کے دل میں پھر مجاز کا گھر بسانے کا خیال آیا۔ صفیہ اختر نے جو اُن دنوں علی گڈھ میں ملازمت کر رہی تھیں، ایک اپنی سہیلی کو مجاز کی شریک حیات بنانے پر رضامند کر لیا تھا۔ لڑکی پڑھی لکھی معمولی شکل وصورت کی تھی۔ برسر روزگار بھی تھی۔ مجاز کو بھی سمجھا بجھا کر اس بات کے لئے تیار کر لیا گیا۔

"دل کے ملاپ کا تو سوال نہ تھا، لیکن جگن بھیا نے سوچا ہوگا کہ شاید سپردگی ہی میں نجات ہو۔ اور زندگی کے منتشر تار یکجا ہوسکیں۔ زخم رسنا بند کردیں۔ جذبات کا تو دتی میں گلا گھٹ ہی چکا تھا۔ جانے کس دل سے اپنے کو سمجھا کے سپرد کر پائے ہوں گے۔ بہرحال اس رشتہ پر راضی ہو گئے اور بات یہاں تک پہونچی کہ ایک دفعہ .... کے سرپرست سے مل لیں اور معاملہ طے ہو جائے۔ اس زمانے میں جگن بھیا دلی کی لائبریری میں کام کر رہے تھے، وہاں سے بُلائے گئے اور بُزدِ کھتوے کے سفر پر روانہ ہوئے۔ لاکھ سر پر ٹیڑھی ترچھی ٹوپی رکھی اور استری شدہ شیروانی پہن کر جاذبِ نظر لگنے کی کوشش کی، لیکن ہزار ڈیڑھ ہزار کمانے والے کالج کے پرنسپل کے لئے ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ پانے والے اسسٹنٹ لائبریرین میں کشش پیدا نہ ہوسکی۔ خالی ہاتھ ٹرخا دئے گئے۔ عورت کو آنچل سے پرچم بنانے کا پیام بھایا بہت تھا لیکن اس پیام پر عمل کرنا، معاملہ خطرناک تھا۔ ایک طرف

---

[1] عشقِ مجازی۔ عصمت چغتائی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۴۴۔

[2] رفعت سروش کا خط بنام منظر سلیم (مجاز حیات و شاعری منظر سلیم صفحہ ۶۱۔

ہزاروں کمانے والا سرکاری عہدے دار، دوسری طرف دل شکستہ خالی جیب شاعر۔ زر کی جیت ہوئی، فن پھر شکست کھا گیا۔ شاعر نے ایک دفعہ دل کی آواز پر قدم اٹھایا تھا اور منہ کے بل گر گیا تھا۔ اس مرتبہ اس نے عقل پر بھروسہ کیا اور تھم تھم کر، رک رک کر، احتیاط کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھایا۔ پھر بھی ٹھوکر کھا گیا اور کھسیا کر رہ پڑا۔ [1]

مجاز کو بر دکھاوے کے لئے اجمیر بھیجا گیا جہاں لڑکی کے والدین مقیم تھے اور ساتھ ہی اس بات کی تاکید کر دی گئی تھی کہ شراب نوشی اور اسی قسم کی کوئی اور حرکت نہ کریں جس کے سبب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ یہ اس دور اور زمانے کا تقاضا تھا۔ نہ شراب پینے والوں کو پسند کیا جاتا تھا نہ ہی قلاش و مفلس کی ہمت بندھائی جاتی تھی خواہ وہ کتنا ہی بڑا فن کار کیوں نہ ہو۔ بقول جذبی صاحب مجاز کو یہ تاکید بھی کہ سکنڈ کلاس میں سفر کریں۔ چنانچہ مجاز تیار ہو کر سکنڈ کلاس سے اجمیر روانہ ہوئے۔ جب گاڑی اجمیر اسٹیشن پر پہونچی تو بڑی دیر تک مجاز ڈبہ میں کھڑے استقبال یا پذیرائی کرنے (لینے آنے) والوں کا انتظار کرتے رہے تاکہ وہ لوگ دیکھ لیں کہ یہ سکنڈ کلاس میں سفر کر کے آئے ہیں۔ کیونکہ ان کو کی گئی تاکید میں یہ بھی شامل تھا۔ حالانکہ مجاز خود یہ سوچتے تھے کہ تھرڈ کلاس میں سفر کرنے سے کافی پیسے بچیں گے جو شراب کے کام آئیں گے، لیکن پرنسپل حفظ الرحمن صاحب ٹرین کے پہونچنے سے قبل نہ پہونچے اور مجاز کو آخر میں اترنا پڑا۔ اور جب وہ گیٹ سے نکل رہے تھے تو ان کی ملاقات حفظ الرحمن صاحب سے ہوئی اور وہ انھیں اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ وہاں مجاز نے اپنی عادت کے برخلاف شام تک اپنے پر قابو رکھا، لیکن شام کو جب ٹہلنے نکلے تو ایک بار نظر آ گیا۔ وہیں قدمِ استقامت ڈگمگا گئے، اور اُن سے پھر وہی لغزش سرزد ہو گئی جس کی وجہ سے انھیں کئی بار رسوا ہونا پڑا تھا۔ لوٹ کر گھر آئے تو بچوں سے چونکہ انھیں خاصا شغف تھا اس لئے اُن سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ اُنھیں لپٹاتے رہے۔ اُن کے منہ سے آتی ہوئی شراب کی بُو کو بچوں نے محسوس کیا اور اندر جا کر کہا کہ مجاز صاحب نہ جانے کیا کھا پی کر آئے ہیں۔ بچوں کے ذریعہ اس بات کا انکشاف ہونے کے بعد پرنسپل صاحب نے رشتے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ حمیدہ سالم کا کہنا ہے کہ :-

”ڈیڑھ ہزار کمانے والے پرنسپل کے لئے ڈیڑھ سو پانے والے اسسٹنٹ لائبریرین میں کشش نہ پیدا ہو سکی۔“

---

[1] جگنو بھیّا۔ حمیدہ سالم (مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۹۲)

جذبی صاحب (جو اُن کے اُس زمانے میں بہت قریب تھے اور دلّی میں ہی مقیم تھے) کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجاز کی شادی کے اس رشتے کی نامنظوری کی وجہ صرف شراب نوشی تھی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ مجاز کی اس معمولی پوسٹ اور حیثیت کا اندازہ تو ان لوگوں کو پہلے سے رہا ہوگا، اگر یہ بات اُنھیں گوارا نہ ہوتی تو وہ مجاز کو بَردکھاوے کے لئے نہ بلاتے۔

غرض کہ یہ معمولی ملازمت، مشاعروں کی مقبولیت، زمانے کے ناسازگار حالات اور اونچے اونچے گھرانوں کی داد و دہش اور شادی کے سلسلے میں اس طرح ٹھکرائے جانے نے مجاز کے ذہن کو پھر سے منتشر کر دیا اور ۱۹۴۵ء میں اُن پر جنون کا دوسرا دورہ پڑا۔

"ایک طرف تو مشاعروں کی مقبولیت اور اونچے سے اونچے گھرانوں کی واہ واہ بھی۔ دوسری طرف ایک کلرک کی زندگی کے مصائب۔ مجاز بیچارے کا کیا قصور۔ بیک وقت آسمان پر پرواز اور وہاں سے فوراً دھرتی پر پٹخ دیا جانا۔ پھر آسمان کی سیر اور پھر سنگلاخ حقایق کا بوجھ، ایک نازک طبع، کمزور دل کا نوجوان جس کے دل پر کتنے زخم تھے اور جس کی جیب خالی تھی، مگر تہذیب و شرافت کے ایک معیار کو فراموش نہ کر سکتا تھا، کیسے برداشت کرتا۔ چنانچہ خللِ دماغ شروع ہوا۔[۱]

اِس بار مجاز پر اپنی عظمت و تعریف کا خبط سوار تھا۔ شاعروں کے نام کی فہرست تیار کرتے۔ غالب و اقبال کے بعد اپنا نام لکھ کر فہرست ختم کر دیتے۔ باتیں بے تکان کرتے جن میں کچھ لطیفے اور کچھ شعر و ادب پر اُلٹی سیدھی باتیں یا اپنی تعریفیں ہوا کرتی تھیں۔ کچھ ڈاکٹروں کی کوشش، کچھ گھر والوں کی تیمارداری اور دل جوئی سے مجاز پھر جلد ہی صحت یاب ہو گئے، لیکن بے کلری، تنہائی اور شراب نوشی سے ان کی زندگی میں تلخیاں بڑھتی گئیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مجاز کی شادی کردی جائے۔ ماں بہنیں اس تلاش میں سرگرداں رہتیں لیکن یہ علاج ہوتا تو کیونکر؟

مجاز کی جیب خالی تھی۔ اس تہی دست شاعر کا ساتھ دیتا تو کون؟ جہاں بھی گھر والوں نے خواہش کا اظہار کیا تو جواب ملا کہ "بڑے کے ساتھ تو نہیں۔ البتہ چھوٹے کے ساتھ چاہو تو کرلو۔" وہی مجاز جو اس میدان میں آرزوؤں کا مرکز تھا، کوڑا کرکٹ بن کر رہ گیا۔"[۲]

مجاز اس شکستِ پیہم کو برداشت کرتے اور اُن کی مسکراہٹ میں تھوڑی سی تلخی اور گھل جاتی۔

---

[۱] مجاز رومانیت کا شہید۔ آلِ احمد سرور (مجاز ایک آہنگ صفحہ ۵۶۔

[۲] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم (مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۹۴۔

دوسرے نروس بریک ڈاون کے بعد جب مجاز کی طبیعت گھر والوں کی تیمارداری، دل جوئی و علاج سے ٹھیک ہوئی تو انھیں اس بات کی فکر لاحق ہوئی کہ گذر اوقات کے لئے کچھ کرنا ضروری ہے، لیکن ان میں وہ پہلا سا دم و خم باقی نہ تھا۔ بقول شوکت تھانوی کے :

" مجاز نے فیصلہ کرلیا تھا کہ انھیں زندگی بسر کرنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی کو ضرورت ہو تو اسے بسر کرے۔" [1]

یوں تو بمبئی جانے کی شہادتیں کئی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی کانفرنس میں شرکت کے لئے ۳ مئی کو وہ شوکت اللہ انصاری کی فیملی کے ساتھ گئے۔ رضا انصاری کو لکھتے ہیں :

" جواب میں دیر ہونے کی بھی یہی وجہ ہوئی کہ ابھی آیا ہوں۔ اچھا تو حالات یہ ہیں کہ یہاں سے ایک شان دار قافلہ یعنی شوکت، مادام، زہرہ اور ایک آدھ کامریڈ اور ہم خود بھی۔ ۲۱ مئی کی صبح کو جمعہ کے دن جی۔ آئی۔ پی سے روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ جھانسی سے شام یا رات کو گذرے گی۔ تم بھی اس طور پر چلو کہ ہمیں جھانسی میں مل جاؤ۔ وہی گاڑی تمھیں جھانسی سے بمبئی کے لئے ملے گی۔ وقت دریافت کرلینا۔ یہاں سے تو ۹ بجے صبح کو روانہ ہوتی ہے۔ ساتھ ہو جائے گا تو سفر اچھا ہی ہوگا۔" [2]

اور ایک بار پھر وہ ۱۹۴۵ء کے بعد بمبئی پہونچے۔ دوستوں، یاروں کی مدد سے " بمبئی انفارمیشن آفس" میں لگ گئے اور کچھ دنوں کام کیا۔ وہاں لوگوں نے مشورہ دیا کہ فلمی گیت لکھ کر پیسے کماؤ تاکہ کچھ دکھ دور ہو سکیں اور رضیہ سجاد ظہیر کا کہنا ہے کہ ہم لوگوں نے اصرار کرکے بڑی مشکل سے اس بات کے لئے انھیں آمادہ بھی کرلیا۔ اُن کی نظم جو غالباً " آوارہ" ہی تھی، اس کے لئے فلم کمپنی سے معاہدہ کرادیا۔ مجاز نے شروع شروع کچھ دنوں رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ کے ساتھ بمبئی میں قیام کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک دن وہ فلم کمپنی سے لوٹے تو اُن کی آنکھوں سے ایک مخصوص چمک اور خوشی جھلک رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگے بازار چلئے۔ ایش ٹرے خریدیں گے (رضیہ صاحبہ کو ایش ٹرے جمع کرنے کا شوق تھا) میں نے کہا کہ ایش ٹرے تو میرے پاس بہت ہیں۔ کیا ضرورت ہے۔ میرے پاس اتنے فالتو پیسے نہیں ہیں، لیکن انھوں نے اتنا مجبور کیا کہ آپ چلئے تو۔ پیسے میرے پاس ہیں۔ میں نے پوچھا۔ کہاں سے لائے ہو اور کتنا لائے ہو؟ جو اتنا اودھم مچا رہے ہو۔ انھوں نے اپنے خاکی رنگ کے کرتے کے

---

[1] مجاز ایک آہنگ صفحہ ۲۳۔ (تاثرات شوکت تھانوی)

[2] رضا انصاری کے نام مجاز کا خط۔ مورخہ دہلی ۱۹ مئی ۱۹۴۳ء۔ نقوش مکاتیب نمبر۔

پیچھے والے جیب سے کوئی ایک ہزار نکال کر گن گن کر میرے آگے ڈھیر لگا دیے۔ اُس وقت اُن کے چہرے سے اطمینان و مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ اتنے سارے پیسے کر میں تم کو ہرگز نہیں جانے دوں گی تم یہ سارے پیسے برباد کر دو گے۔ میرے پاس رکھ دو میں تم کو تمھاری ضرورت کے مطابق دیا کروں گی۔ لیکن وہ مجبور کر کے بازار لے گئے اور وہاں میں نے مجاز کے لئے بہت سارے سامان خریدے کیونکہ وہ لکھنؤ سے بمبئی بڑی بے سروسامانی کی حالت میں آئے تھے۔ سامان میں دو کُرتے، دو پاجامے ایک بستر بند، ایک اٹیچی، ایک توشک ایک کمبل، دو چادریں اور اس کے علاوہ بہت سی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔ ہر اچھی چیز کو دیکھ کر اصرار کرتے کہ اپنے لئے خرید لیجیے اور جب میں انکار کرتی تو کچھ کبیدہ خاطر سے ہو جاتے اور آخر کار کچھ چیزیں میری بچیوں کے لئے خریدنے پر مُصِر رہے۔"

رضیہ صاحبہ کے کہنے کے مطابق مجاز نے ان کے ساتھ رہنے اور روک ٹوک کی وجہ سے شراب نوشی بھی کافی کم کر دی تھی۔ بقول اُن کے جب وہ اُن کو شراب دیتی تھیں تب ہی مجاز پیتے تھے اور شام کو اُن کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلتے۔ اس طرح کسی حد تک مجاز کی زندگی کی بے اعتدالیاں کچھ کم ہو گئی تھیں۔ انھیں دنوں جوش صاحب جو پونا کی کسی فلم انڈسٹری میں گانے لکھ رہے تھے، بمبئی تشریف لائے اور باوجود رضیہ صاحبہ کے منع کرنے کے وہ مجاز کو اپنے ساتھ لے گئے۔ پھر مجاز ایک ماہ تک لوٹ کر نہیں آئے۔" غالباً انھیں دنوں مجاز کی ملاقات عصمت چغتائی سے ہوئی۔[1]

"معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں طوفان اور ریلے گذر گئے ہیں۔ جو چہرے کے سارے احساسات اور جذبات اُڑا کر لے گئے۔ جیسے یہ شخص کچھ سنتا ہے اور نہ سوچتا ہے اور نہ ہی آئندہ اس قسم کی حماقت کا کوئی ارادہ رکھتا ہے۔ کسی شدید بیماری کے حملے نے بالکل سُن کر ڈالا ہے۔ چہرے کو غور سے دیکھ کر شبہہ ہوتا ہے کہ شاید اس شخص کو یہ خبر ہی نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ آنکھوں میں ایک مغایرانہ تغافل جیسے کسی کو پہچانتے ہی نہیں۔

ایک بار نہیں کئی بار گروہوں میں دیکھا۔ اسی طرح غیر حاضر قسم کا وجود، کھانے والوں کے ساتھ کھا لینا، چلتے دیکھ کر چل پڑنا، بیٹھے دیکھ کر بیٹھ جانا اور رخصت ہوتے دیکھ کر ان کے پیچھے پیچھے سرک جانا۔ عدم اور وجود کچھ ایک ہی جیسا۔ جسم تو موجود ہے مگر آگے سُراغ نہیں ملتا کہ دوسرے لوازمات

---

[1] یہ ساری معلومات رضیہ صاحبہ سے دورانِ گفتگو ملیں۔ اتفاق سے ٹیپ غلطی سے ہو گیا۔

کہاں بھٹک رہے ہیں[1]

رضیہ صاحبہ کا بھی کہنا ہے کہ "جب وہ تقریباً ایک ماہ بعد لوٹ کر آئے تو بیحد خاموش تھے۔ میں بھی چونکہ اُن سے ناراض تھی اس لئے میں نے کچھ خاص بات نہیں کی بس مشین پر بیٹھی اپنی بچی کی فراک سیتی رہی تھی لیکن جب وہ اٹھ کر جانے لگے تو میں نے پوچھا۔ "کچھ کھاؤ گے؟" یہ رُک گئے۔ میں نے ڈبل روٹی اور مکھن باورچی خانہ سے لاکر دیا، اُس کو انھوں نے کھالیا اور پھر خاموشی کے ساتھ کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد وہاں سے چلے گئے۔ اس کے بعد میری ملاقات اُن سے بمبئی میں نہیں ہوئی۔[2]

مجاز جیسا حساس انسان بمبئی کی تیز رفتار کاروباری اور مشینی زندگی میں کسی طرح کامیاب نہ ہوسکتا تھا۔ ۱۹۴۶ء، ۴۷ء کے دوران جب بمبئی میں فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے مجاز ان دنوں کمیونسٹ پارٹی کے دفتر غالباً گول گھر میں رہا کرتے تھے۔ ان فسادات کے ہولناک اور روح فرسا مناظر کی تاب نہ لاسکے۔ انھوں نے انسانوں کو خون میں نہاتے دیکھا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ تین دن تک حواس بجانہ ہوئے۔ لیکن وہی مجاز ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک کی آزادی پر خوشی سے سرمست سڑکوں پر جھوم جھوم کر : "راج سنگھاسن ڈانواڈول"

گا رہے تھے۔ بقول سردار جعفری :۔

"۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو میں اور مجاز بمبئی کے مسرت سے سرشار شہریوں کے ساتھ اوپرا ہاؤس کے چوراہے پر آزادی کی خوشی میں ناچ رہے تھے اور مجاز چٹکی بجا بجا کر ناچ رہے تھے اور گا رہے تھے۔

"بول ارے او دھرتی بول ÷ راج سنگھاسن ڈانواڈول ÷ راج سنگھاسن ڈانواڈول"

گیت مکمل ہوچکا تھا اور سارا مجمع مجاز کے ساتھ گا رہا تھا۔[3]

دوسرے دن آزادی کے سلسلے میں جلسہ ہوا تو مجاز نے بھی جلسے میں شرکت کی اور اپنی نئی نظم کے ذریعہ اس روز مبارک کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا ؎

بصد غرور و بصد فخر و ناز آزادی ۔۔۔ مچل کے کھل گئی زلفِ دراز آزادی

مہ و نجوم ہیں نغمہ طرازِ آزادی ۔۔۔ وطن نے چھیڑا کچھ اس طرح سازِ آزادی

زمانہ رقص میں ہے۔ زندگی غزل خواں ہے

---

[1] عشقِ مجازی ۔ عصمت چغتائی ۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۲۶۱ ۔ ۲۶۲

[2] یہ اطلاعات رضیہ صاحبہ سے دورانِ گفتگو ملیں۔ اتفاق سے اس گفتگو کا ٹیپ غلطی سے مٹ گیا۔

[3] لکھنؤ کی پانچ راتیں اور دوسری یادیں ۔ سردار جعفری ۔ جولائی ۱۹۶۴ء

اور جب وہ اس بند پر پہونچے تو اہلِ محفل جھوم جھوم اُٹھے:

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں — یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں — ابھی وہ سعیِ جنوں خیز کامیاب نہیں

یہ انتہا نہیں آغازِ کارِ مرداں ہے

مجاز ۱۹۳۷ء میں ہی بمبئی سے واپس لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ میں اُن دنوں ایک نیا ادبی گروہ یکجا ہو گیا تھا جس میں سید احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر رشید جہاں، پنڈت آنند نرائن مُلّا، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، رضیہ سجاد ظہیر، شوکت صدیقی، ممتاز حسین، محمد حسن، سلام مچھلی شہری، حسن شہیر اور متعدد دوسرے ادیب و شاعر تھے اور آل احمد سرور کی میرو روڈ پر ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی جس میں ہر اتوار کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوا کرتے تھے اور یہ سبھی حضرات اس جلسے میں شرکت کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی حیات اللہ انصاری بھی شریک رہتے تھے۔ مجاز برابر ان جلسوں میں جایا کرتے تھے اور انھیں بیحد مقبولیت بھی حاصل تھی۔ شام کو سب لوگ کافی ہاؤس میں اکٹھا ہوتے اور مجاز اپنی بذلہ سنجیوں سے محظوظ کرتے۔ دو تین سال تک ان محفلوں کا سلسلہ رہا، پھر لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے۔ مجاز لکھنؤ سے اکثر مشاعروں میں دہلی جایا کرتے تھے۔ جوش بھی ان دنوں دہلی میں بحیثیت ایڈیٹر "آجکل" مقیم تھے۔ دہلی جیسے بڑے شہر میں دولت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق رکھنے والوں کی بھی کچھ کمی نہ تھی۔ مشاعروں کی محفلیں ہوتیں، شراب کے پیالے چھلکائے جاتے۔ اور مجاز کچھ تو جوش صاحب، کچھ مشاعروں کی قدردانی کی وجہ سے دہلی میں خاصا وقت گذارنے لگے۔ اکثر تو وہ مہینوں قیام کرتے کیونکہ اب ان کو دو ہی چیزوں سے تسکین ملتی تھی۔ ایک اشعار کی رنگینیوں میں اپنے کو بہلا کر۔ دوسرے شراب کی تلخی میں اپنے غموں کو بھلا کر، لیکن مجاز زندگی کی اُس منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں شراب کی تشنگی لاکھ پینے پر بھی ختم نہ ہوتی تھی، پھر بھی اُنھیں اپنی بربادی و رُسوائی کا خیال ہر وقت دامن گیر رہتا تھا۔

میں کہ بربادِ نگارانِ دل آرا ہی سہی
میں کہ رسوائے مے و ساغر و مینا ہی سہی
میں کہ مقتولِ گلِ نرگسِ شہلا ہی سہی
پھر بھی خاکِ رہِ صاحب نظراں ہوں اے دوست

مجاز ۱۹۵۱ء میں کراچی کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے گئے تھے وہاں ان کی ملاقات

ان کے بہت سے دوستوں اور رفیقوں سے ہوئی۔ ان میں نصیر حیدر، شہیر، سبطِ حسن، مجتبیٰ حسین، عبادت بریلوی وغیرہ تھے۔ نصیر حیدر نے ان دنوں مجاز کی جو کیفیت و حالت دیکھی تھی اُس کی تصویر کشی یوں کی ہے:-

"مجاز سچ مچ زندگی سے اُکتا چکا تھا۔ جن لوگوں نے اُسے مشاعروں اور میخانوں میں دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اُس کی شخصیت کا سب سے زیادہ نمایاں عنصر اُس کے تیور تھے، مگر اب یہ تیور بدل بلکہ بگڑ چکے تھے۔ ان میں وہ دم خم نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سہم خُمار اور ذہنی کشیدگی کے باوجود جو ایک عجیب و غریب طلسماتی تابندگی نظر آیا کرتی تھی، اب مفقود ہو چکی تھی۔ اس کے بجائے بادہ خواری کے وقت ان میں کچھ عجیب سے سائے رقص کرتے دکھائی دیتے تھے"۔ [۱]

نصیر حیدر لکھتے ہیں کہ مجاز کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا کہ اس کے پاس موت کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ زندگی کے وہ سوتے جو پے در پے کبھی بذلہ سنجی اور کبھی نغمہ سنجی کی صورت میں اُس کی روح کے ہر رگ و ریشے سے رواں رہا کرتے تھے ایک ایک کر کے سوکھ چکے تھے۔ [۲]

کراچی کے دورانِ قیام مجاز کی ملاقات قُرۃ العین حیدر سے بھی ہوئی۔ وہ لکھنؤ میں مجاز کے گھر دار السّراج کے پاس رہا کرتی تھیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:-

"ہمارے پڑوس میں ایک بہت ولایتی قسم کا ڈنر ہونے والا تھا۔ میزبان خاتون نے کہا کہ سنا ہے آج کل انڈیا سے مجاز و جاز آئے ہوئے ہیں، اُن کو بلا لیا جائے ذرا دل چسپی رہے گی۔ یعنی رویہ یہ تھا کہ ڈنر کے ساتھ بال روم ڈانس نہ کیا۔ ترنم سے پڑھنے والوں کے اشعار سن لئے۔ ایک ہی بات ہے۔ کراچی کے اعلیٰ طبقے میں مشاعرے اسی طرح کروائے جاتے ہیں، جیسے معاف کیجئے گا۔ ایک زمانے میں نوابوں کے یہاں مُجرے ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ مجاز اور روشن صدیقی اور شاید ایک دو اور شاعروں کو رتھ بلوا بھیجا گیا۔ اس زمانے میں مجاز کی حالت بہت دگرگوں ہو چکی تھی۔ بہرحال انھوں نے اپنی تازہ غزلیں سنائیں۔ مجمع فوج کے ان بہت ہی اعلیٰ افسروں کا تھا جن کا ادب اور اُردو زبان سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا میرا مکینیکل اینڈ الکٹریکل انجینیرنگ سے۔ خیر وہ بیچارے صبر و شکر کرکے مجاز کے شعر سنتے رہے اور مجاز سناتے رہے۔ مجمع کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔ بالآخر جہلم کے ایک میجر جنرل صاحب نے اُن سے کہا۔

---

[۱] ترے بے خبر پکار آئے۔ نصیر حیدر۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۳۵۸۔

[۲] ترے بے خبر پکار آئے۔ نصیر حیدر۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۳۵۸۔

"جی اب آپ ایک آسان سی غزل سُنا دیں تو پھر ہم لوگ چلیں"۔[1]

اس ڈنر کے بعد قرۃ العین حیدر کی ملاقات مجاز سے نہیں ہوئی، لیکن اُن کی کیفیت اور شاعری کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف مجاز کے ایک اور دوست مجتبیٰ حسین نے کراچی میں مجاز سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے:۔

"مجاز سے میری آخری ملاقات پاکستان میں ہوئی۔ وہ کراچی کے ایک مشاعرے میں آئے ہوئے تھے۔ وہ بے انتہا کمزور ہو چکے تھے۔ پوری بات بھی اُن سے نہیں کی جاتی تھی۔ وہ اب تک چلے کیونکر جا رہے تھے، یہ چیز کچھ کم حیرتناک نہیں تھی۔ بس ایک شعلہ تھا جو اس جسم کو کسی نہ کسی طرح روشن کئے ہوئے تھا۔ اُن کے تیور اور آن بان میں بظاہر کوئی فرق نہیں آیا تھا مگر اِس بدلے ہوئے زمانے میں وہ خود کو اجنبی سا محسوس کر رہے تھے اور دوسرے بھی اُنھیں اجنبی سمجھنے لگے تھے۔ وہ ایک گذرے ہوئے کھوئے ہوئے وقت کی تلاش میں اور بھی کھو چکے تھے۔ .... ایک بھٹکی ہوئی روح جسے کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی"۔[2]

کراچی کالج میں مشاعرہ تھا جس میں مجاز بھی مدعو تھے، اور اُن سے 'آوارہ' کی فرمائش کی گئی جو اُن سے چل نہ سکی۔

مختلف شعراء اپنا کلام سُناتے رہے مگر مجاز کی باری نہیں آئی۔ ہم لوگ سامعین کی صف میں پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ زیادہ تر مجمع طلباء کا تھا۔ دیر تک انتظار کے بعد بھی جب مجاز کی باری نہیں آئی تو ہم لوگوں کی جانب سے مجاز کے پڑھائے جانے کے لئے آواز بلند کی گئی۔ ..... بارے مجاز ڈائس پر آئے۔ اُنھوں نے اپنی نظم "اعترافات" سُنانی شروع کی۔ وہ پڑھ نہیں پا رہے تھے۔ اُن کی سانس بار بار ٹوٹ جاتی اور وہ تھک جاتے۔ اُنھیں مستقل کھانسی آ رہی تھی اور وہ ہر جھٹکے کے ساتھ سینہ تھام لیتے۔ طلباء کا مجمع کچھ بے چین، کچھ بے کیف ہوا جا رہا تھا۔ بعض گوشوں سے ہوٹنگ بھی شروع ہو چکی تھی، مگر مجاز سامعین کی اکتاہٹ سے بے خبر ہو کر پڑھے جا رہے تھے ؎

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے ۔۔۔ شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہرِ خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے ۔۔۔ خوابگاہوں میں جگائی ہے جوانی میں نے

اُن کی آواز میں ایک عجیب حُزن آ گیا تھا۔ مجاز اپنی بربادی کا مرقع بنے ہوئے نظم پڑھے جا رہے

---

[1] اندھیری رات کا مسافر۔ قرۃ العین حیدر۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔
[2] مُغنّیٔ آتش نفس۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۶۸۸۔ (مجتبیٰ حسین)

تھے۔ اُن کی نے جس کا سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹتا تھا، بیچ میں ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی ــــــ مگر اس ٹوٹ جانے میں بھی ایک کیفیت تھی۔ ایک عظیم شکست و ریخت کا تاثر تھا۔ مجمع کی ہنسی رک گئی اور خاموشی چھا گئی۔ دفعتاً میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک طالب علم نے دوسرے سے پوچھا "یہ کون شاعر ہے۔" معلوم نہیں اُس نے کیا جواب دیا۔ کیا جانے اسے بھی معلوم رہا ہو یا نہ رہا ہو۔ میں اس سوال کے بعد کچھ اور نہیں سُن سکا۔ مجاز کی نظم بھی نہیں سُن سکا۔ زمانہ اتنا بدل گیا ہے۔ اس کا احساس مجھے اسی وقت ہوا۔ جس مجاز کے نام پر بقول عصمت چغتائی لڑکیاں قرعہ ڈالتی تھیں، جس کے نام کی قسمیں کھائی جاتی تھیں آج اسے ایک درس گاہ کی ادبی محفل میں طالب علم جانتے بھی نہیں۔"[۱]

اس کے بعد مجتبیٰ حسین کی ملاقات مجاز سے نہ ہو سکی اور وہ ہندوستان کے لئے روانہ ہو گئے۔ واپسی میں مجاز کچھ دنوں کے لئے لاہور میں بھی رُکے۔ وہاں ان کی ملاقات فیض احمد فیض سے بھی ہوئی اس سلسلہ میں مجاز کا ایک لطیفہ بہت مشہور ہے کہ لاہور کے ادیبوں اور شاعروں نے ان کی بڑی تواضع کی اور لاہور کی خوب خوب سیر کرائی۔ رخصت کرتے وقت فیض صاحب نے اُن سے پوچھا "کہیے! مجاز صاحب آپ کو لاہور پسند آیا؟" مجاز نے جواب دیا "ہاں بھئی شہر تو اچھا ہے لیکن یہاں پنجابی بہت ہیں۔" چند دنوں بعد مجاز لوٹ کر پھر لکھنؤ آ گئے اور پھر انھیں پرانی دلچسپیوں میں کھو گئے۔ ۱۹۵۲ء میں تیسرا آخری اور سب سے شدید نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا۔ اس عارضہ کی کوئی خاص وجہ تو سمجھ میں نہیں آتی، لیکن زندگی کی مسلسل ناکامیاں، مسلسل شکست اور اس پر زمانے کے پیہم نامساعد حالات کی مار، سماجی و ذاتی تباہ کاری اور تنہائی۔ غرض ان سب نے مل کر یہ شکل اختیار کی اور جب اس پر سے جوش صاحب نے ایک طویل نظم "پند نامہ برائے اصلاح مجاز" لکھی اور "آج کل" میں چھاپ دی تو اس نظم کو پڑھ کر مجاز کو سخت صدمہ ہوا۔ مجاز براہ راست ہتک اور بے عزتی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ان کی فطری کمزوری تھی۔ ممکن ہے اس سے ان کو تکلیف پہونچی ہو۔ بہرحال وہ اپنی ظریف نہ طبیعت کی بنا پر بالکل خاموش نہ رہے۔ انھوں نے دو قطعات کے ذریعہ اس طویل نظم کا جواب طنزیہ انداز میں دینے کی کوشش کی، کیونکہ جوش صاحب نے ایک نظم کشمیر کے وزیراعظم شیخ عبداللہ کی تعریف میں لکھی تھی۔ ؎

نطق رسوا دہن دریدہ ہے | یہ شنیدہ نہیں ہے دیدہ ہے
رند بدنام کو نصیحت ہے | شیخ کی شان میں قصیدہ ہے

---

[۱] مغنی آتش نوا۔ مجتبیٰ حسین۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۶۹۔ ۱۶۹

دوسرے قطعہ میں جوشؔ کی سرکاری ملازمت پر طنز ہے ؎

پیر جوشِ شباب کیا جانے — شورشِ اضطراب کیا جانے
سینۂ انقلاب چھلنی ہے — شاعرِ انقلاب کیا جانے

بقول سردار جعفری یہ ٹھیس کچھ ایسی لگی تھی کہ مجاز آخری وقت تک نہ بھلا سکا[۱]۔ نتیجہ میں دلّی کی سڑکوں کی خاک چھاننی شروع کر دی جس کا ذکر حمیدہ سالم نے بڑے پُر درد انداز میں کیا ہے:۔

"دلّی کے گلی کوچوں کی خوب خوب خاک چھانی۔ جنسی محرومی کے تماشے دلّی والوں نے خوب خوب دیکھے۔ جس انسان نے عالمِ ہوش میں کبھی بھی کوئی چھچھوری اور رکیک حرکت نہ کی تھی، وہ اب ہر لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ گھر والے ہر لمحہ اس خبر کے منتظر تھے کہ مجاز موٹر سے کچل گیا ٹھٹھرا ہوا سڑک پر پایا گیا۔ انجام یہی ہونا تھا لیکن کچھ دنوں ٹھہر کر۔ وہی ستر سالہ ماں جس نے بیٹے کے مستقبل کے نہ جانے کتنے سنہرے خواب دیکھے تھے جانماز پر بیٹھ کر دعائیں مانگی تھیں۔

"یا الٰہی! اُسے اُٹھالے یا مجھے۔ میں اس طرح کے تماشے نہ دیکھوں"۔[۲]

صفیہ اختر نے ۲۰ مارچ ۱۹۵۳ء میں بھوپال سے جاں نثار اختر کو اپنی علالت کے سلسلے سے خط لکھا تھا اس میں بھی مجاز کے دیوانہ پن کا ذکر کیا تھا:۔

"لکھنؤ سے کوئی خط نہیں آیا پریشانی ہے۔ اسرار بھائی گھر بلائے گئے ہیں دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ہر طرف پریشان کن اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اختر! کیونکر سخت بنا جائے"۔

اپریل میں دلّی سے لکھنؤ واپس آئے۔ جوشؔ صاحب سے کافی ناراض نظر آتے تھے۔ کہتے تھے۔ شاعر صرف دو ہیں۔ ایک فیضؔ دوسرا مجازؔ۔ اور جوشؔ صاحب کے خلاف دونوں قطعے جو طنزیہ ہے تھے اکثر بڑے ولولے سے سنانے لگتے تھے۔ جو جملے بار بار ادا کرتے تھے انھیں ڈاکٹر محمد حسن صاحب اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ بعد میں یہ 'نقوش' لاہور میں شائع ہوئے تھے۔

ان دنوں اُن کے منہ سے بے ربط جملے ادا ہوتے تھے جو نقوش میں شائع ہوئے تھے، جن میں بعض یہ ہیں:۔

"سویت ایمبیسی اسپیکس۔ چائینز ایمبیسی ریلیز"۔

۱۔ ہم پہ ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ۔ سردار جعفری۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۴۳۔

۲۔ جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۱۹۷۔

"(SOVIET EMBASSY SPEAKS CHINES EMBASSY RELAYS)"

"چار نوکرانیاں اور دو بیویاں میرے گرد گھوم رہی ہیں ۔ پھر دلّی جانا ہے اور پھر بھگتنا ہے انھیں"

"جہاں پناہ! ایران کا شہزادہ مراد حاضر ہے" "ناشاد' نامراد شہزادہ مراد کو حاضر کیا جائے"

"بس ہو چکے بہانے چلو تھانے" یہ شعر بھی بار بار پڑھا کرتے ۔

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے   تعریف بوئے مشک غزالوں کے سامنے

اسی حالت میں امن کانفرنس میں شرکت کے لئے کلکتہ پہونچے ۔ صفیہ اختر نے جاں نثار کو اپنے خط مورخہ ۱۲ رمئی ۱۹۵۳ء میں اس سلسلے میں لکھا ہے:۔

"اسرار بھائی کی دماغی حالت کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ کلکتہ کی سڑکوں پر بھیک مانگنے کی نوبت آگئی تھی ۔ انصار بھائی یوسف امام کو ہمراہ لے کر کل رانچی پہونچے ہیں اور کل رات ہی داخلہ کی اطلاع کا تار آیا ہے ۔ اُن کی دماغی حالت کو دیکھتے ہوئے ہوائی جہاز سے یہ سفر مکمل کرنا پڑا ۔ پورا ایک ہزار روپیہ اس سعی کاوش کی نذر ابا کا ہو چکا ہے ۔ اس ضعیفی کے عالم میں جس استقلال سے وہ ان تمام پریشانیوں کو برداشت کر رہے ہیں اس سے میرے ذہن میں ان کی عظمت کا نقش گہرا ہوتا جلا رہا ہے ۔ تم لکھنا کہ سہیل سے تمھاری کیسی واقفیت ہے اور وہ کس طرح کے آدمی ہیں ۔ اب اسرار بھائی کی دیکھ بھال کا ذریعہ انھیں کو بنایا جا سکتا ہے"۔[1]

دلّی سے جوش صاحب نے مجاز کے گھر والوں کو یہ خط لکھا کہ انھیں آگرہ کے پاگل خانے میں داخل کر دیا جائے ۔ اس کے جواب میں حمیدہ سالم نے جوش صاحب سے یہ درخواست کی کہ کسی صورت کوشش کر کے انھیں رانچی میں جگہ دلوا دیں ۔ اور بقول موصوفہ کے جوش صاحب نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ معلوم نہیں کہ جوش صاحب کو ان کا خط ملا بھی یا نہیں ۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا بہتر ہو گا کہ مجاز کے اقربا کو مجاز کے پاگل خانے جانے کا تصور بے حد تکلیف دہ اور روح فرسا محسوس ہوا ہو گا ۔ ان حالات میں ذرا سی غلط فہمی بہت بڑی شکایات اور دوری پیدا کر دیتی ہے ورنہ جوش صاحب سے بڑا مجاز کا اور مجاز کی شاعری کا مداح اور داد دینے والا مشکل سے نظر آئے گا ۔ "پند نامہ" آج بھی ایک پبلک ڈاکومنٹ ہے جو نہایت مؤثر اور پُر زور ہے ۔ جس کے بظاہر تلخ لہجے میں بھی غضب کی محبت ہے ۔ جوش صاحب نے کبھی رعب میں آکر آج تک کسی کی تعریف

---

[1] نور محل ۔ صفیہ اختر ۔

نہیں کی ہے، خواہ وہ کوئی جنرل ہو یا شاعرِ غزا، لیکن ان کے مابین جو خلوص اور محبت تھی اس کے تحت جوشؔ نے مجازؔ کی قدر شناسی کی ہے۔ ادھر بہت سارے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ جوشؔ کے نثری فن پارے اور شاعری بھی کو ان کی حکومت وقت نے اپنے سارے اشاعتی پروگرام میں یک لخت ممنوع (BAN) کر دیا ہے۔ جوشؔ کی شخصیت اور کردار کی پرکھ میں یہ بات ہرگز نظر انداز نہیں کی جا سکتی، لیکن حکومت کے ایسے رویّے سے جوشؔ کی عظمت و بصیرت رکھنے والوں کی نظر میں کم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ سوا ہوتی ہے۔ اسی طرح جوشؔ اور مجازؔ کے مابین تعلقات میں خلوص و یگانگی کی کمی یا فن کاری کے سلسلے میں قدر ناشناسی کی باتیں گھٹیا پن کی۔ معیار سے گری ہوئی اور کم دماغی کی باتیں ہیں، لہٰذا ایسے سستے پروپیگنڈے اور افواہ کی باتیں ادب کی منزلت سے گری ہوئی اور بے تہ باتوں پر محمول کی جائیں گی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ دلی معاملات کے بیچ ہزاروں گہری باتیں ہوتی ہیں۔ ع

"ہزار نکتہ دریں کاروبارِ دلداریست" (حافظ)

آخر کار خود مجازؔ کے گھر والوں نے کوشش کر کے انھیں رانچی کے مینٹل ہاسپٹل کے ایک بی کلاس کے وارڈ میں ایک بڈ دلوا دیا۔ ان دنوں رانچی اسپتال کا انچارج ڈاکٹر ڈیوس تھا۔ شاید اس نے مجازؔ کے حالات یا کیس ہسٹری سے متاثر ہو کر انھیں جگہ دے دی تھی، جیسا کہ صفیہ کے خط سے ظاہر ہے کہ ان کے چھوٹے بھائی انصار ہاروانی نے مشاعرے کے بہانے سے مجازؔ کو رانچی لے جا کر مینٹل ہاسپٹل میں داخل کرا کے خود لوٹ آئے تھے اور سہیل عظیم آبادی کے ذریعہ ان کی دیکھ بھال ہوتی رہی تھی۔ ان دنوں مشہور بنگالی شاعر نذر الاسلام بھی وہیں رانچی میں زیرِ علاج تھے۔

ایک ماہرِ نفسیات جو اُن دنوں رانچی مینٹل ہاسپٹل کسی کام سے گئے تھے، انھوں نے مجازؔ کے حالات سن کر اُن کی کیس ہسٹری کا مطالعہ کیا اور تحلیل نفسی کے عمل کے بعد جو نتائج اخذ کئے اُن کا خلاصہ یہ ہے:-

"وہ بچپن میں شرمیلی طبیعت کی بنا پر کھل کر اپنے جذبات و احساسات کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے بہت سے جذبات دب کر ان کی شخصیت کے اندر ایک مایوس انسان کو جنم دے رہے تھے۔

۲۔ خاندانی ماحول جس قسم کا ملا اس میں بھی ان کے اندر کا جذباتی طوفان دبتا رہا۔

۳۔ یہ حالت انسان میں عالمِ طفلی کی طرف واپس جانے کے میلانات کو جنم دیتی ہے۔ مجازؔ کے اندر عالمِ طفلی کی طلبیات PSYCHOLOGICAL NEEDS میں سے چاہے جانے کی

تمنا کا عنصر غالب رہنے لگا۔
وہ ایک بچے کی طرح ہر بے رخی پر سخت مایوسیوں میں مبتلا ہو جاتے۔ پسپا پر چاہے جانے کی تمنا اور احساس کمتری آپس میں دست و گریبان ہوتے ہیں اور مجاز اپنے دفاع ذہنی (DEFENCE MECHANISM.) کے لئے مختلف طریقوں سے سماجی زندگی میں برتری حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

۴۔ دفاع جب سہارا نہ دیتا تو ان کے اندر کی مسا کیت (MASOCHISM) ابھرتی اور وہ خود کو ایذا پہنچا کر لطف اندوز ہوتے۔

۵۔ جنسی جارحیت کی کمی مختلف الجھنوں کا باعث بنتی۔" [1]

رانچی اسپتال میں جنونی کیفیت میں جو چند مصرعے لکھے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا۔ ع
"فراق ہوں اور نہ جوش ہوں میں۔ مجاز ہوں سرفروش ہوں میں"

اسی دوران ان کی نظم کے دو بند بھی فلمائے گئے۔ غالباً یہ فلم "دل ناداں" تھی جس کا ذکر صفیہ اختر نے اپنے خط مورخہ ۲۵ جولائی ۵۲ء میں کیا ہے۔

"ہاں ایک کام کی اور ضروری بات بھی ہے، وہ یہ کہ پریم دھون کا خط اسرار بھائی کے نام آیا تھا جس کا ایک صفحہ ہی رہ گیا ہے۔ دوسرا صفحہ حامد اور سلمان نے غائب کر دیا ہے۔ بال چھابڑا (ڈائرکٹر پروگریسیو پکچرس) نے آوارہ کے دو بند ریکارڈ کر لئے ہیں اور اپنی تصویر میں استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے لئے اتھارٹی چاہتے ہیں۔ اتھارٹی سلپ میں نے رانچی بھیج دی ہے۔ ڈاکٹر کو لکھ دو کہ وہ اسرار بھائی کے دستخط کرا کر بھیج دے۔ اس میں یہی لکھا ہے کہ جو شرائط جان نثار اختر کو منظور ہیں اس پر دو بند ریکارڈ کئے جا سکتے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ پریم دھون نے لکھا ہے کہ سو روپے دے جائیں گے۔ تم چھابڑا سے ملو اور کوشش کرو کہ کم سے کم دو سو تو دے دیں ورنہ فائدہ بھی کیا۔" [2]

صفیہ اختر کے ۲۷ ستمبر ۵۲ء کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ مجاز کے اس سلسلے سے منی آرڈر سے وہ رقم وصول ہو گئی تھی اور انہیں دنوں مجاز فنڈ کی تجویز پرکاش پنڈت نے رکھی تھی لیکن یہ بات ان کے گھر والوں کو پسند نہیں آئی۔ اور انھوں نے اسے اپنی غیور طبیعت کے منافی سمجھا اور ساتھ ہی

---

[1] مجاز حیات و شاعری۔ منظر سلیم۔ صفحہ ۷۴۔ ۷۵۔ ان کاغذات میں ایسے اشعار بھی ہیں جن میں تو بہ کے عشق کی بازگشت ہے سے کیا قیامت ہے کہ اک دوست رقیب آج بھی ہے۔ ع وہ در گیت از خیال دشت گھی گھی سمجھا حرام میری

[2] زیر لب۔ صفیہ اختر۔

اس کو شاہ راہ والوں کا سستی شہرت کمانے کا طریقہ گردانا۔ جس کا اظہار صفیہ اختر نے ۳ر نومبر کو جو خط جاں نثار اختر کو لکھا تھا اس میں کیا ہے۔

"پرکاش کا خط آیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ مجاز فنڈ کی اپیل شائع کرنے کی اجازت اس نے تم سے کلکتہ میں حاصل کر لی تھی۔ دلچسپ بات ہے۔ میں نے خط لکھوا دیا ہے کہ مجھے اختر کی غیور طبیعت پر اس درجہ اعتماد ہے کہ یقین نہیں آتا کہ انھوں نے مجاز کے جنون اور بے زری کا ڈھنڈورا دو سالے کے ذریعے پیٹ کر پڑھنے والوں سے دو دو چار چار روپیوں کا چندہ وصول کرنے کا مشورہ دیا ہو۔ اختر تم جانتے ہو اسرار بھائی کو آٹھ مہینے کے لگ بھگ ہو گئے ہیں۔ ایک ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر وہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے والے ہیں۔ اب اسی ایک مہینہ کے لئے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے کیا فائدہ حاصل؟ شاہ راہ والے اپنے سر سہرا باندھنا چاہتے ہیں لیکن مجاز فنڈ کا حشر تو سنو کہ مجاز کے نام پر یہاں پچھلے مہینے صرف سوا ستر روپے جمع ہو سکے اس سے اُردو والوں کی ادب دوستی کا اندازہ کر لو۔" [1]

رانچی میں تقریباً دس ماہ زیر علاج رہ کر صحت یاب ہو کر گھر لوٹے۔ سہیل عظیم آبادی ان دنوں رانچی میں تھے اور انھوں نے مجاز کی تیمار داری بھی کی تھی۔ لکھنؤ آنے کے بعد آل احمد سرور صاحب کے گھر ان سے ملنے گئے تو کہنے لگے کہ "سرور صاحب! رانچی میں ایک ریسرچ کی ہے۔ شراب سے نشہ نہیں ہوتا۔ آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔"

ان کی واپسی کے چند دنوں بعد ان کی بہن صفیہ اختر کا انتقال ہو گیا جس نے انھیں بہت گہرا صدمہ پہنچایا اور مجاز کو ایک بار پھر اپنے ذمے داریوں کا احساس ہوا۔ ان کا کام دن بھر صفیہ کے بچوں سے دلچسپی لینا، ان کی دل جوئی کرنا تھا۔ حمیدہ سالم لکھتی ہیں:

"زیادہ تر وقت گھر پر گذارنا۔ شراب سے قطعی پرہیز۔ رات کو جی بھر کے سوتے۔ دن میں ہنستے کھیلتے۔ باتیں کرتے۔ گھنٹوں سب کے ساتھ تاش کھیلا کرتے۔ بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ تصویریں بنا بنا کر سب میں بانٹتے۔ چھوٹے بچوں کو ایک دوسرے سے لڑواتے۔ ایسا لگتا جیسے جاد، اویس، عشو، عرفی کے بچپن میں میرا بچپن دُہرا رہا ہو۔" [2]

ایسا لگتا ہے کہ مجاز ان دنوں بالکل سنبھلے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پھر

---

[1] زیر لب۔ صفیہ اختر [2] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۹۸۔

پچیس سال پہلے والے مجاز بن گئے ہوں، لیکن برا ہو اس سماج کا جس سے ان کا اس حال میں ہنا دیکھا نہ گیا۔ لوگوں کو ان کے بغیر اپنی محفلیں، نشستیں سونی، بے مزہ اور پھیکی لگنے لگیں اور ان کے نادان دوستوں نے آخر کار مجاز کو پھر اسی خطرناک راستے کی طرف گامزن ہونے پر مجبور کر دیا۔ مجاز نے اس بار شراب شروع کی تو کثرتِ نوشی اور زیادہ بڑھ گئی۔ شاید اتنے دنوں تک نہ پینے کا ردِ عمل تھا، یا اپنے غموں، زمانے کے دئے ہوئے دکھوں کو غرقِ مے ناب کر دینے کی خواہش بہرحال ان دنوں ان کی حالت بڑی افسوسناک تھی۔ وہ خود دار اور غیور شخص جس نے اپنی خواہش کا اظہار کسی کے آگے نہ کیا ہو۔ شراب کے لئے اکثر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے دیکھا گیا۔ رضا صاحب فرنگی محل کا کہنا ہے کہ اکثر وہ شراب کے نشے میں رات گئے ان کے گھر آ جاتے اور بغیر کسی کو کسی قسم کی تکلیف دئے رات گذار کر صبح واپس چلے جاتے۔ اس سلسلے میں ایک رات کا ذکر رضا صاحب نے کیا ہے:

"مجاز بے حد نشے میں ڈوبے رات کو تقریباً ایک یا دو بجے میرے گھر آئے۔ رات میں کسی کو تکلیف نہ دینے کے خیال سے باہری چھت کے ننگے فرش پر لیٹ کر سو گئے۔ صبح کو میرے گھر کے کسی فرد نے انھیں لیٹا دیکھا تو مجھے اطلاع دی، میں نے جا کر مجاز کو اٹھایا۔ مجھے سخت صدمہ ہوا کہ مجاز نے رات یوں گذار دی۔"[۱]

ان دنوں ان کا معمول سا ہو گیا تھا کہ گھر وہ دو تین بجے رات سے پہلے نہیں جاتے تھے۔ ان کی ماں رکشے کے لئے کرایہ، کھانا اور سگریٹ ان کے کمرے میں رکھ دیتی تھیں تاکہ مجاز کو لوٹنے کے بعد پریشانی نہ ہو۔ اکثر وہ بیہوش ہوتے اور رکشے والا انھیں لا کر کمرے میں پہونچا جاتا۔ اگر وہ ہوش میں ہوتے تو کھانا وغیرہ کھا لیتے ورنہ صبح میں کھاتے۔ صبح کو ان کی ماں اکثر ان کی رات کی کیفیت کا احساس دلانے کی کوشش کرتیں تاکہ وہ ایسا نہ کریں، لیکن اب وہ اس اسٹیج پر پہونچ گئے تھے جہاں سے لوٹ کر جانا بے حد مشکل تھا۔ آخر کار دن کی بیکاری۔ رات کی شراب نوشی۔ دوستوں کی بے التفاتی۔ رفیقوں کی بے اعتنائی اور زہرہ جبینوں کی بے وفائی اور سرد مہری نے مجاز کو وقت سے پہلے ختم کر دیا۔

مجاز جیسے ذہین اور حساس شاعر کو زندگی بھر اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا احساس

---

[۱] رضا صاحب انصاری سے دوران گفتگو معلوم ہوئی۔ یہ گفتگو ٹیپ ریکارڈ ہے۔

رہا اور اسی احساس نے اس کی زندگی میں گھُن لگا دیا، لیکن اس کا فن اس احساسِ شکست کے باوجود شکستہ نہیں ہو سکا۔ اس کی روحانی بلندیوں کو ناساز گار زمانے کے تھپیڑے بھی نہ روک سکے۔ اس کا احساس خود مجاز کو تھا۔ ؎

بہ ایں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

اور اس طرح اس کا فن پُر درد ہو کر اور بھی با اثر ہو گیا۔ شیلی کی زبان میں:

WE LOOK BEFORE AND AFTER
AND PINE FOR WHAT IS NOT
OUR SWEETEST SONGS ARE THOSL
WHAT TELL OF SADDEST THOUGHT

شامِ غریبانِ لکھنؤ
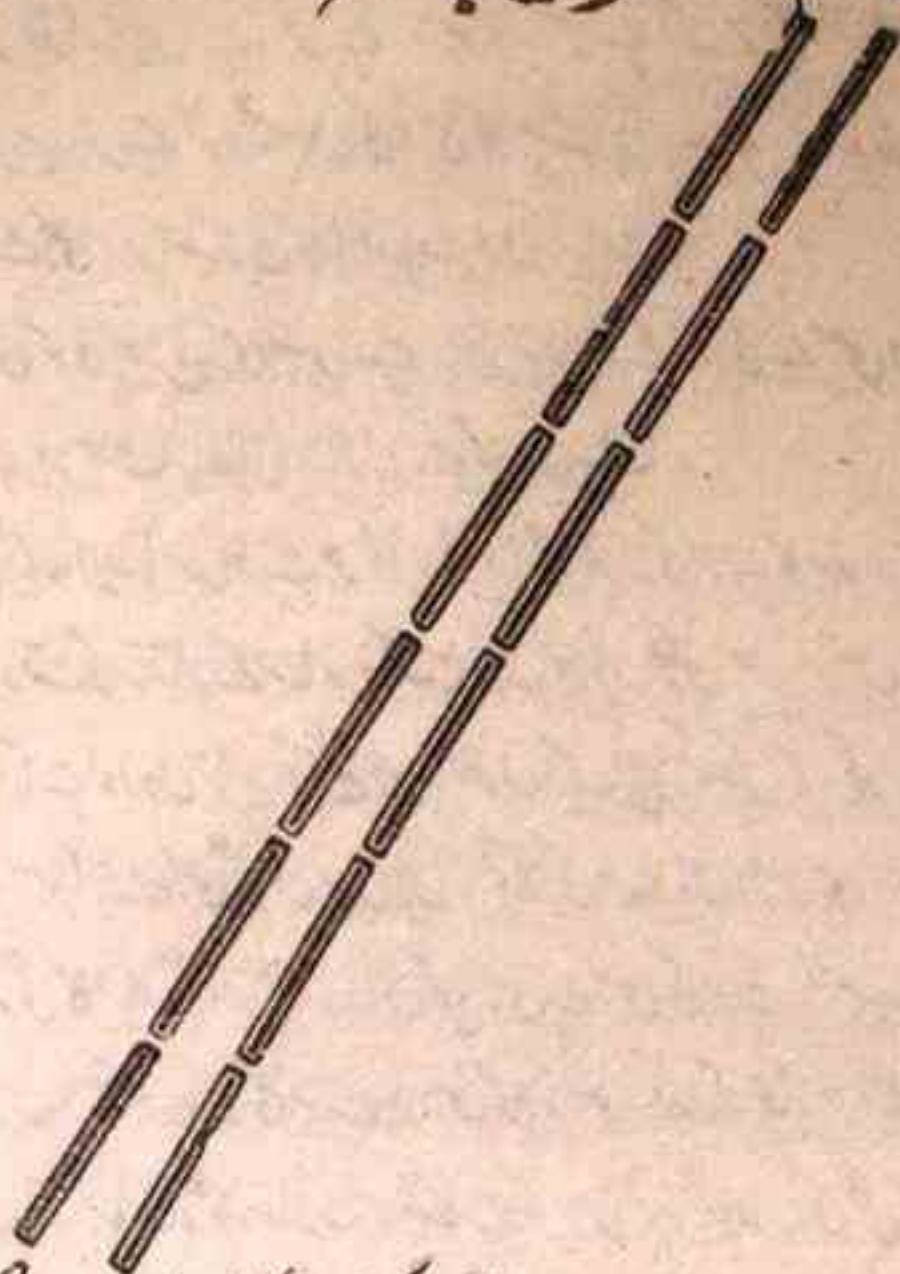
وقت کی سعئ مسلسل کارگر ہوتی گئی
زندگی لحظہ بہ لحظہ مختصر ہوتی گئی
سانس کے پردوں میں بجتا ہی رہا سازِ حیات
موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی

مجاز

شامِ غریبانِ لکھنؤ

"ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں"

دُنیا اور اُس کی ہر شے فانی ہے۔ جو آج ہے وہ کل نہیں رہے گا۔ اور جو کل تھا وہ آج نہیں ہے۔ بقول اقبال ؎

جو تھا۔ نہیں ہے۔ جو ہے۔ نہ ہوگا۔ یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اُسی کا مشتاق ہے زمانہ

برنارڈ شا نے بھی اس حقیقت کا اعتراف یوں کیا ہے:

"اس دُنیا کی کوئی چیز ابدی نہیں ہے۔ بغیر تبدیلی کے زندگی بے معنی و بے مصرف ہے اور حقیقی تبدیلی وہی ہے جو ہمیشہ ارتقائی منازل سے گذرتی ہے۔"

انسان بھی ایک ایسا مسافر ہے جو لمحہ بہ لمحہ فنا کی منزل کی طرف گام زن ہے۔ نہ جانے کتنی عظیم ہستیاں اس وقت کی رفتار کے ساتھ خاک میں مل گئی ہیں لیکن بعض موتیں ایسی ہوتی ہیں، جن پر زمانہ آنسو بہاتا ہے اور دل تڑپ اُٹھتے ہیں۔ بقول ایک چینی مفکّر کے۔ کچھ موتیں پروں کی طرح ہلکی پھلکی لیکن "تائی" "پہاڑ سے بھی گراں ہوتی ہیں"۔ مجاز کی موت بھی ایسی ہی اندوہناک موت تھی۔ شاید اُن کی اپنی زندگی کامیاب گذرتی اور اُن کو ایسی بے بسی کی موت نہ نصیب ہوتی تو خواہ وہ اسی عمر میں مرتے۔ ہر کس و ناکس ان کی موت پر اس طرح آنسو نہ بہاتا۔ مجاز جو شاعرِ شہرِ نگاراں تھا اور مطربِ بزمِ دلبراں تھا، ناساز گار حالات کا شکار ہو کر اس شہرِ نگاراں کی گلی کوچوں میں آوارہ بن کر گھومتا رہا اور آخر کار لال باغ کے ایک چھوٹے سے شراب خانے میں سسک سسک کر جاں بلب ہو گیا۔ اور ۵ ر دسمبر ۵۵ء کو بلرام پور ہسپتال کے جنرل وارڈ میں اس کی حسرتیں اور تمنائیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں۔ لوگ ان کی موت کا باعث کثرتِ شراب نوشی قرار دیتے ہیں ہیں لیکن حقیقت پوچھئے تو قاضی عبدالغفار صاحب کی رائے سے مجھے بھی کسی حد تک اتفاق ہے:-

"سطحی نظر سے مرحوم کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ شراب نوشی کی کثرت نے اُن کی زندگی کو ختم کر دیا لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ وہ کیوں اتنے بڑے شرابی بن گئے، وہ حالات کیا تھے جن کے درد و کرب نے اُنھیں میخانے کی طرف ڈھکیلا اور وہ حالات نہ ہوتے تو مجاز کیا ہوتے؟" [1]

---

[1] قاضی عبدالستار کے تاثرات ۔ مجاز ایک آہنگ ۔ صفحہ ۱۹۷ ۔

وہ مجاز جس کی دُنیا حسن و عشق کی دنیا تھی۔ اُس کے سفینے کو خود اُس کے حسین ناخداؤں نے ڈبادیا۔ یہ روایتی دنیا مُردہ پرست ہے۔ یہاں انسانوں کی زندگی کو بچانے کی تدبیریں نہیں کی جاتیں بلکہ مرجانے کے بعد ماتم کرلینے کو ہی انسان دوستی کی سب سے بڑی معراج سمجھا جاتا ہے۔

اس کو بے مہریٔ عالم کا صلہ کہتے ہیں
مرگئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

مرنے کے بعد مجاز کو جس قدر خراجِ عقیدت پیش کیا گیا، شاید وہ بھی غیر محسوس پشیمانی کا جذبہ تھا یا عدم میں اُسے چین نصیب ہوجانے کی خواہش۔

مجاز خاموش ہوگیا ہے لیکن اُس کے نغمے خاموش نہیں ہوں گے۔ یہ آنے والے زمانے میں نئے نئے دلوں کے تاروں کو مرتعش کریں گے۔ نئے نئے شاعروں کو متاثر کریں گے اور جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے اسی طرح نغمے سے نغمہ پیدا ہوگا۔

"جاؤ مجاز آرام سے سوؤ۔ تمھیں مدتوں کے بعد چین اور قرار مل گیا لیکن تمھاری یاد ہمارے دلوں کو ہمیشہ بے چین اور ہماری روح کو ہمیشہ بے قرار رکھے گی۔

زندگی رُکتی نہیں ہے لیکن فطرت کسی چیز کو دُہراتی بھی نہیں، ایک سے ایک اچھا شاعر پیدا ہوگا۔ ایک سے ایک اچھا نغمہ اپنی ترنم ریزی سے روح میں بالیدگی پیدا کرے گا لیکن تمھاری طرح کوئی گیت نہیں گائے گا۔" [1]

بہرکیف مشکل سے ایسی ہستیاں جنم لیتی ہیں۔ بقول میر ؎

مت سہل ہمیں جانو۔ پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

قدرت کے اتفاقات دیکھیے کہ مجاز کے پرانے دوست اور ساتھی، ادیب اور شاعر دو روز قبل سے اُردو کنونشن میں شرکت کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے، کسے معلوم تھا کہ اس بہانے مجاز کو آخری خراجِ عقیدت پیش کرنے آئے تھے۔ اُن میں ڈاکٹر علیم، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، ساحر لدھیانوی، ڈاکٹر محمد حسن، حیات اللہ انصاری، نیاز حیدر وغیرہ شامل تھے۔ جب ان حضرات

---

[1] سخن بر دوش۔ سردار جعفری۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۶۳۲

کی ملاقات مجاز سے ہوئی تو علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی اور عصمت چغتائی نے یہ طے کیا کہ اب وہ تین دن تک مجاز کو ان کے لکھنؤ کے دوستوں سے بچائے رکھیں گے۔ مجاز کی ملاقات سردار جعفری سے اتفاقاً حضرت گنج میں ہوئی۔ مجاز بڑے تپاک سے ملے اور کہنے لگے ؎

ہمدم یہی ہے رہ گذرِ یارِ خوش خرام
گذرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

علی سردار جعفری نے ادبی کانفرنس میں جو قیصر باغ کی بارہ دری میں ہوئی تھی مجاز کو شرکت کے دوران ہمہ وقت اپنے ساتھ ہی رکھا۔ لکھنؤ کے دوستوں نے وہاں بھی ان کو گھیرنے کی لاکھ کوشش کی، لیکن ان لوگوں نے انھیں جانے نہیں دیا۔

۳ر دسمبر کی رات کو مشاعرہ ہوا اور شراب کا دور چلا۔ لیکن مجاز نے بڑی سنجیدگی کا ثبوت دیا۔ شراب بھی کثرت سے نہیں پی اور یکے بعد دیگرے کئی نظمیں لہک لہک کر سنائیں۔ خوبیا ایک غزل کے دو شعر بار بار پڑھے۔ ؎

بڑی مشکل ہے دُنیا کا سنورنا — تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
یہ اپنی سیلِ غم و سیلِ حوادث — مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

علی سردار لکھتے ہیں ''شعر کی خوبی کے علاوہ مجاز کے حالات کے پیش نظر آخری مصرع کی بہت داد ملی۔ اگر وہ صبح تک سناتا رہتا تو بھی لوگ سنتے رہتے''[1]

۴ر دسمبر کو مجاز علی سردار جعفری اور ساحر کے ساتھ ہوٹل میں رہے۔ ساحر نے اس کے لئے نفیس وہسکی کی بوتل خرید دی تھی۔ مجاز سے وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ دن میں نہیں پیئے گا اور شام کو لکھنؤ کے دوستوں کے ساتھ باہر نہیں جائے گا اور خود اس کے مشورہ سے بوتل الماری میں بند کردی گئی تاکہ دن میں طبیعت خراب نہ ہو۔ وہ بڑی دیر تک محبت پیار کی باتیں کرتا رہا۔ پھر رات کی بات دُہرائی۔ زیادہ وقت میرے ساتھ گذارنا تھا۔ جانے کب ملاقات ہو۔[2]

یہ لوگ مجاز کو کمرے میں سوتا ہوا چھوڑ کر کانفرنس میں شرکت کے لئے چلے گئے۔ لوٹنے میں کچھ دیر ہوگئی اور مجاز اس دوران وہاں سے جا چکے تھے۔ ۹ بجے رات کو لکھنؤ کے کچھ ادیبوں سے جن میں نسیم انہونوی اور سلامت علی مہدی شامل تھے انھوں نے مزید شراب کے لئے پیسے مانگے۔

---

[1] ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۲۵ (سردار جعفری)

۴ر دسمبر کی رات کو ۹½ بجے میں نسیم انہونوی کے ہمراہ ان کے مکان جارہا تھا کہ امین آباد میں دیسی شراب خانے کے بہت قریب مجاز مرحوم اپنے ایک دوست کے ہمراہ انتہائی نشے کی حالت میں ہمیں ملے۔ نسیم صاحب کو دیکھ کر اُن سے لپٹ گئے اور اُن سے پانچ روپے طلب کرنے لگے، تاکہ وہ اور شراب پیئیں۔[1]

اسی وقفہ میں مجاز کے لکھنؤ کے وہ دوست مل گئے، جو اُن کی تلاش میں تھے اور لال باغ کے ایک دیسی شراب خانے میں تین بجے رات تک شراب کا دور چلتا رہا اور آخر کار ایک ایک کر کے سارے نا سمجھ دوست مجاز کو وہیں شراب کے نشے کی حالت میں کھلی چھت پر چھوڑ کر چلے گئے۔ شراب خانہ بھی بند ہو گیا، اور پوری رات اسی کھلی چھت پر اتنی شدید ٹھنڈ کے موسم میں پڑے رہنے کے باعث مجاز کو ڈبل نمونیا اور برین ہیمبرج دونوں ہو گیا۔ ۵ر دسمبر کو دن میں شراب خانے والوں نے اُنھیں چھت پر بے ہوش پڑا پایا۔ فوراً ایک ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا۔ اس نے ڈبل نمونیہ تجویز کیا۔ اور مجاز فوراً بلرام پور اسپتال پہنچا دیے گئے۔ یہاں بھی ڈاکٹروں نے ڈبل نمونیہ ہی تجویز کر کے پنسلین کے انجکشن دینا شروع کر دیے۔ شام کے قریب بلرام پور اسپتال کے انچارج ڈاکٹر ڈی۔ این۔ شرما نے دیکھ کر تشخیص کیا کہ داہنے حصۂ جسم پر فالج کا اثر ہو گیا ہے اور ساتھ ہی دماغ کی رگیں پھٹ گئی ہیں۔ اس وقت تک کسی کو علم نہ تھا کہ یہ شخص کون ہے؟ اتفاقاً ردولی کی ایک لڑکی اپنی ماں کے ساتھ بلرام پور اسپتال گئی ہوئی تھی اُس نے انھیں دیکھ کر فوراً پہچانا اور ان کے بھائی فرید الحق صاحب کو ٹیلیفون کیا۔ وہ چپراسی کے ساتھ اسپتال پہونچے تو مجاز کو ہوش بالکل نہ تھا۔ انھوں نے اسی چپراسی کے ذریعہ گھر "دار السراج" اطلاع کرائی۔ والدین اسپتال پہونچے تو ڈاکٹر جواب دے چکے تھے اُنھیں آکسیجن دی جا رہی تھی۔ شام کو اُردو کانفرنس میں بھی یہ خبر پہونچی۔ اور شاعر اور ادیب کانفرنس ملتوی کر کے فوراً اسپتال پہونچے۔ اس وقت سجاد ظہیر، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، سید احتشام حسین اور علی سردار جعفری وغیرہ اور دوسرے بے شمار ادیب و شاعر موجود تھے۔ آخر کار دس بج کر بائیس منٹ پر موت کے ہاتھوں نے مجاز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے چھین لیا۔ ہر فرد پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ ہر شخص ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کر رہا تھا، لیکن خود اپنے آنسوؤں پر کسی کو اختیار نہیں تھا۔ تمام لوگ مجاز کی میت کو اسپتال سے گھر

---

[1] سلامت علی مہدی کے تاثرات۔ مجاز ایک آہنگ۔ ۴۳۱

لے کر آتے۔ اُن کی ماں جو اس بات کی عادی تھیں کہ مجاز اکثر و بیشتر راتوں کو دیر سے لوٹتے اور وہ ان کے لیے میز پر کھانا، قینچی سگرٹ کی ڈبیہ اور اٹھنی رکھ دیتی تھیں تاکہ مجاز کسی عالم میں آئے تو اُسے تکلیف نہ ہو۔

"آج جب ہم اُس کی لاش لے کر گھر پہونچے تو چارپائی کا رخ بدلا ہوا تھا۔ سرہانے میز پر کھانا نہیں تھا۔ تکیہ کے پاس قینچی سگرٹ کی ڈبیہ اور اٹھنی بھی نہیں تھی۔ پلنگ کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی بوڑھی ماں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ برسوں کا کھویا ہوا اُس کا بیٹا گھر واپس آگیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے!" [1]

۶ دسمبر کی صبح کو ہندوستان کے سبھی ہندی، اردو اور انگریزی اخباروں کے ذریعہ یہ دلخراش خبر تمام ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ عوام کا مقبول و محبوب جواں سال شاعر مجاز چل بسا۔ قومی آواز میں یہ خبر یوں چھپی :۔

"اردو کے مقبول شاعر اسرار الحق مجاز کا انتقال ہو گیا۔ 'ہم پر ہے ختم شام غریبانِ لکھنؤ' کی طرف اشارہ کرنے والا اردو کا ممتاز شاعر آج دس بج کر بائیس منٹ پر آخری ہچکی لے کر ختم ہو گیا۔"

اردو کا مقبول اور نوجوانوں کا محبوب اور ادیبوں کا منظورِ نظر شاعر اسرار الحق مجاز بلرام پور اسپتال میں موت و زیست کی آخری کش مکش کے بعد بالآخر آرام کی نیند سو گیا۔" یہ وہ دل خراش خبر تھی جسے سُن کر لوگ مجاز کی قیام گاہ "دارالسراج نیو حیدر آباد" کی طرف دوڑ پڑے۔ کان پور، بارہ بنکی، رودولی، فیض آباد اور دیگر قرب و جوار کے علاقوں سے مجاز کے عزیز و اقارب، دوست اور پرستار سب اکٹھا ہو گئے۔ دوپہر تک مجاز کی کوٹھی پر ہزاروں کا ہجوم تھا جس میں سبھی مذہب و ملت کے لوگ اُس کی ناوقت اور اچانک موت پر ماتم کر رہے تھے۔

نیاز حیدر نے کسی قدر ضبط سے کام لیتے ہوئے مجاز کو آخری غسل خود اپنے ہاتھوں سے دیا۔ غسل کے بعد کفن میں لپیٹ کر باہر لایا گیا۔ لوگ آنکھوں میں آنسو بھرے مجاز کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ مجاز جو روز ہنستا اور لہکتا ہوا اسی گھر سے اپنے مخصوص انداز میں سیر و تفریح کے لئے نکلتا تھا، آج بے دست و پا مجبور تھا۔ اسی وقت مجاز کے بھتیجا سعید اختر نعمانی [2] دو روز قبل اردو کنونشن میں مجاز کو اچھا خاصا چھوڑ کر گیا تھا، کان پور سے بھاگا ہوا آیا اور مجاز کے

---

[1] ہم پر ہے ختم شام غریبان لکھنؤ۔ سردار جعفری۔ بی: ایک آہنگ ۲۲۶۔

جنازے کے پاس کھڑے ہو کر بے اختیارانہ بلند آواز سے رونے لگا۔ ضبط کے سارے بندھن ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔ نیاز حیدر نے بڑھ کر اسے سمجھایا۔ ظہر کی نماز کے وقت تقریباً دو بجے مجاز کا جنازہ اپنی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ آہ و فغاں، گریہ و نالہ کرنے والوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس قیامت صغریٰ میں سبھی شریک تھے۔ اس سے قبل لکھنؤ میں کسی شاعر کی موت پر اس طرح سوگ نہیں منایا گیا۔

"جب لوگ اس گنجہائے گرانمایہ کو اپنے دوش پر لے کر چلے تو میری آنکھوں نے چاروں طرف ڈھونڈا۔ اختر شیرانی کے جنازے میں شرکت کرنے کے لئے اس کی برقعہ پوش سلمیٰ آگئی تھی۔ یہاں کوئی نہیں آیا اس کے خوابوں کی حسین شہزادیوں میں سے کوئی اسے الوداع کہنے نہیں آیا۔ اس قبرستان میں اتنے رونے والے شاید کبھی نہ جمع ہوئے ہوں گے، مگر اتنا بڑا شاعر نگاراں بھی یہاں کبھی نہ آیا ہوگا۔"[1]

"ایسی صورتِ حال تھی کہ ہر شخص کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔ وہ شخص جسے زندگی کے سفر میں کسی نے سہارا نہیں دیا۔ آج دوسروں کے کاندھوں پر سوار اپنی آخری منزل کی طرف جارہا تھا۔ سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مجاز کے بھانجے ابوالمعروف و نعمانی وغیرہ نے جنازے کو اٹھایا۔ جنازہ آہ و بکا کے ساتھ شہر نگاراں سے شہر غریباں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ کافی تعداد میں غم سے بوجھل لوگ جنھیں خود اپنا ہوش نہیں تھا، جنازے کے ساتھ ساتھ تھے۔ نیاز حیدر کی کیفیت سب سے دگرگوں تھی۔ آنسو تھے کہ بہے جارہے تھے۔ چارپائی کا ایک پایہ مسلسل کاندھے پر تھا۔ اس کو بدلنے نہیں دیتے تھے۔ نشاط گنج کی مسجد کے پاس نماز جنازہ ادا ہوئی اور اس میں بکثرت لوگوں نے شرکت کی۔ یہاں تک کہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی صفوں میں کھڑے اس کی روح کو خراجِ عقیدت پیش کرتے نظر آرہے تھے۔"[2]

یہ سوچ کر کہ ابھی چند لمحوں کے بعد مجاز ہماری نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جائے گا مجاز کے پرستاروں اور دوستوں کو ایک بار پھر اسے دیکھ لینے کی اجازت دی گئی۔ ساحر لدھیانوی، ڈاکٹر محمد حسن، سجاد ظہیر، نیاز حیدر کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہوگئے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم، حیات اللہ انصاری، احتشام حسین بھی آبدیدہ نگاہوں سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ علی سردار جعفری کی حالت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ ان کے دل پر

---

[1] احمد جمال پاشا۔ قومی آواز۔ دسمبر ۱۹۵۶ء مجاز نمبر۔ [2] مجاز ایک آہنگ، مجاز کا آخری سفر صفحہ ۴۳ سے ۵۶ تک۔

اتنا شدید صدمہ ہوا تھا کہ وہ دیدار کی تاب نہ لاسکتے تھے۔ لوگ اُنھیں آخری دیدار کے لئے قریب لائے تو آتے ہی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ آخر سب کو علٰحدہ کیا گیا اور مسجد کے پاس سے جنازہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ پھر ایک کہرام کا عالم بپا ہوا۔ اس بار ڈاکٹر عبدالعلیم، نوالحسن ہاشمی سجاد ظہیر اور احتشام حسین صاحبان جنازے کو اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے تھے۔ آخر کار جنازہ اپنی اس منزل پر پہنچ گیا جہاں پہنچ کر راہی کبھی لوٹ کر آیا نہیں کرتے۔ سفر ختم ہوا۔ جنازہ قبر سے لگا کر رکھ دیا گیا۔ چہرہ کھول دیا گیا۔ بوڑھے باپ کو آخری دیدار کے لئے سہارا دیتے ہوئے لایا گیا۔ بوڑھا باپ جس کا دل و دماغ اس شدید صدمہ سے ماؤف سا ہو گیا تھا۔ بیٹے کے آخری دیدار کو برداشت نہ کر سکا۔ قریب تھا کہ غش کھا کر گر پڑتا اُسے ہٹا لیا گیا۔ نیاز حیدر اور دوسرے لوگ اُنھیں قبر سے دور ہٹا لے گئے۔ پھر چند لمحوں بعد مجاز کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ دو دن پہلے کی زندہ حقیقت اب مٹی کا ڈھیر بن چکی تھی، جس پر پھولوں کی ایک چادر پڑی تھی۔ ؎

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

مجاز دُنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اودھ کی شاموں کا طلسم ٹوٹ گیا اور اس نے غم کا لبادہ اوڑھ لیا۔ عروسِ صبحِ بنارس نے بیوگی کا لباس پہنا۔ علی گڈھ کی محفلیں سونی ہو گئیں۔ دلی کے کوچے اوراقِ مصور سے خالی ہو گئے۔ حضرت گنج اور امین آباد کی شاہراہیں مجاز کے بغیر ویران نظر آنے لگیں۔ کافی ہاؤس کی رونق ختم ہو گئی۔ مجاز کیا ختم ہوا۔ ایک دور ختم ہو گیا۔ شاید مجاز نے اسی دن کے لئے کہا تھا۔ ؎

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

اور یہی شعر آج مجاز کی قبر کے کتبے پر کندہ ہے۔[1]

۷ دسمبر کی شام کو رفاہِ عام کلب میں تعزیتی جلسہ ہوا جس میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی اور حیات اللہ انصاری، علی سردار جعفری، پنشپال، سجاد ظہیر اور عصمت چغتائی نے تقریریں بھی کیں۔ جلسۂ تعزیت کا آغاز مجاز مرحوم کی ایک غزل سے ہوا جس کو حسن عابد نے ترنم سے پڑھا۔ منظر سلیم،

---

[1] مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۵۵-۵۶

مظفر شاہجہاں پوری، عارف نقوی، فیصل تمکین، سراج لکھنوی نے اپنی نظموں کے ذریعے ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مجاز کے نوعمر بھانجے جاوید نے مجاز کی آخری غزل انھیں کی مخصوص دھن میں سنا کر لوگوں کے غمگین دل اور بھی مضطرب ہو اُٹھے۔ اس کے بعد حیات اللہ انصاری، سجاد ظہیر علی سردار جعفری، عصمت چغتائی اور یشپال وغیرہ نے تقریریں کیں۔

"مجاز وہ جواں شاعر تھا جو دو سال کے اندر اردو ادب پر چھا گیا اور اس نے ایک ہل چل مچادی۔ اس کی بعض نظمیں لاثانی ہیں۔ اُس کی نظم "آوارہ" کو ادب اُردو میں وہی جگہ نصیب ہوگی جو دیوانِ غالب کو حاصل ہے۔" [1] (حیات اللہ انصاری)

علی سردار جعفری جن سے مجاز کے ۲۳ سالہ تعلقات تھے، جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو ان پر اس قدر رقت طاری تھی کہ الفاظ سے پہلے آنسو پیش قدمی کرتے تھے۔ مجاز میرا عزیز دوست اور محبوب شاعر ______ کے الفاظ ادا کرکے وہ زار زار رونے لگے ......

نہایت ضبط کے بعد جعفری صاحب نے فرمایا:

"ابھی ایک شاعر نے مجاز کے بارے میں کہا تھا کہ "تاریکی سے لڑتے لڑتے ایک ستارہ ٹوٹ گیا۔ مجاز ہمیشہ تاریکی سے لڑتا رہا۔ اور آج بھی جب کہ وہ ہم میں نہیں ہے تاریکی سے لڑ رہا ہے۔" [2]

اپنی تقریر کے درمیان علی سردار جعفری نے کہا کہ "سماج سے لڑنے کے مختلف حربے ہوتے ہیں۔ دیکھنے والوں کو کبھی کبھی اس لئے دھوکہ ہو جاتا ہے، لیکن مجاز ایسا حساس شاعر اپنے نغموں کے ذریعہ سماج سے لڑ سکتا تھا۔ اس سے زیادہ اس سے مطالبہ کرنا غلط ہے۔" [3]

اردو کا اتنا بڑا شاعر اسپتال کے جنرل وارڈ میں پڑا رہے اور تیمار داری کرنے والی نرس تک جس کی زبان اردو اور ہندی تھی جو مجاز کی شاعری کی زبان تھی۔ اس حقیقت سے بے خبر ہو کر اس کا مریض کس رتبہ کا ہے۔ سماج کے لئے بے حد افسوس ناک سانحہ ہے۔ مجاز کی موت نے مجھے چیکوسلاویکیہ کے ایک شاعر ماخا کی یاد دلا دی جس کی لاش مرنے کے بعد تین دن تک پڑی رہی سو سال بعد جب اُس ملک کے سماجی شعور میں تبدیلی ہوئی تو شاعر کی پوری قبر کو اُٹھا کر اس جگہ

---

[1] قومی آواز ۸ر دسمبر۔ از حیات اللہ انصاری کی تقریر کا اقتباس۔

[2] و [3] ایضاً ایضاً (علی سردار جعفری کی تقریر کا اقتباس)

دفن کیا گیا جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہو سکتی ہے۔ مجاز کی قبر کے لئے کب وہ وقت آئے گا، ابھی نہیں کہا جا سکتا۔ مگر یہ وقت آکر رہے گا۔[۱] (سردار جعفری)

ہندی کے ادیب یشپال نے اپنی تقریر کے درمیان کہا کہ "وہ ہمیشہ دریا کے لہر کی طرح مجھ پر چھایا جا رہا ہے۔ میری خواہش اور تمنا ہے کہ مجاز نے زندگی کو جو رس دئے ہیں اور جس رس کے بہانے میں بڑا کام کیا ہے وہ رس کبھی نہ سوکھے۔"

عصمت چغتائی جن کو مجاز سے کافی انسیت تھی اور اُن کے تعلقات مجاز کے گھر والوں سے بھی تھے جنھیں مجاز عصمت آپا کہتے اور ان کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، اپنی تقریر کے درمیان مجاز کی ناوقت اور ناشاد موت پر اپنے جذبات ان الفاظ میں پیش کئے ہیں :-

"مجاز کو جب میں نے دیکھا تو وہ نوجوان لڑکیوں میں ایسا مقبول تھا کہ بہت سی لڑکیاں اس کی رفیقۂ حیات بننے کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ مگر یہ کیا ہوا کہ مجاز ناشاد و نامراد دنیا سے چل دیا؟ یہ کیوں ہے کہ لڑکیاں مجاز سے عشق کریں مگر جب شادی کا وقت آئے تو وہ تجوریوں سے شادی کریں؟ سماج کے یہ حالات ایسے تھے جن سے مجاز لڑا۔ ایک لڑتا ہے اور سیکڑوں کی ہمت بڑھتی ہے۔ اگر وہ چاہتا تو کوئی اچھی سی نوکری کر لیتا۔ کسی خوبصورت لڑکی سے شادی بھی کر لیتا اور آرام کی زندگی گذارتا۔"[۲] آخر میں انھوں نے کہا کہ "میں نے مجاز کو اس کی بعض عادتوں پر اکثر ڈانٹا اور کبھی غصہ میں یہ بھی کہہ دیا کہ "اس سے بہتر تھا مجاز تم مرجاتے۔" مجاز نے جیسے مُنہ پر طمانچہ مار دیا۔ اور یہ کہا کہ "لو" میں مرگیا۔ تم اس کو اتنا بڑا کام سمجھتی تھیں۔"[۳]

آخر میں صدر جلسہ سجاد ظہیر نے تقریر کی اور منشی پریم چند جو غیر معمولی حالات میں گھر کر موت کا شکار ہوئے تھے تذکرہ کرتے ہوئے کہا:۔

"ہم سب کو یہ سوچنا چاہیے کہ آخر یہ حالات کب تک رہیں گے کہ ہمارے ادیب اور شاعر ضمیر فروشی کر کے اپنی ادبی صلاحیتوں کو تباہ کریں یا ضمیر کی آواز پر لبیک کہیں تو سخت حالات سے دوچار ہو کر اُنھیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔"[۴] آگے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے انھوں نے

۱؎ ۸ر دسمبر۔ قومی آواز (سردار جعفری کی تقریر کا اقتباس)

۲؎ ۸ر دسمبر ۵۵ء قومی آواز (عصمت چغتائی کی تقریر کا اقتباس)

۳؎ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۴؎ ۸ر دسمبر قومی آواز لکھنؤ۔

کہا۔ "میں جس عقیدے کا آدمی ہوں اُس کے مطابق میں سمجھتا ہوں کہ جب تک سماج میں بنیادی تبدیلی نہ کی جائے حالات سُدھر نہیں سکتے۔ لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک کے تمام ادیب اور مصنف ایک طرف اور سیاسی رہنما دوسری طرف مل کر سوچیں کہ کس حد تک ان افسوسناک حالات کی سنگینی کو کم کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم سب مل کر غور کریں تو ضرور کوئی راہ نکل آئے گی۔" [1]

آخر میں مجاز کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا :۔

"مجاز انقلاب، تبدیلی اور امید کا شاعر تھا۔ ہمیں اُس کی یاد میں اپنے دل کو اتنا مغموم نہ کرنا چاہیے کہ شاعر کے بنیادی پیغام ہی کو بھول جائیں۔" [2]

تقریر کے خاتمہ پر سجاد ظہیر صاحب نے فرمایا :۔

"اسی شہر میں بڑے بڑے ادیب اور شاعر آسودہ ہیں مگر آج ان کو نشان تک نہیں ملتا۔ ہمیں مجاز کو اس انجام سے بچانا ہے۔" [3]

جلسے میں جو تعزیتی تجویزیں پیش کی گئیں وہ یوں تھیں :

"لکھنؤ کے ادیبوں، شاعروں اور ادب دوست شہریوں کا یہ جلسہ اُردو کے محبوب شاعر اسرار الحق مجاز کی ناوقت موت پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی موت کو ایک عظیم حادثہ تصور کرتا ہے۔"

ہمارے ادب کو مجاز سے ابھی بڑی توقعات تھیں لیکن ان کی ناوقت موت نے ہماری امیدوں کا خون کر دیا۔ مجاز کو زندگی میں بڑی محرومیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم مجاز نے ان سب کے باوجود لافانی شاہکار چھوڑے ہیں جو رہتی دنیا تک زندگی اور اُن کے نام کو حیات دوام عطا کریں گے۔

"یہ جلسۂ عام مجاز کے تمام مداحوں اور دوستوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ان کی شایان کوئی یادگار قائم کرکے اپنے رنج و غم کے اظہار کا ثبوت دیں۔" آخر میں یہ جلسۂ عام مرحوم کے بوڑھے والد چودھری سراج الحق صاحب اور ان کی بوڑھی والدہ اور پس ماندگان سے اپنی دلی تعزیت

---

[1] ۸ دسمبر ۵۵ء۔ قومی آواز لکھنؤ۔

[2] " " " "

[3] " " " "

پیش کرتا ہے اور انھیں یقین دلاتا ہے کہ ملک کے تمام ادیب اور شاعر ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔'' [1]

مجاز کی موت پر ہندوستان کے گوشے گوشے سے مجاز کے والدین کے نام تعزیتی خطوط آنے لگے تھے جن میں سے چند اہم خطوط درج ذیل ہیں :-

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اس واقعہ پر ایک تار دیا۔

''آپ کی اس اندوہناک محرومی سے مجھے دلی صدمہ پہنچا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔ (ذاکر حسین)

۲. آل احمد سرور صاحب نے ۸ دسمبر ۵۵ء کو علی گڈھ سے تعزیتی خط لکھا۔

'' محترمی۔ تسلیم ـــــ پرسوں مجاز کی اندوہناک وفات کی خبر محمود صاحب سے سنی۔ کیا عرض کروں۔ کیا صدمہ ہوا۔ میں پہلی ستمبر کو یہاں آگیا تھا۔ آنے سے پہلے مجاز سے ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے وہ اچھے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ کیا خبر تھی کہ چند دن کے بعد ہی ان کی یہ حالت ہوگی اور اس طرح وہ انتقال کر جائیں گے۔ جب آپ کے صدمے کا خیال کرتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے اور مجاز کی والدہ کے صدمے کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو اور مجاز کی والدہ کو اس عمر میں کیسے کیسے صدمے برداشت کرنے پڑے ـــــ آپ کو تو شاید اس بات سے تسلی نہ ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ مجاز بڑا مخلص، بڑا دلنواز، بڑا پیارا انسان تھا۔ وہ سب کا دوست تھا صرف اپنا دشمن تھا۔ اس نے اپنی شاعری، اپنی صحت، اپنی زندگی سب کچھ اپنی کمزوری کی نذر کردی۔ سب دیکھتے رہے اور کچھ نہ کر سکے۔ مجاز کی شاعری، وہ خوبصورت۔ پُرسوز۔ جوان اور جاندار شاعری زندہ رہے گی۔ اسے تو وقت کا ظالم ہاتھ بھی نہیں مٹا سکتا۔ مجاز کی ذہانت، اس کی محبت، اس کی دل رُبا شخصیت، اس کی زندہ دلی کی یاد بھی اس کے دوستوں کے دل سے کبھی محو نہ ہوگی۔ اس کی وجہ سے آپ کو اور اس کے دوستوں کو تکلیف بھی پہنچی مگر صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنا خیال خود کیوں نہیں رکھتا تھا۔ اپنے آپ پر قابو کیوں نہیں پاتا تھا۔ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا تھا، مگر اُس کے جتنے بھی دوست تھے وہ سب اُس سے محبت کرنے پر مجبور تھے، اس لئے کہ وہ سب سے محبت کرتا تھا۔ ان کی خوشی سے خوش ہوتا تھا۔ ان کے دکھ پر رنجیدہ ہو جاتا تھا۔ میرا تو اُس کا ۲۹ء سے ساتھ تھا۔ مجھے شرمندگی ہے کہ میں اُس کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ اسے کوئی مدد نہ پہنچا سکا، مگر وہ برابر مجھ سے محبت کرتا رہا۔ اس کا دل بڑا تھا سب کے لئے، اس کے دل میں جگہ تھی مگر شاید خود اپنے لئے نہ تھی۔

---

[1] قومی آواز ۸ دسمبر ۵۵ء۔

مجاز کی شاعری زندہ رہے گی۔ مجاز کی شخصیت کی آب و تاب ماند نہ ہوگی۔ مجاز مر کر بھی زندہ جاوید رہے گا۔ آج جہاں جہاں اردو بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہے، مجاز کا ماتم منایا جا رہا ہے اور اُس کی یاد دلوں کو برما رہی ہے۔ مجاز کے غم میں آپ اور اُس کے اعزا تنہا نہیں ہیں۔" آل احمد سرور۔

فراق گورکھپوری نے لکھا:

باتیں اس کی یاد آتی ہیں لیکن ہم پر یہ نہیں کھلتا
کن باتوں پر اشک بہائیں کن باتوں سے جی بہلائیں

"دورِ حاضر کی شاعری میں مجاز ایک عجیب و غریب ایک حیرت انگیز منظر PHENOMENON کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بان کی طرح چھوٹا اور فضا کی بلندیوں میں پھول سی جگمگاتی ہوئی چنگاریاں بکھیر کر چشم زدن میں بجھ گیا، لیکن یہ چنگاریاں اس کے مختصر مجموعۂ کلام میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی ہیں۔ ان کی جگمگاہٹیں زندگی کی راتوں کو روشن کرتی رہیں گی۔"

کرشن چندر نے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا ہے:

"مجاز ہمارے عہد اور ہماری نسل کا سب سے ذہین، بالغ نظر اور رجیلا شاعر تھا۔ اس کی موت ایک عہد ایک نسل کی موت بن کر رہ گئی ہے۔ مجاز اقبال اور جوش کے بعد سب سے مقبول شاعر تھا۔ جب تک اردو شاعری زندہ ہے مجاز کی "آوارہ"، "اندھیری رات کا مسافر" اور اسی قبیل کی دوسری کامیاب ترین نظمیں زندہ رہیں گی۔ مجاز میرا کبھی ہمدم و دم ساز نہیں تھا وہ تو تمام ساتھیوں کا محبوب اور رفیق کار تھا۔ کاش! موت اتنی بے رحم نہ ہوتی۔"[1]

جوش ملیح آبادی خود بھی سماجی حالات کا شکار ہو کر اپنے کو جوش مرحوم سمجھنے لگے۔ انھوں نے بھی سب سے زیادہ موثر اور جذباتی انداز میں اپنے تاثرات پیش کئے اور ایک خط میں لکھا ہے:

"مرگِ مجاز کی خبر نے دل کو برباد کر کے رکھ دیا۔ کاش وہ زندہ رہتا اور میں مر جاتا۔ ہائے ہائے۔ (جوش)

آخر میں مجاز کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

"تمھاری موت نے میرے دل کی جو کیفیت کر دی ہے اُس کیفیت کو جب الفاظ کی پشت پر لکھنا چاہتا ہوں تو وہ حباب کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ حیف اُن تاثرات پر جو فقدانِ الفاظ کی بنا پر سینے میں گھٹ گھٹ کر سر پیٹتے اور گرجتے رہتے ہیں ــــ مجاز میں نے تیرے والدین کو پُرسا نہیں دیا ہے اس لئے کہ انھیں چاہیے تھا کہ وہ تیرا پرسا مجھے دیتے۔ تو ان کا صرف بیٹا تھا لیکن تو میرا کیا تھا ــــ یہ اُن بدنصیبوں کو نہیں معلوم، میرا خیال تھا کہ یہ چراغ جو مجھ نامراد نے جلایا ہے میرے بعد تو اس چراغ کو روشن رکھے گا اور مزید روغن ڈال کر اُس کی لو کو اُکسائے گا اور اس طرح اس چراغ سے سیکڑوں نئے چراغ جلتے چلے جائیں گے۔

[1] کرشن چندر کے تاثرات۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۸۳۶۔

لیکن صد حیف! کہ تو ہی بجھ کر رہ گیا۔ میری اُمید کا چراغ شاید اب کبھی نہ جل سکے گا......... ایک تیرے بدھارنے سے میرے دل کی نگری اس طرح اُجڑ کر رہ گئی ہے کہ اب دوبارہ آباد نہیں ہو سکے گی .... میری رات بھیگ چلی ہے۔ تارے سر پر ٹمٹمار ہے ہیں۔ بستر تہہ کر لیا گیا ہے، کمر باندھ لی گئی ہے اور اب یہ مسافر بھی تیار ہو چکا ہے۔

مجاز گھبرانا نہیں! — جوش بھی آرہا ہے۔ جلد آرہا ہے۔

گھبرانا نہیں اے مجاز!

جگرؔ صاحب نے لکھا:

"زمانے نے مجاز کے ساتھ نہایت عبرتناک سلوک کیا۔ ان کی موت ادب دوست حضرات کے لئے ایک نیا مسئلہ پیش کرتی ہے۔ مجاز کی موت کا ذکر آیا تو میرا بھی دل چاہتا ہے کہ اس بارے میں مختصر طور پر اپنے خیالات کا اظہار کر دوں۔ ظاہر ہے کہ ان کی موت قدرتی اسباب کی بنا پر واقع نہیں ہوئی ہے۔ اسے ایک اعتبار سے خودکشی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مفہوم صرف اِن دو جملوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کثرت سے شراب پی اور یہی کثرتِ مے نوشی ان کی موت کا سبب بن گئی۔ لیکن یہ مسئلہ صرف یہیں تک نہیں ہے، اس میں بڑے پیچ و خم ہیں، بڑے نشیب و فراز ہیں۔ دراصل وہ تمام دشواریاں، وہ تمام مصائب، وہ تمام پریشانیاں اور ناسازگار زمانے کی وہ تمام بے رحمیاں اور سفاکیاں مجاز کی موت کے اسباب میں شامل ہیں جن سے آج کے اربابِ قلم فنکاروں اور دانشوروں کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مجاز آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن اُن کی موت ہمارے لئے ایک اہم سوال ہے۔ یہ سوال ہماری حیثیت اور شرافت کے لئے ایک تازیانہ ہے، لیکن اس سے بڑا سوال یہ ہے کہ اپنے سماجی نظام اور معاشرتی کشمکش کو سمجھے بغیر ہم اس کا جواب دے بھی سکتے ہیں یا نہیں۔

اُن کی موت سے اردو ادب کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ ترقی پسند تحریک میں سخت کمی واقع ہوئی ہے لیکن میرے لئے اس صدمہ کی نوعیت اس کے ماسوا بھی ہے اور میں یہ محسوس کر رہا ہوں جیسے قدرت نے کوئی متاعِ گراں مایہ مجھے ودیعت کر کے مجھ سے چھین لی ہے۔"

اُف جواں مرگیاں محبت کی
ہائے کس کس کا سوگوار ہوں میں

——————

مجاز کی شخصیت
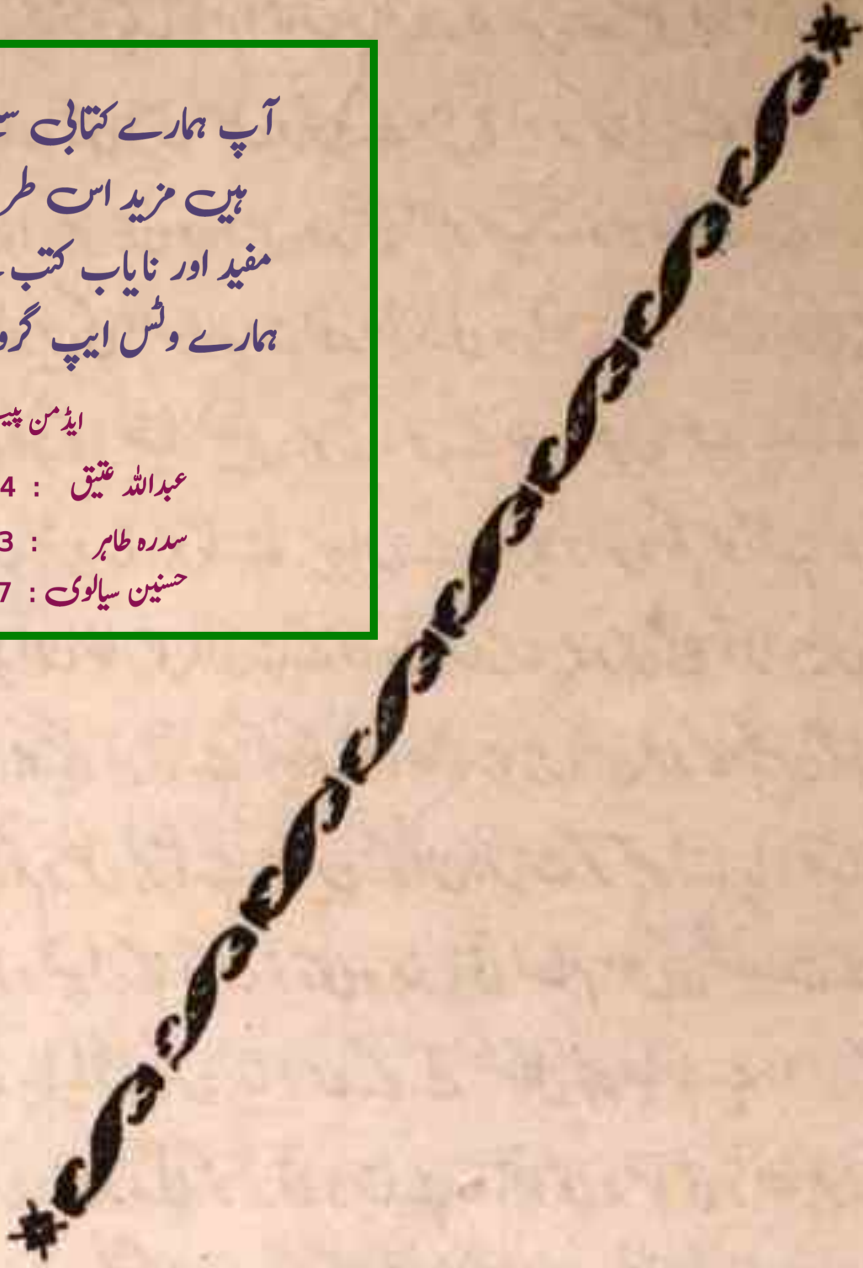
یہ مانا آج دل فرطِ الم سے پارا پارا ہے
بلندی دیکھنے والوں کو پستی بھی گوارا ہے
ہزاروں کے لئے میں گر چکا ہوں بامِ گردوں سے
ہزاروں وہ ہیں جن کو میں نے گردوں سے اتارا ہے

مجاز

مجاز کی شخصیت

شخصیتیں اضافی اور تہ دار ہوا کرتی ہیں اور اعمال و افکار سے عبارت ہوتی ہیں۔ اعمال میں اس کی زندگی کے نجی خدوخال نظر آتے ہیں اور افکار میں احساسات، خیالات، جذبات، تصورات، تاثرات، معتقدات، اقدار زندگی کے فلسفے اور نظریے وغیرہ آتے ہیں جو اس کی متاعِ حیات ہوتے ہیں، جن کو نفسیات مختلف خانوں میں تقسیم کرتی ہے۔ بعض کے نزدیک تمام اعمال و افکار کا سرچشمہ نسلی وراثت سے ماخوذ ہوتا ہے اور اجتماعی لاشعور میں پنہاں یعنی اپنی نسل و قوم کے مزاج اور کردار سے ہر فرد کچھ نہ کچھ حصہ ضرور پاتا ہے۔ اور جانے انجانے انداز میں وہ اس وراثتی خصوصیات و اوصاف سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کی سب سے پہلی تہ اپنے والدین کی خصوصیات اور خاندانی وراثت سے اکتساب کی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ تہ خود بخود بنتی ہے جس میں فرد کو اختیار نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ماحول، عہد یا زمانہ اور گرد و پیش کے حالات کے اثرات کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے جبر کا دائرہ کم ہوتا ہے اور فرد کو اختیار کا حق ملتا ہے۔ حالانکہ فرد ان خارجی اثرات کے ردّ و قبول میں پوری طرح آزاد نہیں ہوتا بلکہ اس کی نہج پہلے سے بننا شروع ہو چکی ہوتی ہے کیونکہ جن حالات میں کسی فرد کا بچپن گذرتا ہے ان میں پسند یا ناپسند کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ بچپن کے اُن اثرات کو چھوڑتا یا اختیار کرتا ہوا جب وہ آگے بڑھتا ہے تو ردّ و قبول کا ایک ذہنی و جذباتی نظام اس کی شخصیت کا جزو بن چکا ہوتا ہے جس کو یکسر تبدیل کر دینا یا ترک کر دینا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس محدود دائرے میں ہر فرد اپنی زندگی کو ترقی دیتا ہے، اجتماعی و سماجی ڈھانچوں میں فٹ کرنے یا ڈھالنے کی اور اسے اپنے طور پر تشکیل دینے کی کوشش کرتا ہے۔ مختلف نظریوں اور عقیدوں کو رد یا قبول کرتا ہے۔ ساتھ ہی مختلف معتقدات اور اسلوبِ فکر کو اپناتا ہے یا ترک کرتا ہے اور انھیں تصورات اور نظریات کے تحت زندگی کی اپنے طور پر توجیہہ و تشکیل کرتا ہے۔

اس تشکیلی طریقے کے بغور مطالعے سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ شخصیت کا زیادہ حصہ جبر کے تحت اور بہت چھوٹا حصہ اختیار کے تحت پروان چڑھتا ہے۔ انفرادیت سے زیادہ اجتماعیت اور خارجیت غالب عناصر ہوتے ہیں یعنی خاندانی روایات، نسل و قوم کی صفات اور ان کے اثرات، سماجی ڈھانچے اور اُن کی اقدار، ملک و قوم کے حالات و نظریات فرد کی اپنی خصوصیات پر اس طور پر حاوی رہتے ہیں کہ اُس کی اپنی نجی خواہشات اور ارادے بروئے کار نہیں آپاتے۔ اس سے ایک نظریہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ادیب و فن کار خاص طور پر جب عملی زندگی میں

اپنی خواہشات پوری کر پاتا تو اُسے فکری اور جذباتی زندگی میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنی محرومیوں اور حسرتوں کا انتقام تصوراتی دُنیا میں لینے کی خواہش رکھتا ہے اور اپنے ادبی فن پاروں میں گویا اپنی تمام ناکام حسرتوں اور ارمانوں کو پورا کر لیتا ہے۔ اس طرح ایک فن کار اپنے فن کی دُنیا سے عملی دنیا میں مختلف نظر آتا ہے۔ ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے (غالب)

؎ وہی بات جو میں نہ کہہ سکا مرے شعر و نغمہ میں آگئی
وہی لب نہ میں جنھیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے

ہر فن کار کے اندر ایک سے زیادہ شخصیتیں یا شخصیتی پہلو ہوتے ہیں جو باہم متصادم ہوتے ہیں۔ کبھی ان میں مفاہمت ہوتی ہے اور کبھی ٹکراؤ اور اس کی اپنی اصلی مجموعی شخصیت انھیں پہلوؤں کے باہمی توازن و تناسب کی ایک مخلوط شکل ہوتی ہے یا ان سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔

مختصراً شخصیت، خواہشات اور ارادوں کا وہ نظام ہے جو اپنے گرد و پیش اور ذاتی اطوار سے تفاعل INTERACTION کے بعد ایک سمجھوتے کی شکل اختیار کرتا ہے اور اس میں اس کی شخصیت کے متضاد خد و خال جھلکتے ہیں۔

اس طرح کسی فن کار کو سمجھنے کے لئے ہم کو یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ کیا کیا خواہشات، ضروریات اور محرومیاں اس کو ایک خاص قسم کا سلوک کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ وہی شخص اپنے فن پاروں میں کچھ، گھر میں کچھ اور دوست احباب کے درمیان کچھ نظر آتا ہے۔

مجاز بھی کچھ ایسی ہی متضاد اور تہ دار شخصیت کے مالک تھے۔ خد و خال اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے نہایت منحنی سے جسم میں بہت ہی ولولہ انگیز دل رکھنے والے انسان — بقول جوش ؎

اک ٹھہراؤ اک طوفان ہے تو دیکھ کس درجہ دھان پان ہے تو

لیکن یہی خستہ حال شاعر یوں بھی کہتا ہوا نظر آتا ہے اور اپنے مسلک کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ ؎

یہاں کے شہریاروں کو خبر دو کہ مردِ انقلابی آگیا ہے

یا

آج بھی ہے لکھی ہوئی سُرخ حروف میں مجاز دفترِ شہریار میں میرے جنوں کی داستاں

مجاز کی وضع قطع میں ایک دیدہ زیبی، تیور میں تیکھا پن، نگاہوں میں شوخی اور بانکپن اور دل میں بلا کا درد و گداز تھا۔

حلیہ کچھ اس طرح کا تھا:

"ان کا قد بھی سردار جعفری کے برابر ہوگا۔ میانہ قد لیکن اُن سے بھی زیادہ دُبلے تھے۔ ان کی ہڈیاں بہت پتلی تھیں اور جسم پر گوشت نہ ہونے کی وجہ سے وہ جسم کے ہر کُھلے ہوئے حصے سے ابھرتی نظر آتی تھیں۔ مجاز کے چہرے پر نظر ڈالنے سے بہت سی مہین مہین نوکوں کا احساس ہوتا تھا۔ دونوں گالوں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں کی نوک، ناک کی نوک، دو بڑے ہی پتلے ہونٹوں اور غیر معمولی چھوٹے سے منہ کی نوک اور پھر اس اُلٹے تکون کے نیچے ایک بہت چھوٹی سی ٹھڈی کی تیز نوک۔ پھر جب کبھی وہ سر پر بڑی سی بال دار اونچی کیپ نہایت ترچھے زاویے پر پہن لیتے تو گویا وہ اس نوکیلے سلسلے کی سب سے اونچی چوٹی ہوتی تھی، لیکن اس ہلکے پھلکے اور نوکیلے شخص میں اپنی جوانی کے اس زمانے میں کبھی نیشن کے معنوں میں بھی نوک نہ تھی۔ وہ تو اس لحاظ سے سرتاسر نوش تھا۔"[1]

عصمت چغتائی نے مجاز کے حلیہ کو کس قدر افسانوی انداز میں بیان کیا ہے کہ شاعر کا تصور صاف اُبھرتا ہے۔

"مجاز کی زندگی کی طرح اُن کی صورت شکل بھی کچھ اُلجھی اُلجھی سی تھی۔ لفظوں میں نقش و نگار کو ڈھالنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ہوا میں دائرے کھینچنے کی کوشش کرنا۔ تاثرات کے چہرے پردہ ہما ہی ہے کہ نقش و نگار کچھ سے کچھ بن کر رہ گئے۔ آنکھیں تو ہیں مگر یہ اندازہ لگانا از حد مشکل ہے کہ ان کی تہ میں کیا ڈوبا ہوا ہے۔ ایک مبہم سی یاس و ناامیدی، مگر ساتھ ساتھ کچھ سہانے ارمان، کچھ کر دکھانے کا حوصلہ، کچھ اُلجھن اور پریشانیاں جو آج کل کے ہر نوجوان کا آبائی حق بن کر چمٹ گئی ہیں۔" اور ایک ناک جو ستوان کی حدوں سے کب کی گذر چکی ہے جس کی ہڈی شاید بڑھ رہی ہے۔ اور چہرا چھوٹا پڑتا جا رہا ہے اور نہایت ڈرپوک قسم کا سہما ہوا دہانہ جو اپنے مالک کے سریع الحس اور جذباتی ہونے کا علم بردار ہے۔[2]

"ناک نقشہ کے اعتبار سے ہاتھ پیر بھی ہیں، پر بال جی بھر کے ملے ہیں جن کے ایک ایک کنارے پر کسی زمانے میں سفید کھدر کی ٹوپی اس طرح معلق رہا کرتی تھی کہ ہر وقت یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب گری، اب گری۔ اور شاید کہیں گر پڑی ہو اور اس کی جگہ بالوں والی جائے پوشی سے ملتی جلتی کیپ نے لی۔ لیکن

---

[1] اردو شناخی۔ مجاز ظہیر صفحہ ۲۴ [2] عشقِ مجازی۔ عصمت چغتائی۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۲۴۶۔

وہ بھی کہیں لال پیلی آندھیاں اُڑا لے گئیں اور آج کل جب کہ میں یہ سطور لکھ رہی ہوں مجاز کے سر پہ کوئی شے نہیں سوار ہے۔[۱]

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے جو حُلیہ بیان کیا ہے اُس سے مجاز کا پورا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے اور جس نے کبھی انھیں نہ بھی دیکھا ہو تو وہ ایک خیالی شاعر اور صرف شاعر کا بھرپور تصور کر سکتا ہے۔

"یہ صاحب آئے۔ مُنحنی، دُبلے پتلے، کمزور سے آدمی، گندمی رنگ، چھریرا بدن، لمبی سی ناک، چھوٹا سا دہانہ، مخمور سی آنکھیں، لیکن اُن میں ذہانت کی چمک، بڑے بڑے سیاہ چمکیلے بال، سر پر اونچی دیوار کی سفید گاندھی ٹوپی، علی گڑھ کاٹ کا پائجامہ، جسم پر ڈھیلی ڈھالی شیروانی، دیکھنے میں کم سخن اور خاموش، باتیں کم کرتے تھے اور کرتے تو شرما شرما کر، الفاظ آدھے زبان سے نکلتے اور آدھے منہ ہی میں رہ جاتے، لیکن ہر بات میں بلا کی ذہانت، ہر فقرے میں شوخی اور شرارت، جس سے ملتے اپنا گرویدہ بنا لیتے۔"[۲]

آگرہ کے دورانِ قیام میکش صاحب سے جب مجاز کی ملاقات ہوئی اُس وقت وہ شعر گوئی کے عروج پر نہ تھے بلکہ ابتدائی زمانہ تھا۔ وہ جذبی کے ساتھ اُن سے ملے تھے۔ میکش صاحب نے مجاز کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے:

"دُبلے پتلے۔ مُنحنی سے۔ لباس اور وضع سب بجا اور دُرست مگر مجبوری یہ تھی کہ گال پچکے ہوئے تھے اور جوانی کی بھی کوئی کشش ان میں نہ تھی۔ یہ مجاز صاحب تھے۔"[۳]

پروفیسر ضیا صاحب نے بھی مجاز کا حلیہ بڑے جان دار الفاظ میں پیش کیا ہے:

"وہ دُبلا پتلا، سوکھا، سہما شاعر۔ واقعی رومان اور انقلاب کا مرکب تھا۔ آگ اور پانی کا حسین امتزاج۔ شعلہ و شبنم کا لطیف مرقع۔"[۴]

فرحت اللہ انصاری جو اُن کے بہت دیرینہ دوست تھے، اپنی پہلی ملاقات میں اُن کا حُلیہ و انداز یوں بیان فرماتے ہیں:

کسی نے ایک صاحب سے تعارف کرایا، سر پر کشمشی رنگ کی مخملی ٹوپی جس کی دیوار ذرا چوڑی سی، جسم پر یونیفارم کے رنگ کی نیلی شیروانی جس پر سفید بٹنوں سے مہین مہین دھاریاں

---

[۱] عشقِ مجازی۔ عصمت چغتائی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۳۴۷۔
[۲] مغرب و ایران۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۶۷۔ [۳] مجاز مرحوم۔ میکش اکبرآبادی۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۳۷۹
[۴] ہم مشرب۔ پروفیسر اے۔ کے ضیا۔ پاسبان لکھنؤ صفحہ ۳۹۔

پڑی تھیں اور شروع سے آخر تک سارے بٹن لگے ہوئے تھے۔ علی گڑھ پاجامہ، براؤن رنگ کا شو،
بغل میں کتابیں، لمبا سا قد، سانولا سا رنگ، دُبلا سا بدن، چہرے پر متانت اور سنجیدگی، معلوم ہوا
آپ اسرار الحق مجاز ہیں۔ لکھنؤ کے رہنے والے اور ایک ہونہار شاعر۔ میں نے ہاتھ ملایا تو ایسا نرم و
نازک ہاتھ زیادہ تپاک دکھانے کی جرأت نہ ہوئی۔"[۱]

ڈاکٹر اعجاز صاحب مرحوم نے مجاز سے پہلی ملاقات کے ذکر میں اُن کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے:

"مجاز بی۔ اے پاس کر چکے تھے اور جوان بھی تھے۔ رنگ اُس وقت بھی پختہ تھا۔ کچھ بھی ہو،
نوجوانی تو تھی۔ اُن کے رنگ میں ایک جاذبیت تھی اور وہ کپڑے اچھے اور قاعدے سے پہنتے تھے۔ پتلا دُبلا آدمی اور
لمبا قد کبھی خوبصورت نہیں سمجھا جاتا۔ چہ جائیکہ جب رنگ بھی سیاہ ہو۔ یہی صورت مجاز کی بھی تھی۔ اس لیے
ان کو بھول کے بھی خوبصورت نہیں کہا جا سکتا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں مگر ان میں بلا کی ذہانت تھی۔
اُن کی نوکیلی ناک بھی اس قیاس کی تائید کرتی تھی۔ باتیں کرنے میں اُن کی زبان قینچی سے زیادہ تیز تھی۔
الفاظ خیال کا ساتھ مشکل سے دیتے تھے۔ کم از کم دوسروں کے کان تک پہونچتے پہونچتے ہوا میں بہت سے
گم ہو جاتے تھے، لیکن غنیمت یہ تھا کہ وہ زیادہ باتیں نہیں کر رہے تھے۔"[۲]

مجتبیٰ حسین صاحب نے مجاز کا حلیہ بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"چہرہ یونانیوں جیسا مگر چھوٹا۔ رنگ ڈھلکا سانولا، تقریباً کھرا نقشہ، ناک ستوان
اور چہرے کے تناسب سے قدرے بڑی، واضح، خیالی اور حتمی اور قطعی فیصلے کی دلیل۔ خواہ وہ فیصلہ
یقینی تباہی کی طرف لے جائے۔ آنکھیں نسبتاً چھوٹی اور اندر کی جانب دھنسی ہوئی جن میں ایک کبھی
نہ بجھنے والی روشنی اور اس روشنی سے ذہانت، شوخی اور معصوم شرارت کی ہلکی ہلکی کرن سی پھوٹتی ہوئی۔
آنکھیں کسی کی بھلائی بُرائی سے ہٹ کر دور اپنی منزل کو دیکھتی ہوئی۔ ہونٹ پتلے خاموشی کے باوجود
کچھ کہتے ہوئے بغیر مسکراہٹ کے مسکراتے ہوئے۔ ان ہونٹوں پر جملے، فقرے، طنزیہ کلمات اور پیار کے
گیت مچلتے ہوئے۔ تشنگی اور سیرابی باہم رقصاں، پیشانی نہ تنگ نہ کشادہ، سر کے لمبے لمبے بال ماتھے
پر بار بار بکھرتے ہوئے جو بانکپن کے ساتھ ایک طرف جھکی ہوئی گردن کے ہلکے سے جھٹکے سے پیچھے پہنچ جاتے۔
سر پر اونچی دیوار کی کشتی نما اونی ٹوپی یا پھر یونہی ننگے سر ہاتھ کی انگلیاں لمبی، پتلی بے چین اور متحرک،

---

[۱] نیاز کچھ ادھر کچھ ادھر ۔ نزہت اللہ انصاری۔

[۲] تاثرات ۔ مجاز کی موت پر۔ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب مرحوم۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۸۰۵

کسی نادیدہ ساز کو ہمہ وقت چھیڑتی ہوئی، رفتار سبک اور نرم، نفاست اور خود اعتمادی لئے ہوئے، گردشوں کو ٹھکراتی، قدم بغیر کسی پس و پیش خوف و خطر کے دم بدم آگے بڑھتے ہوئے، قد لمبا، پتلے دُبلے جسم پر شیروانی نہیں تو اتنا ہی لمبا اُوور کوٹ۔ اور یہ بھی نہیں تو اتنا ہی لمبا کھدر کا کرتا۔ یا پھر کرتا، شیروانی اور اُوور کوٹ تینوں ایک ساتھ، ایک جگہ۔ سر سے پا تک کھنچی ہوئی سر دھی بنے ہوئے یہ تھے اسرارالحق مجاز۔" [۱]

مجاز کی شخصیت کے خدوخال کو نمایاں کرنے میں کافی حد تک خاندانی و نسلی وراثت، گھر کی تہذیب و تربیت اور ماضی کی روایات کارفرما نظر آتی ہیں۔ ان کا دردمند دل، ان کی نگاہ کی گہرائی اور ان کی فطرت پر جو رومانی اور جذباتی رنگ غالب نظر آتا ہے، ان سب کی وجہ وہی خاندانی اوصاف ہیں جو انھیں اپنے والدین سے ملے تھے۔

مجاز کی طبیعت میں جو چاہے جانے کا جذبہ اور خود چاہنے کی خواہش تھی، وہ بھی گھر کے پُرخلوص ماحول کی دین تھی۔ اُن کے گھر کا ہر فرد مجاز سے بے حد محبت کرتا تھا۔ خصوصاً ماں کی زندگی کا تو وہ محور تھے۔

"عمر کے آخر دن تک کوئی صبح ایسی نہ گذری جب ماں نے اُن کے لئے دو رکعت شکرانے کی نماز نہ پڑھی ہو۔ اب سے چھ سات قبل سے دو آنے روزانہ اُن کے سرہانے رکھے جاتے جو صبح کو خیرات کردئے جاتے تھے۔ غرض کہ اُن کی ہر سانس کے ساتھ ماں کی دُعائیں وابستہ تھیں اور ہر قدم کے ساتھ تمنائیں اور آرزوئیں۔ بچپن سے ہم سب نے محسوس کیا گویا ماں کی زندگی کا محور وہی ہوں۔" [۲]

مجاز کو خود بھی اپنے گھر کے افراد سے بے حد لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی غالباً کہ ماں کے اتنے پیار و محبت کے باوجود دوسرے بھائی بہنوں کے دل میں مجاز کے لئے کبھی رقابت کا جذبہ نہیں پیدا ہوا۔ انصار ہاروانی صاحب سے دورانِ گفتگو جب یہ سوال کیا گیا کہ کیا ماں باپ کی اتنی محبت دیکھ کر آپ لوگوں کے دل میں کبھی جذبۂ رقابت نہیں پیدا ہوا؟ تو انھوں نے کہا کہ مجاز چونکہ اتنی پُرخلوص طبیعت کے مالک تھے اور انھیں اپنے بھائی بہنوں سے اتنی زیادہ محبّت تھی کہ کبھی یہ بات ذہن میں پیدا ہی نہیں ہوئی، بلکہ ماں باپ کا اتنا زیادہ پیار اُن کے لئے دیکھ کر ہم لوگوں کے دل میں اُن کے لئے احترام و محبت میں مزید اضافہ ہوجاتا تھا۔ [۳] ان حالات میں ہم بھائی بہنوں کے دل میں اُن کی طرف سے رقابت کا جذبہ پیدا

---

[۱] ہستی آتش نفس۔ مجتبیٰ حسین۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۲۷-۲۳۸۔

[۲] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۸۳۔

[۳] انصار ہاروانی سے دلّی میں ایک انٹرویو میں کئے گئے سوالات کے جواب میں۔

ہونا ضروری تھا۔ لیکن یہ مجاز کی اپنی طبیعت کی سادگی، معصومیت اور خلوص تھا جو ایسی بدمزگی کی فضا گھر میں نہ پیدا ہو سکی۔" [1]

مجاز اپنے ماں باپ سے شدید محبت کرتے تھے اور اُن کا بیحد احترام بھی۔ اور اکثر شراب نوشی کے باوجود اُنھیں اس بات کا احساس رہتا تھا کہ اُن کی اِس حرکت کا اندازہ بھی اُن کے والدین کو نہ ہونے پائے، ورنہ اُنھیں تکلیف پہنچے گی۔ اِس سلسلے میں اُن کو شوکت تھانوی صاحب سے شکایت بھی ہوئی تھی۔

"شوکت تھانوی نے مجاز کے والد صاحب سے مجاز کا ذکر کرتے ہوئے بہت سی تعریفوں کے بعد آخر میں یہ کہہ دیا کہ مجاز کو شراب نوشی کی عادت پڑ گئی ہے کسی طرح سے چھڑائیے۔ یہ خبر مجاز تک بھی پہنچی۔ بہت خفا ہوئے اور اکثر دوستوں سے شوکت صاحب کی شکایت کی اور کہا میں نے شوکت صاحب سے کہہ دیا ہے کہ وہ یا تو میرے والد سے دوستی رکھیں یا مجھ سے۔ بہ یک وقت باپ بیٹے دونوں سے دوستی مناسب نہیں۔" [2]

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مجاز کو یہ بات ناگوار گذری کہ ان کی کمزوری کا ذکر اُن کے اپنے والدین اور عزیز واقارب سے کیا جائے۔ جب کہ وہ کبھی کبھی نشے کی حالت میں اپنے والدین کے سامنے نہ جاتے۔ اور اسی لئے اکثر و بیشتر راتیں انھوں نے شراب نوشی کے بعد اِدھر اُدھر دوستوں اور احباب کے یہاں گذار دیں۔ حالانکہ اُن کی اِس عادت کا علم سب کو تھا۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ اس کا علم والدین کو ہے۔ پھر بھی اِس حالتِ خود فراموشی میں نہ اُن کا سامنا کرنا چاہتے نہ اُن کے سامنے جاکر انھیں ذہنی تکلیف پہنچانا چاہتے تھے۔

آخری دنوں میں جب کہ اُن کی شراب نوشی اس حد تک عام ہو چکی تھی کہ ان کے والدین کو اس کا علم ہو گیا اور انھوں نے اکثر ان کو اِس حالتِ مدہوشی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ساتھ ہی مجاز کو بھی اس کا علم تھا، لیکن اس کے باوجود بھی وہ والدین کا اس قدر لحاظ رکھتے تھے کہ راتوں کو شراب نوشی کی حالت میں لائے جانے کے بعد صبح جب ہوش میں ہوتے تو ان کی ماں اُن کو اس درمیان میں موقع پاکر کوشش کرتیں نہ رات کی کیفیت کا احساس دلائیں اور آئندہ کے لئے احتیاط پر آمادہ کریں۔ چپ چاپ سب کچھ سنا کرتے۔ ایک خاموشی ہر بات کا جواب تھی۔ جب اندرونی کشمکش بڑھ اشت

---

[1] حمیدہ سالم۔ جگن بھیا۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۱۰۲۔ [2] مطرب بزم دلبران۔ عبادت بریلوی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۳۰۶۔

سے باہر ہو جاتی تو اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتے۔ اُن کے اسی لحاظ کا خیال رکھ کر ان کی ماں کھانا، سگریٹ کی ڈبیہ اور رکشہ کے کرایہ کی اٹھنی باہر کے کمرے میں رکھ دیتیں تاکہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اس مدہوشی کے عالم میں بھی مجاز ماں باپ کے خیال سے اندر آنے سے گریز کریں گے؛ لہٰذا یہ انتظام کر دیتی تھیں۔

جس وقت ماں اُنھیں زندگی کا اُونچ نیچ سمجھاتیں، گھر کی بگڑی ہوئی حالت کا احساس دلاتیں، اپنی محبت کا، باپ کی عزت کا واسطہ دیتیں، اُن کے چہرے کے تاثرات بتاتے کہ ماں کے آنسوؤں کا ہر قطرہ اُن کے دل پر نشتر کی طرح لگتا۔ پھر بھی نہ جانے وہ کس اُلجھاوے میں تھے۔[1] بعض اوقات انھیں اچانک شراب خانے میں بھی ماں کی نصیحت یاد آجاتی تو احساسِ ندامت سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے۔ مجتبیٰ حسین صاحب نے ایک دفعہ کا ذکر کیا ہے:

"غالباً ۱۹۳۶ء میں میری اُن سے الٰہ آباد میں ہی ملاقات ہوئی۔ شام کے وقت جب میں فراق صاحب کے یہاں پہنچا تو دیکھا کہ مجاز صاحب کھڑے ہوئے بہک رہے تھے اور انگلی کے اشارے سے بار بار فراق صاحب سے کہہ رہے تھے "فراق! جب ہم تمھیں اپنی طرف بلائیں گے تو تمھیں آنا پڑے گا۔ آنا پڑے گا۔" فراق صاحب مجاز کی اس ہذیانی حرکت سے بہت پریشان ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھیں سہارا ملا۔ فرمایا۔ ان کو کسی طرح سے یہاں سے لیجاؤ۔ بدقت تمام کسی طرح سمجھا بجھا کر انھیں وہاں سے ہٹالے جانے میں کامیابی ہوئی۔ رام نرائن لال کے چوراہے پر پہنچ کر (یہ چوراہا الٰہ آباد کے ایک مشہور درسی کتب فروش کے نام سے مشہور ہے) میں نے تانگہ کیا۔ مجاز کو بہزار خرابی تانگے پر بیٹھنے پر راضی کیا۔ جب تانگہ چلا تو ان پر ایک اور دورہ پڑا۔ وہ دفعتہً رونے لگے۔ کہنے لگے مجتبیٰ! میں بہت خراب ہو گیا ہوں مگر اس پر بھی میری ماں جب میں پہنچتا ہوں تو میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیتی ہے"...... روتے روتے نہ معلوم انھیں کیا سوجھی۔ کہنے لگے۔ جب میکسم گورکی کی ماں ہو سکتی ہے تو میری بھی ماں ہو سکتی ہے اور مجھے تقریباً چیخ چیخ کر حکم دیا کہ کہو "ماں"۔ پھر ہم دونوں نے ماں ماں کے نعرے لگانے شروع کئے۔ میں ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا۔ ممکن تھا وہ تانگے سے اتر جاتے اور شارع عام پر ہی چیخنے لگتے۔ رات ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر

---

[1] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۱۹۹

[2] ایضاً ایضاً ایضاً ۱۹۶

بڑی بھیڑ تھی۔ ہم دونوں ماں ماں کا نعرہ لگاتے ہوئے گذر رہے تھے[1] اور بقول منظر سلیم:

"یہ ماں ماں کی دردناک آواز راتوں کے سناٹے میں الہ آباد کی طرح دہلی اور بمبئی کی سڑکوں پر بھی گونجی ہوگی۔ جہاں تک لکھنؤ کا تعلق ہے یہاں رات گئے لال باغ اور حضرت گنج کے میکدوں میں بارہا سنی گئی ہے اور حضرت گنج سے نیو حیدرآباد تک گومتی کے اوپر سے گذرتی ہوئی شاہراہ یونیورسٹی روڈ پر بھی ایک دو بجے رات کو یہ دردناک چیخ بارہا سنائی دی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی یہ چیخ ان کے کسی قریبی دوست یا عقیدت مند نے سنی اور آب دیدہ ہوگیا۔ اور کبھی کسی شرابی نے سنی جس نے درد کی اس لہر کو قہقہوں کے طوفان میں بہا دیا۔"[2]

مجاز کی والدہ سے والہانہ اور شدید محبت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں جب اُن کی رندی عروج پر تھی محض والدہ کی خواہش کے احترام کے تحت لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کی بھی کوشش کی تھی[3] جہاں تک والدہ کے ساتھ سلوک کا تعلق ہے انھوں نے ہمیشہ تحائف اور دوسری ضرورت کی اشیاء اُن کو لاکر دیں۔ جب کبھی اُنھیں کہیں سے بھی پیسے میسّر ہوئے۔

"وہ اپنی والدہ کی بیحد عزت کرتے تھے۔ جب کبھی وہ باہر مشاعرے میں جاتے تھے تو مشاعرے کی رقم سے کبھی اپنی والدہ کے لئے کشمیری شال اور کرتے لاتے تھے اور کبھی کپڑے وغیرہ۔"[4]

شاعری کی دُنیا میں اتنی شہرت و عزّت حاصل ہونے کے باوجود کبھی اپنے والدین کو اپنا کلام نہیں سنایا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا کلام ریڈیو پر ان کے والدین کے گوش گذار ہوا ہو۔ ایک واقعہ کا بیان اُن کے بھتیجے سعید نعمانی نے یوں کیا ہے:

"کافی عرصہ ہوا ریڈیو اسٹیشن کے ایک مشاعرے میں اناؤنسر نے کہا۔ اب آپ حضرت مجاز لکھنوی سے اُن کا کلام سنئے۔ گھر میں سب لوگ مشاعرہ سُن رہے تھے۔ مجاز چچا کی والدہ بھی ریڈیو کے قریب بیٹھی تھیں۔ اُنھوں نے حضرت کا لفظ سُنا تو کہنے لگیں "اب کا پوچھے کو۔ مواہبت بڑا حجرت ہوگوا۔" (اب کیا پوچھنا ہے مواہبت بڑا حضرت ہوگیا ہے۔) مجاز کو والدین کے ساتھ ساتھ اپنے بھائی بہنوں سے بھی شدید محبت تھی۔ حمیدہ سالم نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ:

"میں پانچ سال کی تھی کہ میرے چیچک نکلی اور اس غضب کی کہ سارا جسم دانوں سے لد گیا۔

---

[1] و [2] مغنی آتشیں نفس۔ مجتبیٰ حسین۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۶۸۲۔۶۸۳۔ [3] ڈاکٹر محمد حسن کی ڈائری کے اوراق۔ نقوش۔ مارچ ۵۶۔ [4] ساقی شاعر اور رند۔ سید اختر نعمانی۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۲۱۱۔
[5] مجاز حیات و شاعری از منظر سلیم صفحہ ۸۵۔۸۶

ایسی حالت میں جو گھناؤنا عالم رہا ہوگا اس کا اندازہ ہو بھی کیا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دور سے بو آتی تھی۔ آبا نے احتیاطاً سب بچوں کا میرے پاس آنا بند کر رکھا تھا۔ لیکن جگن بھیا چھپ چھپ کر میرے پاس آتے، میرے دانوں پر نیم کی پتیوں سے کھجلاتے۔ مجھے کہانیاں سناتے لطیفے سناتے۔ آخر انھیں منع کرنا ہی چھوڑ دیا گیا۔ آج میں سوچتی ہوں کہ اُن کے دل میں کتنی نرمی تھی۔ کیسا گداز تھا۔ طبیعت میں کتنا خلوص تھا۔ کیسی ہمدردی تھی جو وہ میرے گھناؤنے قرب کو اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر ترجیح دیتے تھے۔ ویسے بھی بیماروں کی تیمارداری کا اُن میں بڑا ہنر تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی بیمار ہوتا تو دوا پلانے کی ذمہ داری انھیں کے سر ہوتی اور خاندان کا یہ بے خبر لاابالی اور لاغیر اچہ اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو پوری کامیابی کے ساتھ سنبھالتا۔[1]

اپنی بہنوں سے مجاز کی اتنی شدید محبت کا ہی نتیجہ تھا کہ باوجود اس کے کہ وہ طبیعتاً لاابالی قسم کے انسان تھے، لیکن بہنوں کی تعلیم سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ صفیہ کو انگریزی کی تعلیم مجاز نے ہی دینی شروع کی تھی۔ اور حمیدہ سالم کے درس و تدریس کا ذمہ تو گویا انھیں کے سر تھا۔ کیونکہ یہ ذمہ انھوں نے خود لے رکھا تھا۔

میرا پڑھنے میں دل بالکل نہ لگتا تھا۔ نہ جانے کتنے قاعدے میرے لئے آئے ہوں گے اور میں الف زبر آ۔ ب زبر بَ سے آگے نہ پڑھ سکی۔ کتابیں نہ جانے میں غائب کر دیتی تھی یا خود غائب ہو جاتی تھیں۔ میری تمام دلچسپی گڑیوں، ہنڈکلیوں یا پھر سہیلیوں کے ساتھ محلہ بھر میں گھومنے میں تھی۔ ایک دن جب اُستانی جی نے میری طرف سے بالکل مایوسی کا اظہار کیا تو ماں نے بہت ہی رقت آمیز لہجے میں مجھے سمجھایا کہ نہ میری شکل نہ صورت آخر پڑھے لکھے گی نہیں تو کہاں کھپے گی۔ تصور بہت خوفناک تھا۔ میں نے رونا شروع کر دیا۔ جگن بھیا اس منظر سے بہت متاثر ہوئے۔ فوراً اٹھے۔ اور روئی والے صندوق سے ایک بادامی رنگ کا قاعدہ نکال کر لائے اور استانی جی سے میرا پڑھنا ختم کروا کر خود پڑھانا شروع کیا۔ بس اُس دن سے میں چل نکلی۔ کہہ نہیں سکتی کہ اُن کے پڑھانے کا ڈھنگ تھا یا ہم دونوں کے درمیان کا جذباتی بندھن۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو اُس دن سے پڑھائی میں میری بد دلی اور بدشوقی ختم ہو گئی جس وقت تک اسکول میں میرا داخلہ

---

[1] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۱۸۵۔

نہ ہوا وہی پڑھاتے رہے۔ اُردو، انگریزی اور حساب۔ سب ہی کچھ اُن کی ذمہ داری تھی۔ چھوٹے موٹے مضمون لکھواتے اور سب کے سامنے پڑھوا کر سنتے اور بہت خوش ہوتے۔ [1]

بچوں سے اُن کو ایک خاص شغف تھا۔ صفیہ اختر اور ان کے بچوں سے تو اُن کو بےحد محبت اور لگاؤ تھا۔ جس زمانے میں جاں نثار اختر اور صفیہ گوالیار میں رہتے تھے۔ جاں نثار نے مجاز کو گوالیار کے ایک مشاعرے میں مدعو کیا تھا۔

مجاز نشے کی حالت میں صفیہ کے سامنے نہیں جاتے تھے اور صفیہ بھی اس کو ملحوظ رکھتی تھیں۔ لیکن گوالیار کے قیام کے دوران ایک رات نشے کی حالت میں گھر کے ایک کمرے میں صفیہ اختر کے بارے میں جاں نثار اختر سے باتیں کرتے کرتے یہ بھول گئے کہ وہ نشے میں ہیں اور انھوں نے صفیہ کو بلانے کی فرمائش کی اور بعد میں احساس دلانے پر وہ احساسِ ندامت سے رو پڑے جس کا ذکر جاں نثار اختر نے خود اپنے مضمون میں کیا ہے۔

حد یہ تھی کہ مجاز نے کبھی صفیہ کے سامنے پی کر آنے کی ہمت نہیں کی، لیکن اس رات وہ صفیہ کے متعلق بے تحاشا باتیں کرتے کرتے یہ بھول گیا کہ وہ بہت زیادہ نشے کے عالم میں ہے اور اُس نے ایک بارگی مجھ سے کہا۔ اختر! صفیہ کو بلا لاؤ۔"

"میں نے اندر جا کر صفیہ سے کہا:" مجاز تمھیں بلا رہے ہیں، لیکن صفیہ تیار نہ ہوئی۔ اُس نے کہا۔ اختر تم یقین کرو۔ میں نے کبھی اسرار بھائی کو اس عالم میں نہیں دیکھا ہے۔ اور نہ میں انھیں اس عالم میں دیکھنے کی تاب رکھتی ہوں۔ یہ میری جذباتی کمزوری ہے۔ پھر اگر میں اس وقت بالفرض چلی بھی جاؤں تو اسرار بھائی پر صبح اپنی اِس جرأت کا بہت بُرا ردِ عمل ہوگا اور وہ کل تو چلے ہی جائیں گے، لیکن شاید پھر کبھی میرے گھر آنے کی ان میں ہمت نہ رہے۔

میں نے صفیہ سے کوئی اصرار نہیں کیا اور باہر آکر مجاز سے صفیہ کی کمزوری بیان کر دی۔ صفیہ کے انکار پر مجاز نے بے قابو ہو کر رونا شروع کر دیا۔ میرے گلے میں دونوں ہاتھ ڈالے وہ بڑی دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا اور اُدھر صفیہ نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ آخر اسی عالم میں مجاز بغیر کھانا کھائے بستر پر سوگیا۔ اور صفیہ اُس کے سرہانے اس کے سر پر ہاتھ رکھے رات بھر بیٹھی روتی رہی۔

---

[1] جگن ناتھ بھیا۔ حمیدہ سالم، مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔

صبح جب مجاز کی آنکھ کھلی تو صفیہ نے مجاز کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور دیر تک اس کے سینے میں منہ چھپائے روتی رہی۔ مجھے نہیں معلوم مجاز نے صفیہ سے یا صفیہ نے مجاز سے کچھ کہا یا نہیں کیونکہ میں اس کمرے سے باہر چلا آیا تھا۔ اگر نہ چلا آتا تو خود میرے رو پڑنے میں کسر نہ رہ گئی تھی۔[1]

مجاز کو صفیہ سے کس قدر محبت تھی اس کا اندازہ اُس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے صفیہ کی موت پر سہیل عظیم آبادی کو لکھا تھا:

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا ذہن ہمیشہ کے لئے سو گیا ہو"[2]

مجاز کو بڑوں کے ساتھ ساتھ اپنے چھوٹوں سے بھی بہت زیادہ پیار تھا۔ وہ کسی کی دل شکنی نہ کرتے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کیا کرتے۔ جو لوگ شاعر ہوتے ان سے ان کے کلام سنتے اور داد دیتے۔ اور انھیں خوب سے خوب تر کہنے کی ترغیب دیتے۔

وہ اپنے چھوٹوں سے نہایت پیار و محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ گھر کے بچوں کے ساتھ کبھی تاش کھیلتے تھے، کبھی کرکٹ۔ ان کو نئے نئے کھیل سکھاتے رہتے تھے۔ آج گھر میں مجاز چچا کی ہر شخص محسوس کرتا ہے۔"[3]

مجاز چچا بلا کے سخن فہم تو تھے ہی۔ اسی کے ساتھ وہ جوہر شناس بھی تھے۔ وہ نئے شاعروں کی جن میں ذرا بھی صلاحیت پاتے تھے، ہمت افزائی کرتے تھے۔ انھوں نے بارہا نئے شاعروں کی تعریف کی ہے۔ جب میں نے کوئی غزل یا نظم کہی اُن کو بغیر سنائے نہ رہا۔[4]

مجاز کو اپنی بڑی بہن عارفہ خاتون سے بھی بہت محبت اور عقیدت تھی۔ ان کے انتقال (۲۰ جون ۱۹۵۱ء) پر جو قطعہ مجاز نے لکھا ہے اُس سے اُن کے شدید رنج و غم کا اور ساتھ ہی عقیدت و احترام کا اظہار ہوتا ہے:

زندگی کیا ایک سعیِ رائیگاں — برق کے سائے میں شاخِ آشیاں
اک اشارے میں اجل کے دفعتاً — رُک گیا ہے زندگی کا کارواں
ہر کلی اِس باغ کی ہے اشکبار — ہر گل اس گلشن کا ہے نوحہ کناں

بوستاں میں تُربتوں کا اک ہجوم
عارفہ خاتون زیبِ بوستاں

---

[1] میرا دوست میرا ہمدم۔ جاں نثار اختر۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۰۵-۲۰۶ [2] میرا دوست میرا ہمدم۔ جاں نثار اختر۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۰۵۔ [3] چچا ساتھی شاعر اور رند۔ سعید اختر نعمانی۔ صفحہ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔
[4] چچا ساتھی شاعر اور رند۔ سعید اختر نعمانی۔ صفحہ ۲۱۵۔

بہنوں کے بچوں سے بھی اُتنا ہی پیار تھا جتنا کہ بہنوں سے۔ بلکہ بچوں سے کچھ زیادہ ہی اُنسیت اور لگاؤ رکھتے تھے۔

"گھر میں ماشا اللہ بچوں کی تعداد بہت کثیر تھی۔ سات عدد بچے تھے۔ دو صفیہ آپا کے۔ دو میرے۔ تین میرے بھانجے کے۔ ان سب میں بھانجے کا تین سالہ بچہ عُرفی انھیں زیادہ عزیز تھا۔ اماں کہتی ہیں کہ اس کا بچپن بالکل جگن بھیا جیسا ہے۔ بہت شریر اور بے خبر۔ اس سے خود کو استاد کہلاتے اور کہتے کہ یہ میرا شاگرد ہے۔ اس کو اپنے پاس کھڑا کر لیتے، تب کھانا کھاتے۔ وہ اپنی گندی گندی انگلیوں سے سالن کے پیالے کی بوٹی چھین جھپٹ کیا کرتا۔ آخر کو آدھی آدھی پر معاملہ طے ہو جاتا۔"[1]

صفیہ اختر کے اویس اور جاوید سے بھی شدید محبت تھی جس کا اظہار اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ابھی وہ رانچی سے ٹھیک ہو کر ایک ماہ پہلے لوٹے تھے اور وہ پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہ تھے اور احساس شکست نے ان کے وجود میں گھن لگا دیا تھا، لیکن صفیہ اختر کے انتقال کے بعد ایک بار پھر مجاز کے اندر احساس ذمہ داری پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے تمام غموں اور محرومیوں کو بھلا کر، بچوں کی دل جوئی میں مصروف ہو گئے۔

"ان کی واپسی کے ایک مہینہ بعد صفیہ آپا کا انتقال ہوا۔ اس صدمے کا اثر اُن پر بجلی کے شاک کا سا ہوا۔ جیسے اک دم چونک پڑے ہوں۔ ایک دفعہ پھر ان میں ذمہ داریوں کا احساس چمکا۔ جاوید۔ اویس کی پڑھائی اور دیگر مشغلوں میں دل چسپی لینا، ان کی دل جوئی کرنا۔ زیادہ تر وقت گھر پر گزارنا۔ شراب سے قطعی پرہیز۔ رات کو جی بھر کے سوتے۔ دن میں ہنستے کھیلتے باتیں کرتے۔ گھنٹوں سب کے ساتھ تاش کھیلا کرتے۔ بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ تصویریں بنا بنا کر سب میں بانٹتے۔ چھوٹے بچوں کو ایک دوسرے سے لڑواتے۔ ایسا لگتا جاوید۔ اویس۔ عشو۔ عرفی کے بچپن میں میرا بچپن دُہرا رہا ہو۔ جگن بھیا پھر بیس پچیس سال والے جگن بھیا بن گئے ہوں۔"[2]

مجاز اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ بھی بے پناہ خلوص و محبت سے پیش آتے تھے جس کی وجہ سے ان کے تمام اعزا و اقربا اُن کے پُرخلوص مزاج اور رویّے کے معترف ہیں۔ جناب فریدالحق صاحب کا کہنا ہے کہ مجاز سے زیادہ خلوص و محبت، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، دوستوں سے ہمدردی

---

[1] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۱۹۹۔ [2] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۱۹۸۔

و مروّت کا سلوک کرنے والا انسان میں نے کم ہی دیکھا ہے۔ گو کہ وہ میرے چچازاد بھائی کے لڑکے تھے، لیکن وہ میرا جتنا احترام و عزت کرتے تھے شاید میرا اپنا بھتیجا بھی نہ کر سکتا۔ ان کی اس محبت اور خلوص کا ذکر کرتے ہوئے دورانِ گفتگو ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ انھوں نے فرمایا کہ علاوہ شراب نوشی کے اُن کے کردار کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کوئی غلط بات مجھے معلوم ہو۔ انھوں نے کبھی کسی کی غیبت اور برائی نہیں کی۔ باوجود اس کے کہ وہ زمیندارانہ ماحول میں پلے تھے، غریبوں اور کمزوروں سے محبت و ہمدردی کا جذبہ بے حد تھا۔[۱]

مجاز کی اس منفرد شخصیت کی اور اُن کے پُرخلوص جذبۂ محبت کی تعریف ان کے ایک بھتیجے سید نعمانی صاحب نے بھی کی ہے۔ مجاز کو اس سے اس قدر محبت اور بے تکلفی تھی کہ کبھی احساس تک نہیں ہونے پایا کہ چچا اور بھتیجے کا رشتہ حائل ہے۔ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ دوستوں کا سا سلوک کرتے تھے۔

"میری سب سے بڑی کمزوری سگریٹ ہے، مگر میں اُن کے سامنے سگریٹ نوشی سے پرہیز کرتا تھا۔ وہ چچا جو ٹھہرے۔ انھوں نے بھانپ لیا۔ مجھ سے پوچھا۔

"اختر! تم سگریٹ نہیں پیتے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "چچا! آپ کے سامنے کیسے پیوں؟"

انھوں نے فوراً جیب سے سگریٹ نکال کر دیا۔ "لو پیو۔ مجھ سے چچا بھتیجے والی بات مت کیا کرو۔ تم بھی شاعر ہو۔ میں بھی شاعر ہوں، سب برابر ہیں۔ یہ چچا اور بھتیجا کیا ہے"[۲]

سید نعمانی صاحب نے مجاز کی خوبیاں ان الفاظ میں بیان کی ہیں:

مجاز چچا میں جہاں اور خوبیاں تھیں وہاں یہ خوبی بھی تھی کہ انھوں نے کبھی کسی کی غیبت اور اور برائی نہیں کی۔ نہ ریاکاری سے کام لیا۔ اگر کسی کے متعلق کچھ کہا تو اُس کے سامنے اور اس طرح کہ اس کو برا نہ لگے۔ وہ مذاق ہی مذاق میں تلخ سے تلخ بات کر جاتے تھے مگر کیا مجال کہ کسی کو بُری لگی ہو۔ اُن میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ کسی کو کوئی تکلیف اپنی ذات سے نہیں پہنچنے دیتے تھے۔[۳]

بے تکلفی اور محبت کا ایک واقعہ اپنے سلسلہ سے سید صاحب نے ذکر کیا ہے کہ کسی محفل میں مجاز شراب نوشی میں مشغول تھے، اتفاقاً سید صاحب بھی وہاں پہنچ گئے اور مجاز کو اس حالت میں دیکھ کر

۱۔ فرید الحق صاحب سے دورانِ گفتگو معلوم ہوا ہیں۔

۲۔ چچا ساتھی شاعر اور رند۔ سید اختر نعمانی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۱۲-۲۱۳

۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃 صفحہ ۲۱۳

واپس جانے کا ارادہ کرنے لگے تاکہ مجاز کی دل چسپیوں میں خلل نہ پڑے لیکن مجاز نے انھیں دیکھ لیا۔ اور اپنے قریب بلاکر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"میرے بھتیجے صاحب! مجھے معاف کرنا۔ مگر آج تم مجاز سے مل لو۔ اب تک تم اسرار الحق سے اور اپنے چچا سے ملتے رہے ہو۔"

شاہ معین الدین صاحب ندوی جو ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ تھے۔ مولوی، عالم اور شریف آدمی تھے اور رشتے میں مجاز کے بھائی ہوتے تھے۔ ان کی مجاز سے ملاقات بہت کم ہو پاتی تھی۔ جب بھی وہ ان کے والد صاحب سے ملنے لکھنؤ آئے اکثر مجاز گھر پر نہ ملے۔ اس کے باوجود چند ملاقاتوں کے بعد ان کی شخصی خصوصیات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"اگرچہ مجاز کا مذاق اور اُن کی سوسائٹی بالکل بدل گئی تھی اور وہ خود ایسے عالم میں رہتے کہ ان کو خود اپنا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اس کے باوجود ان کے شریفانہ جوہر بالکل ضائع نہیں ہوگئے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اُن میں شراب نوشی کی عادت کے سوا جتنا بھی برا کہا لیا جائے اور اخلاقی برائی نہیں تھی۔ اگرچہ مجھ سے ملاقات کی نوبت شاذ و نادر آتی تھی لیکن جب کبھی اتفاقیہ ہو جاتی تھی تو ان سے کوئی تہذیبی فرو گذاشت نہیں ہونے پاتی تھی اور وہ پرانے ادب و تہذیب کا پورا خیال رکھتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ ان کو سرخوشی کے عالم میں دیکھا ایسے وقت میں وہ بھی ملنے سے گریز کرتے تھے اور میں بھی نظر بچا جاتا تھا۔"

مجاز کی شخصیت کا ایک دلکش پہلو یاردوستوں کی مساواتی اور آزاد فضا میں نکھرا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف وہ اپنے خاندان اور عزیز و اقارب کو عزیز تھے بلکہ اُن کے دوست و آشنا جو ان سے دو چار گھڑی کے لئے بھی مل بیٹھتے ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے اور ان کا قصیدہ پڑھنے لگتے۔ نتیجہ میں ان کی مقبولیت و شہرت ملک کے تمام صاحب علم و ارباب شوق میں یکساں طور پر تھی۔ بقول حسن عسکری صاحب "مجاز نے کچھ ایسی طبیعت پائی تھی یا ایسی طبیعت بنائی تھی کہ ان کی طرف متوجہ ہونے کے لئے ان کے کلام سے واقف ہونا ضروری نہ تھا، بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان کی شخصیت ان کے اوپر اس طرح غالب آئی کہ آخر ان کی شاعری کو ختم کرکے رکھ دیا۔"[1]

مجاز کی شخصیت کی یہی دل کشی تھی کہ ان کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا جس میں بوڑھے،

---

[1] مجاز اردو ادب کا افسانہ۔ محمد حسن عسکری۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۳۳۔

ہم عمر، ہم مشرب، سخنور، سخن فہم سبھی شامل تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے حال آنکہ کم بولتے پھر بھی دو چار جلوں میں یہی میر محفل نظر آنے لگتے۔ اپنے دوستوں کی خاطر دکھ اٹھانا، ان کے لئے سب کچھ کر گذرنے کا جذبہ، یہ اُن کی فطرت تھی۔ ان کو اپنے دوستوں سے دکھ درد بھی ملتے۔ وہ اسے خاموشی سے نظر انداز کر جاتے اور اگر زبان سے کچھ نکلا تو صرف اتنا کہ ؎

رو دیں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

یا جب زیادہ تلخی کا احساس ہوا تو ؎

آوارہ و مجنوں ہی پہ موقوف نہیں ہے ملنے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ

مجاز کے دوستوں کی فہرست ان کی اپنی فطرت اور دل کش شخصیت کی وجہ سے کافی لمبی ہے۔ جو ان سے ایک بار مل لیا وہ اس سے اس خلوص سے ملے اور کچھ ایسی بے تکلفانہ گفتگو کی اور ایسا گھل مل گئے کہ خود بھی دوست قریب نظر آنے لگے، اور ملنے والوں کا دوستوں کی لسٹ میں ایک اضافہ ہو گیا لیکن جنھیں واقعی دوست، یا غمار، ساتھی کہا جا سکتا ہے ان کی بھی تعداد اچھی خاصی ہے۔

جوش، جذبی، میکش، سردار جعفری، فرحت اللہ انصاری، سجاد ظہیر، سبط حسن، رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، رضا انصاری، عبادت بریلوی، احتشام حسین، فراق، مجتبیٰ حسین، فیض، آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن۔ بزرگ دوستوں میں جگر صاحب، مولوی عبدالحق صاحب، عصمت چغتائی وغیرہ۔

مجاز اور سردار جعفری کا تقریباً بائیس۲۲ سال تک ساتھ رہا۔ دونوں ایک دوسرے سے بعید قریب تھے۔ مجاز سے ان کی ملاقات علی گڑھ میں پہلی بار ہوئی اور پھر شب و روز کی ملاقاتوں کا سلسلہ برسوں رہا جس کے زیر اثر سردار جعفری نے مجاز کا ذکر بڑے پر خلوص انداز میں کیا ہے۔

"اسی زمانے میں مجاز سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہنس مکھ اور تندرست تھا۔ اور اُس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ دہانہ تب بھی بہت کم کھلتا تھا، لیکن ترنم کا جادو اپنے شباب پر تھا۔ مجھے یاد ہے ۱۹۳۶ء کی ایک شام مجاز رشید جہاں کے گھر پر اپنی کوئی نظم سنا رہا تھا۔ محمود الظفر، شوکت عمر اور خواجہ منظور حسین بھی وہاں تھے۔ دو بچیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک بچی نے کچھ کہا تو دوسری بچی نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا کہ "چپ رہو باجا بج رہا ہے"۔ مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ مجاز شاعر ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی کورٹ میں ٹینس کھیلتے تھے۔ ایک روز مجاز کھیل کر واپس جا رہا تھا کہ اس کی پتلون تار میں اُلجھ کر پھٹ گئی۔ غوث محمد نے ہنس کر کہا۔ شاعر صاحب کی پتلون پھٹ گئی اور میں نے

مڑکر دیکھا کہ یہ کون شاعر ہے۔ اسی رات کو یونین ہال کے مشاعرے میں مجاز سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ اس کی نظم اور ترنم دونوں میں جادو تھا۔ نظم انقلاب تھی اور اس کے ہر مصرعے میں مجھے اپنے دل کی دھڑکن محسوس ہوئی۔ اس دن سے ہم دونوں دوست ہو گئے۔ یہ دوستی بائیس برس تک اتنی ہی بے لوث اور خوبصورت رہی جتنی پہلے دن تھی۔[۱]

مجاز کے ساتھ اس وقت کی مصروفیاتِ زندگی کا کیسا تصوراتی منظر پیش کرتے ہیں:۔

"مجاز میرے سامنے ہے۔ اس کے نقرے تیروں کی طرح برس رہے ہیں۔ اس کی ہلکی سی معصوم مسکراہٹ اور بے پناہ خلوص اور دوستی مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ بائیس سال کی سیکڑوں راتیں اور سیکڑوں دن ہر طرف سے ہجوم کررہے ہیں۔ راتوں کے دل میں ٹوٹے ہوئے پیالے اور چھلکی ہوئی شراب ہے۔ دونوں ہونٹ پیاس سے سوکھے ہوئے ہیں۔ مایوسیاں اور مجبوریاں نوحہ خوانی کے عزائم پر ہنس رہی ہیں۔ نوحہ خوانی کی ترنگ سب کو روندتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ منصوبے بن رہے ہیں، کتابیں چھپ رہی ہیں۔ رسالے نکل رہے ہیں۔ کانفرنسوں اور مشاعروں پر دھاوے بولے جارہے ہیں۔ کبھی مجاز نظم سنارہا ہے اور اس کے ترنم کے جادو سے بچے اپنا کھیل بھول گئے ہیں۔ کبھی اس کی آواز ریشم کے ڈورے کی طرح ٹوٹی جارہی ہے:

- کلکتے کی ایک شام ہے اور مجاز رو رہا ہے۔
- بمبئی کی ایک رات ہے اور مجاز ناچ رہا ہے۔
- لکھنؤ کی برسات کا اندھیرا ہے اور مجاز بھیگتا ہوا چلا آرہا ہے۔
- کوئی سیاسی جلسہ ہے اور مجاز بیحد سنجیدہ ہے۔
- کوئی مشاعرہ یا ادبی جلسہ ہے اور مجاز بہکا جارہا ہے۔
- ریڈیو پر اس کا نام پکارا گیا وہ صرف ہنس رہا ہے۔

وہ اپنے ہزاروں رنگ اور روپ میں میرے سامنے ہے۔ وہ شمشیر جام اور ساز کا امتزاج تھا۔ کبھی شمشیر برہنہ ہوجاتی تھی تو ساز اور جام بھی کانپ جاتے تھے۔ کبھی چھلک اٹھتا تو شمشیر بھی ڈوب جاتی تھی۔"[۲]

مجاز کے ظرف اور اس کی شخصیت کے سب سے عظیم اور خوبصورت پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

---

[۱] پانچ راتیں۔ سردار جعفری۔ [۲] ہم پہ ہے ختم شام غریبانِ لکھنؤ۔ سردار جعفری۔ صفحہ ۲۲۴-۲۲۵۔

سردار جعفری نے لکھا ہے:

"مجاز کے اعصاب شیشے کی طرح نازک تھے اور ذرا سی ٹھیس میں چٹخنے لگتے تھے۔ وہ جس کی بذلہ سنجی مشہور ہے، جس کی حاضر جوابی ضرب المثل ہے، جس کے لطیفوں میں بھی شاعرانہ لطافت اور ذہانت ہے۔ کبھی سخت بات کا جواب نہیں دے پاتا تھا۔ جب دوستوں نے اس سے بدسلوکی کی ہے تو میں نے مجاز کو خاموش دیکھا ہے۔ اُس کی زبان پر کبھی کسی کی شکایت نہیں آتی تھی۔ معاصرانہ چشمک کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ ایک شاعر کا کلام پسند نہ آیا تو ہنس کر کہا: "فکر مت کرو جب تمھاری نظموں کا اُردو ترجمہ ہوگا تب لوگ تمھیں پہچانیں گے۔" جذبی صاحب نے بھی جن سے مجاز کی دوستی آگرہ کے قیام سے شروع ہوئی تھی، مجاز کے اوصاف حمیدہ کی تعریف کی ہے۔ حالانکہ انھوں نے خود مجاز سے معاصرانہ چشمک کا اظہار کیا اور کہا کہ اکثر وہ نشے کی حالت میں اپنے کو بہت بڑا شاعر کہتے تھے لیکن نشہ اتر جانے پر سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ کسی کی نہ بُرائی کرتے تھے۔ نہ سُننا ہی پسند کرتے تھے۔ انھیں کے توسط سے مجاز کی ملاقات میکش صاحب سے بھی ہوئی۔ اُن کے تاثرات مجاز کی شخصی خصوصیات کے بارے میں یہ ہیں:

"ان کا انداز ایسا تھا کہ ان کا غصہ، نفرت اور محبت کچھ بھی ان کے چہرے سے محسوس نہ ہوتا تھا۔ وہ ایک دہکتا ہوا انگارہ تھے جو راکھ میں دبا ہوا ہو۔ میں نے انھیں مختلف عمروں، مختلف حالتوں اور مختلف ماحول میں دیکھا ہے۔ کبھی بے خود ہو کر قہقہہ مارتے نہیں دیکھا۔ کبھی غصّے میں آپے سے باہر نہیں دیکھا، اور کبھی غم میں بے حال نہیں پایا۔ ان کے ہاتھ اکثر لرز جاتے تھے اور آنکھیں ضرور سب کچھ کہہ دیتی تھیں۔ مجاز اس وقت بھی ایسے ہی معلوم ہوتے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ ان کی فطرت عجیب تھی۔ ان کی بے تکلفی، اُن کے مذاق اور اُن کی ہنسی سب کی ایک حد تھی۔ معلوم نہیں سب کے ساتھ وہ ایسے تھے یا میرے ہی ساتھ یہ معاملہ تھا۔ ان میں دوستوں کو نوازنے اور انھیں یاد رکھنے کا بھی جوہر تھا۔ ایسے کتنے ہی لوگ میرے پاس آتے رہے ہیں، جو مجاز کے ذریعہ مجھ سے ملنے کے مشتاق ہوئے۔ وہ میرے یہاں کی صحبتوں کا ذکر بھی اکثر لاتے رہتے تھے۔ ان صحبتوں کی کیا باتیں انھیں یاد آتی تھیں مجھے نہیں معلوم۔ وہ مجھے وہ رسالہ بھیجتے رہے جن سے اُن کا تعلق رہا۔"[۲]

مجاز کو جوش کی بھی قربت حاصل رہی۔ دلّی کے دوران قیام جوادبی حلقہ مشہور و معروف

---

[۱] ہم پر ہے ختم شام غریبانِ لکھنؤ۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۳۱-۲۳۲

[۲] مجاز مرحوم۔ میکش اکبر آبادی۔ صفحہ ۳۷۸-۳۷۹

تھا۔ اس میں یہ دونوں حضرات کافی نمایاں تھے۔ یہ دونوں حضرات ہم خیال اور ہم مشرب بھی تھے۔ دونوں کے دلوں میں سامراج دشمنی کا جذبہ تھا۔ اور ملک کی غلامی سے شدید کرب اور تڑپ محسوس کر رہے تھے۔ سیاسی خیالات، معاشی اور معاشرتی نظریات ایک سے تھے۔ فکری رجحانات اور ذہنی میلانات میں کافی مماثلت تھی۔ صرف اندازِ بیان مختلف تھا۔

جوش مجاز کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی شراب نوشی پر بے حد متفکر رہتے۔ انھیں یہ صدمہ تھا کہ مجاز اپنے کو غرقِ مئے ناب کر رہے ہیں، لیکن پینے والے جب ایک میز پر شغل مئے و مینا کے لئے یکجا ہو جاتے ہیں اُس وقت وہ ایک دوسرے کے لئے ناصح مشفق نہیں بن سکتے لیکن انھیں جب ہوش آتا تو مجاز کے حالِ زار پر افسوس کرتے۔ مجاز کی زندگی میں سب سے زیادہ مجاز کی تعریف کرنے والا اگر کوئی تھا تو وہ جوش خود تھے۔ وہ مجاز کے زبردست مدّاحوں میں تھے۔ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ جس نے انھیں "پند نامہ برائے مجاز" لکھنے پر مجبور کیا۔ ظاہر میں تو وہ ایک عام پند و نصیحت بھی ہے۔ کچھ ذاتی بھی۔ لیکن اس کے باوجود اس میں مجاز کا جیتا جاگتا سچا نقشہ کھینچا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اے مجاز اے ترانہ باز مجاز	زندہ پیغمبرِ بہار مجاز
اے بروئے سمن وشاں گل پوش	اے بہ کوئے مغاں تمام خروش
اے پرستار مہ رُخانِ جہاں	اے کماندارِ شاعرانِ جہاں
تجھ سے تاباں جبینِ مستقبل	اے مرے سینۂ امید کے دل
اے مجاز اے مُبصرِ خد و خال	اے شعورِ جمال و شمعِ خیال
اے ثریّا فریب و زُہرہ نواز	شاعرِ مست و رندِ شاہد باز
ناقدِ عشوۂ و شباب ہے تو	صُبحِ فردا کا آفتاب ہے تو
تجھ کو آیا ہوں آج سمجھانے	حیف ہے تو اگر بُرا مانے
خود کو غرقِ شراب ناب نہ کر	دیکھ اپنے کو یوں خراب نہ کر
شاعری کو تری ضرورت ہے	روحِ فردا کی تو امانت ہے
اک ٹھہراؤ اک تکان ہے تو	دیکھ کس درجہ دھان پان ہے تو

جوش کی محبت و شفقت کی یہ انتہا ہے کہ انھوں نے مجاز کو سینۂ امید کا دل کہا اور ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"مرگ مجاز نے دل کو برباد کر کے رکھ دیا۔ کاش وہ زندہ رہتا میں مرجاتا۔
ہائے ہائے۔" جوش

"میرا خیال تھا کہ یہ چراغ جو مجھ نامراد نے جلایا ہے تو اس چراغ کو روشن رکھے گا۔ اور مزید روغن ڈال کر اس کی لو کو تو اُکسائے گا اور اس چراغ سے سیکڑوں نئے چراغ جلتے چلے جائیں گے، لیکن صد حیف کہ تو ہی بجھ کر رہ گیا۔ میری امید کا چراغ شاید اب کبھی نہ جل سکے گا۔" [1]

یہ مجاز کی لالہ زار شخصیت ہی تھی جس نے جوش جیسے شاعر کو متاثر کیا۔ مجاز کے بمبئی کے دورانِ قیام جب جوش صاحب کو اطلاع ملی تو وہ ان کو اپنے ساتھ پونا لے گئے اور بقول رضیہ سجاد ظہیر کے انھوں نے کہا کہ "مجاز پر ہمارا بھی تو حق ہے۔"

مجاز دل کے نرم اور نیک سیرت ہونے کی تعریف عصمت چغتائی نے بھی کی ہے گو کہ اُن کا ساتھ کم رہا ہے۔ مجاز کے بارے میں ان کے تاثرات یہ ہیں :۔

"مجاز نے کچھ ایسی شخصیت پائی تھی کہ جو اُن سے ایک بار مل لے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔" [2]

مجاز کی شخصیت میں بھی اپنے زمانے کے تمام مجازی دیکھیے اور واقعہ یہ ہے کہ مجاز تنہا نہیں۔ وہ اپنے وقت کے سارے دکھوں، الجھنوں، بندشوں اور رکاوٹوں کے خلاف پکارتا ہوا اٹھا اور خوب اٹھا۔

مجاز کے اندر جو نازک مزاجی اور صلہ رحمی کا جذبہ تھا ان کا ذکر علی سردار جعفری، ظ۔ انصاری اور عصمت چغتائی نے بڑے ڈرامائی انداز میں کیا ہے :۔

"مجاز عجیب قسم کا بزدل ہے۔ ویسے تو قلم کے بل بوتے پر خون کی آندھیاں چلوا سکتا ہے۔ سُرخ طوفان لا سکتا ہے، لیکن اگر اس کے سامنے ایک ننھی سی چوہیا کی ٹانگ میں ڈورا باندھ کر کُھردری سڑک پر گھسیٹیں تو وہ رو پڑے گا۔"

پچھلے دنوں جب ملک میں فسادات اور جیتے جیتے خون کی ہولی کھیلی گئی تو وہ دماغی طور پر سہم کر کونے میں دبک گیا۔ دُنیا کو ایک رشتہ میں بندھا ہوا دیکھنے کی آرزو مند آنکھوں سے جب انسانی کھوپڑیاں سڑک پر پتھروں سے ناریل کی طرح پھوٹتی دیکھیں تو اس کی روح تک لرز اٹھی اور وہ کئی گھنٹے بیہوش رہا اور کچھ دنوں مُنہ میں نوالہ نہ ڈال سکا۔ [3]

---

[1] مجاز کی موت پر جوش کے تاثرات۔ مجاز ایک آہنگ صـ۹۲۔

[2] عشق مجازی۔ عصمت چغتائی۔ صفحہ ۲۴۷۔ [3] عشق مجازی۔ عصمت چغتائی۔ صفحہ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔

سجاد ظہیر صاحب نے جو مجاز کے مداحوں میں تھے اور بہت ہی پُر خلوص بزرگ دوستوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ روشنائی میں مجاز کا ذکر بڑے نرالے انداز میں کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے اوصافِ حمیدہ پر روشنی ڈالی ہے:۔

" اس ہلکے پھلکے اور نوکیلے شخص میں اپنی جوانی کے اُس زمانے میں بھی نیش کے معنوں میں بھی نوک نہ تھی۔ وہ تو اس لحاظ سے سرتاسر نوش تھا۔ نہایت منکسرالمزاج، شرمیلا اور کم سخن۔" [1]

جگر صاحب بھی مجاز کی شخصیت اور خوبیوں سے بےحد متاثر نظر آتے ہیں:۔

" مجاز کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ وہ بڑے آدمیوں میں نہیں تھے وہ اُن نام نہاد برگزیدہ اور پاک نہاد انسانوں سے بہتر زندگی کے مالک تھے جن کے باطن میں خام کاریوں اور برائیوں کی ایک دنیا آباد ہے لیکن وہ سماج میں عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ کم و بیش میرے تجربے میں دو قسم کے انسان آئے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو فطرتاً عیار اور چالاک ہونے کے باوجود ساری عمر پاکبازی اور نیک نامی کا تمغہ اپنے سینے سے جدا نہیں ہونے دیتے۔ دُنیا آخر تک اُن کے متعلق دھوکے میں مُبتلا رہتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو فطرتاً لطیف و معصوم طبیعت رکھنے کے باوجود غلط سوسائٹی، تخریبی رُجحان اور ماحول کے اثرات کے زیرِ اثر اپنی فطرت سے بالکل مختلف اور متضاد سانچے میں ڈھل جاتے ہیں .... مجاز اس دوسری قسم کے انسانوں میں سے تھے۔ ان کی رندی اور بے ہوشی میں کتنا حُسن، حد تجاوز سے بڑھتے ہوئے اعمال میں کتنی معصومیت اور کتنی سادگی تھی۔ ان کے لبوں سے پھلجھڑیوں کی طرح چھوٹتے ہوئے قہقہوں میں زندگی کا کتنا سوز، کس قدر زہر ملا ہوا اور کتنی کراہیں پوشیدہ تھیں۔ اسے وہی لوگ بہتر جان سکتے ہیں جنھیں مجاز سے قریب آنے کا، ان سے متواتر ملنے کا اور اُنھیں برتنے کا مسلسل موقع ملا۔

اپنی پوری باغیانہ روش، بدمستیوں اور لغزشوں کے باوجود مجاز کے کردار میں جتنی شرافت، تہذیب، وضع داری اور مروّت تھی اور شرفیہ کا جتنا نکھار تھا، میں نے کم نوجوانوں میں ایسی مثالیں دیکھی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اُن لوگوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں جنھیں خود کو قدیم کہتے ہوئے ندامت کے بجائے فخر کا احساس ہوتا ہے۔" [2]

ملک راج آنند جب وہ مجاز سے ملے تھے تو ان کے تاثرات یہ ہیں:۔

" وہ انتہائی گرم جوش طبیعت کا مالک ہے اور جہاں وہ نرمی اور محبت سے فوراً متاثر

---

[2] جگر مرادآبادی کے تاثرات قومی آواز مجاز نمبر دسمبر ۱۹۵۵ء

ہو جاتا ہے۔ وہیں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی طرف ہلکے سے اشارے پر بھی مکدر ہو جاتا ہے۔[1]

حیات اللہ انصاری نے جو مجاز کے گہرے دوستوں میں تھے دورانِ گفتگو بتایا کہ مجاز میں سہل پسندی اور لاؤ بالی پن شروع ہی سے تھا۔ جو پیسے اُن کی جیب میں ہوتے وہ اُسے فوراً خرچ کر دیتے۔ آگے کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچتے۔ وہ بیحد پُر خلوص طبیعت کے مالک تھے۔ غیبت اور عیب جوئی جیسی عادتیں تو ان کو چھو کر بھی نہ گئی تھیں۔[2]

مجنوں گورکھپوری مجاز کے ذاتی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس کی جگہ میرے دل میں ہمیشہ اس وجہ سے رہے گی کہ وہ اپنی خستہ و رنجور حالت کے باوجود نہایت پاک باطن، خوش اعتقاد، نیک سیرت اور شریف النفس انسان تھا۔ میری عمر اسی میں گذری ہے اور مجھے اس کے بہت سے موقعے ملے ہیں کہ میں انسان کو، وہ شاعر ہو یا غیر شاعر، پرکھوں۔ اور میں یہ برابر کرتا رہا ہوں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مجاز سے زیادہ حلیم اور شریف اس کی نسل میں کوئی نہیں ملا۔[3]

رضا انصاری صاحب جن سے مجاز کے بڑے گہرے مراسم تھے انھوں نے دورانِ گفتگو مجاز کی شخصیت کے بارے میں بتایا کہ وہ نیک طبیعت اور پُر خلوص انسان تھے۔ کبھی کسی کو تکلیف دینا، غیبت کرنا، حتیٰ کہ کسی کی غیبت سُننا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ عام طور سے لوگوں کی رائے ہے کہ وہ ہر حسین چہرے کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔ رضا صاحب کا کہنا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ وہ کبھی بھی پیش قدمی نہ کرتے جب تک کہ اِذن دوسری طرف سے نہ ہوتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی نے اس کا زندگی کی کٹھن راہوں میں ساتھ نہ دیا۔[4]

آل احمد سرور مجاز کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مجاز سرتاپا شاعر تھا۔ خوابوں کی دنیا کا رہنے والا۔ زندگی کے تلخ حقایق کا علاج مجبوراً شراب میں ڈھونڈتا تھا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت نے اسے شرافت، تہذیب، حسنِ معاشرت کے کچھ معیار دئے تھے۔ طبیعت میں اتنی مضبوطی نہ تھی کہ ان کی خاطر یا ان معیاروں کی خاطر جو ایک علمی و ادبی تحریک سے وابستگی کی وجہ سے اس نے قبول کر لئے تھے۔ وہ ریاض کرتا۔ وہ رند تھا۔ اس میں عاشق کا ولولہ تھا۔

---

[1] ایک شاعر ایک شہید۔ ملک راج آنند صفحہ ۲۷۔ [2] حیات اللہ انصاری سے انٹرویو جو ٹیپ میں محفوظ ہے۔

[3] مجنوں گورکھپوری کے تاثرات۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۸۰۵۔ [4] رضا صاحب سے دورانِ گفتگو یہ باتیں معلوم ہوئیں جو ٹیپ میں محفوظ ہیں۔

مجاہد کے کردار کی صلابت نہ تھی۔ اس کی ابتدائی تربیت نے جو نقش دل میں بٹھا دئے تھے انھیں وہ محو نہ کر سکا نئے رنگ کا جو نشہ چڑھ گیا تھا وہ اُتر نہ سکا۔ اسی کش مکش نے اسے جہاد زندگی میں اپنا راستہ نکالنے کے بجائے ناکامی و نامرادی کے راستے پر لگا دیا۔ مگر اس کے کردار کی خوبی یہ ہے کہ مردم بیزار، یا تلخ یا قنوطی کبھی نہیں ہوا۔ پیہم ناکامیوں کو جھیلنے یا بھلانے کی کوشش کرتا رہا۔ کبھی لطیفوں میں اور کبھی شراب میں۔[1]

"مجاز کی صاف طبیعت اور بلندی کردار کا تذکرہ سرور صاحب یوں کرتے ہیں :

"مجاز نے کبھی کوئی ٹولی نہیں بنائی۔ شہرت کے لئے اس نے کوئی جال نہیں بچھایا۔ ہم عصروں میں سے ہر ایک سے اسی کی سطح پر ملتا رہا۔ اُس کے دوستوں میں ہر مشرب اور مسلک کے آدمی تھے۔ ایک کی برائی دوسرے سے کرنا اس کا شعار نہ تھا۔ وہ سب کا دوست تھا صرف اپنا دشمن تھا۔ ماحول نے اس کے ساتھ بے حسی اور بے پروائی برتی مگر اس نے ماحول کی شکایت بھی نہیں کی۔ اس میں بڑا ظرف تھا۔ اس نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔[2]

سبطِ حسن اور مجاز کا ساتھ بہت پُرانا ہے۔ لکھنؤ کی وہ ہما ہمی۔ اس میں فرحت اللہ انصاری، سردار جعفری، سبطِ حسن کا ایک گروپ جس کا ہر فرد ایک دوسرے سے بہت قریب تھا۔ سردار جعفری صاحب نے ان دنوں کی کچھ یادیں "لکھنؤ کی پانچ راتیں" کے عنوان سے قلم بند بھی کی ہیں۔ اتنے قریب رہ کر سبطِ حسن نے مجاز کی شخصیت کا بخوبی اندازہ لگایا ہوگا۔ انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"مجاز تو اتنے کم سخن تھے کہ ان کی آہیں چشم و لب تک بہت کم آئیں چنگاری اندر ہی اندر سلگتی رہی"۔

"بڑا پیارا آدمی تھا مجاز۔ جو اُس سے ملا۔ اس کی باتیں سُنیں، اس کا کلام سُنا، وہی اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اور کیوں نہ ہوتا، محبت محبت کو جنم دیتی ہے۔ مجاز سرتاپا محبت تھا۔ نفرت کرنا تو اسے آتا ہی نہ تھا۔ ساری زندگی اس نے کسی کا بُرا نہ چاہا، بجز اپنے۔ کسی کی ذات کو اس نے نقصان نہ پہنچایا بجز اپنی ذات کے۔ بہت ہوا تو مذاق اُڑا دیا۔ فقرے چُست کر دئیے۔ دل کی بھڑاس نکل گئی۔ وہ تو اُن دوستوں کو بھی پیار کرتا تھا جن کی ذات سے اُسے صدمہ پہنچا۔ غصہ اسے شاید ہی کبھی آیا ہو۔ کم سے کم میں نے کبھی اسے غصّے کے عالم میں نہیں دیکھا۔ ایسا تو نہ تھا کہ کبھی کوئی بات اسے ناگوار ہی

---

[1] مجاز رومانیت کا شہید۔ آل احمد سرور۔ صفحہ ۵۶۴۔ [2] مجاز رومانیت کا شہید۔ آل احمد سرور۔ صفحہ ۵۶۵۔

یہ گذرتی ہو مگر اعصاب کی کمزوری کے باوجود اس میں ضبط کرنے اور اپنے جی کو مارنے کی طاقت بھی بہت تھی۔ دوستوں کی محفل جمی ہوئی ہے۔ بحث ہو رہی ہے۔ اشتعال انگیز باتیں کی جا رہی ہیں مگر مجاز مشتعل نہیں ہوئے۔ اس کے اوپری ہونٹ میں خفیف سی لرزش ہوتی ہے یا نتھنے پھڑکنے لگتے ہیں۔ ناگواری کا اس سے زیادہ اظہار اُس کے بس کی بات نہ تھی"۔[1]

اس چھوٹی سی عمر میں جو شہرت اور مقبولیت اُنھیں حاصل تھی وہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ ہندوستان کے تمام مختلف طبقوں میں یکساں مقبول تھے۔ لیکن اِترانے کا تو ذکر کیا اپنی تعریف بھی سُننا پسند نہ کرتے تھے۔

کالج کے لڑکے لڑکیوں میں، کسانوں اور مزدوروں کے بڑے بڑے جلسوں میں، مشاعروں اور نجی محفلوں میں جہاں جاؤ مجاز کا چرچا ہوتا تھا۔ اُسی کو پکارا جاتا تھا۔ کم سے کم ۳۵ء تا ۴۰ء یہی عالم رہا۔ کوئی کم ظرف ہوتا تو زمین پر قدم نہ رکھتا۔ بُت بن کر بیٹھ جاتا اور بہت سے لوگ اسی کی پوجا کرتے، مگر غضب کی انکساری تھی مجاز میں اسے کبھی ان باتوں کا خیال بھی نہ آیا۔

پچیس سال میں میں نے اُسے ایک بار بھی اپنی شاعری یا شہرت پر اتراتے نہیں دیکھا۔ جذبی کو بہت چاہتا تھا، البتہ آپس کے دوست بیٹھے ہوں تو جذبی کو چھیڑتا بھی بہت تھا۔ کبھی اس کی نظم پر پیروڈی ہو رہی ہے۔ کبھی اس کا کوئی پرانا قصہ سُنایا جا رہا ہے۔ آخر تنگ آکر جذبی چیخ اُٹھتا اور ہنس کر کہتا۔ "تم جلتے ہو میری شاعری سے اسی لئے ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

جذبی ظاہر ہے یہ بات مذاق میں کہتا مگر مجاز نے کبھی اس کے جواب میں مذاقاً بھی اپنی فوقیت نہیں جتائی۔ کوئی نظم یا غزل لکھی ہے تو دوستوں کو پڑھنے کے لئے اس طرح دے رہے ہیں گویا اپنے کئے پر شرما رہے ہیں۔ گویا ان کے مشورے کے بغیر نظم سُنانے کے قابل نہ ہو گی۔

علم و فن کا غرور بڑا عام مرض ہے ...... مجاز کو یہ موذی مرض کبھی نہیں لگا۔ کالج کے لڑکوں میں بیٹھا ہے تو ان میں گھل مل گیا ہے۔ گویا وہ بھی کالج کا کوئی کھلنڈرا ہے۔ ...... وہ بمبئی اور کانپور کی بستیوں میں اَن پڑھ مزدوروں میں اپنی نظمیں اسی طرح لہک لہک کر سُناتا جس طرح دیرینہ کرم فرماؤں کے ایوانِ نشاط میں۔ نہ وہاں اس کے تیور پر بل پڑتے نہ یہاں اسے جھجک ہوتی۔

کرم فرماؤں کی دعوتوں کو رد کرتے اور اُن کے ایوانِ نشاط سے بڑی بے نیازی سے

---

[1] مجاز ایک نا تمام غزل۔ سبط حسن۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۲۶۵-۲۶۶

اُٹھ آتے، میں نے مجاز کو دیکھا ہے مگر مزدور اور طالب علم دعوت دیں اور وہ نہ پہنچے. فرمائش کریں اور وہ پوری نہ کرے۔ ممکن نہ تھا۔

آخر میں سبط حسن صاحب لکھتے ہیں :

" ضد اسے چھو کر بھی نہیں گذری تھی ۔ اس نے کبھی اپنی رائے پر اصرار نہیں کیا اور نہ ہٹ دھرمی سے اس پر اڑا۔ اس کے لئے بڑے اونچے کردار کی ضرورت ہوتی ہے۔" [۱]

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کا نفسیاتی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ اپنی تنہائی کے مختلف علاج جو مجاز نے خود تجویز کئے تھے۔ دوست احباب کی تلاش۔ شراب کی تلاش اور علی گڑھ میں میرس روڈ کے چکر۔ لکھنؤ میں امین آباد۔ حضرت گنج۔ یونیورسٹی روڈ کی چہل قدمی ۔ ان سب سے ان کی اپنی زندگی کا وہ خلا تو پُر نہ ہو سکا البتہ ان کی اپنی زندگی کا پیمانہ ضرور وقت سے پہلے چھلک گیا۔ اس کے باوجود ان کی شخصیت کتنی دل فریب، جاذب نظر، پیاری اور دل کش نظر آتی ہے۔ عبادت صاحب کے الفاظ ہیں :

" وہ بڑے ہی شریف آدمی تھے ۔ نیکی اور سیدھے پن کی خصوصیت بقول شخصے ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اُنھیں کسی سے بگڑنا نہیں آتا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ برائی نہیں کر سکتے تھے۔ کسی کی بہتری کے سوا کوئی اور بات ان کے ذہن میں آتی ہی نہیں تھی۔ کسی سے انتقام لینا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ ان کی شخصیت میں شرافت ہی شرافت تھی۔ ان کا خلوص بے پایاں تھا۔ ان کی محبت بے اندازہ تھی۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی دوستی پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ بہت ہی اچھے دوست تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ کبھی کوئی چھچھوری بات نہیں کی۔ نشے کی اور بات ہے، لیکن ہوش کے عالم میں کبھی انھیں شرافت کے دائرے سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ کبھی نیچے نہیں گرے۔ کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی۔ کبھی کسی کو بے جا طور پر نہیں سراہا۔ انھیں تکلف اور بناوٹ سے نفرت تھی۔ وہ جو کچھ تھے وہی اپنے آپ کو ظاہر کرتے تھے انھیں شہرت کی خواہش نہیں تھی۔ ناموری کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز تھے انھیں ہمیشہ خیر کا خیال رہتا تھا۔ شر کے تو وہ پاس بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ برائی کا انھیں کبھی خیال بھی نہیں آیا۔" [۲]

---

[۱] مجاز ایک ناتمام غزل ۔ سبط حسن ۔ صفحہ ۳۶۹ ۔ ۳۷۲ ۔

[۲] مطرب بزم دلبراں ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔ صفحہ ۳۲۸ ۔

مجاز مشاعروں میں

شراب اور شاعری کا تعلق بہت گہرا اور دیرینہ رہا ہے۔ شراب کی بیخودی شاعر کو اس مادّی دنیا سے ایک لمحہ کے لئے جدا کر کے تصوراتی اور مثالی دنیا میں پہنچا دیتی ہے اسی لئے تقریباً اردو فارسی کے ہر شاعر نے اس کی صفات کا اعتراف کیا ہے۔ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

(غالب)

جریدہ رو کہ گذرگاہِ عافیت تنگ است

پیالہ گیر کہ عمرِ عزیز بے بدل است　　(حافظ)

مجاز بھی شراب کی اس بیخودی کو سماجی اعتبار سے عیب سمجھنے کے باوجود اس کا کس شان سے ذکر کرتے ہیں:　　عیب جو حافظ و خیام میں تھا

ہاں کچھ اس کا بھی گنہ گار ہوں میں

مُشاعرہ ہندوستان کی اجتماعی روایت تھی۔ یہاں ہر شاعر اپنا بہترین کلام پیش کرتا اور انتظامیہ پینے والوں کے لئے شراب کا بھی انتظام کرتی۔ جام پر جام لنڈھائے جاتے اور مشاعرے جیتے جاتے۔

مجاز کا سب سے دلفریب روپ انھیں مشاعروں میں نظر آتا ہے۔ ایک نازک اور حسّاس دل میں ساری محفل پر چھا جانے کی خواہش رکھنے والے شاعر کا یہ عزم اگر کبھی شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آیا ہے تو مشاعروں ہی میں۔ مجاز کی بھرپور شخصیت اور اس کے سارے خیالات وارادے اگر دیکھنے ہوں تو مشاعروں میں دیکھئے۔ مجاز کس شان کے ساتھ اپنے تصورات کا اظہار کرتے ہیں ؎

غم دوراں کی یورش ہے مصائب کی گھٹائیں ہیں

جنوں کی فتنہ خیزی حسن کی خونی ادائیں ہیں

مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

حقیقت دیکھئے تو تمام مصائب کا سامنا کرتے ہوئے منزل کی طرف بڑھتے رہنے کا یہ عزم صرف مشاعروں تک تھا' ورنہ حقیقتاً بہت ہی نازک جذبات کے احساسات کے مالک تھے جو ذرا سی ٹھیس سے بھی شکستہ ہو جائے۔

انقلابی صفوں میں آگے آگے رہنے کی خواہش کے باوجود دل کی نزاکت کا یہ عالم تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات میں بمبئی میں ایک آدمی کو قتل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تو تین دن کھانا نہیں کھا سکا [1]

---

[1] لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ سردار جعفری۔

مجاز ہمیشہ مشاعروں میں چھائے رہے۔ ان کے آگے دوسرے شاعر جم نہ پاتے اور ان کے بغیر مشاعروں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا۔

مُشاعروں میں مجاز کی ہردل عزیزی کا عالم اُن کے بھتیجے سید اختر نعمانی نے ایک واقعہ سے ثابت کیا ہے :

انجمن ترقی پسند مصنفین کانپور کی جانب سے ۱۱؍نومبر ۱۹۵۳ء کو ہم لوگوں نے ایک مشاعرہ کیا۔ اسی روز کانپور کے چند رجعت پسند شاعروں نے ایک دوسری جگہ مشاعرے کا اعلان کر کے انجمن کے مشاعرے کو ناکامیاب بنانے کی کوشش کی ...... ایک آدمی کو متعین کر دیا کہ وہ کسی صورت سے مجاز چچا کو ان کے مشاعرے میں لے جائے۔ وہ آدمی شام کے چار بجے سے فرحت کے مکان پر دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔ میں نے قریب آٹھ بجے مجاز چچا کو رکشے پر سوار کرا کے رکشے والے کو انجمن کے مشاعرہ ہال پہنچانے کو کہا۔ میں سائیکل پر اپنے گھر ہوتا ہوا مشاعرہ ہال پہنچا مگر مجاز چچا کو موجود نہ پایا۔ گیارہ بجے تک میں نے ان کا انتظار گیٹ پر کیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں اُن لوگوں نے شرارت نہ کی ہو۔

میں فوراً نامی انصاری کو لے کر ہرسہائے جگدمبا سہائے اسکول جہاں پر وہ مشاعرہ ہو رہا تھا گیا ...... نامی آگے بڑھے۔ پہرے داروں نے روکا۔ نامی نے کہا، میں غزل پڑھنے آیا ہوں، کہہ کر قدم آگے بڑھایا ...... وہاں پہنچ کر اُنھوں نے مجاز چچا کو بہت متفکر پایا ...... ان کے ہمراہ لکھنؤ سے مجروح سلطان پوری اور منظر سلیم بھی آئے تھے۔ مجاز چچا نے کئی بار ان لوگوں سے اُن دونوں کے متعلق دریافت کیا۔ کبھی انھوں نے کہا کہ کھانا کھا رہے ہیں۔ اور کبھی کوئی دوسرا بہانہ کر کے ٹال دیا۔

نامی نے ڈائس پر پہنچ کر مجاز چچا کو سب حالات بتائے۔ پہلے تو وہ گھبرائے اور سمجھ بیٹھے کہ یہ شخص فراڈ کر رہا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا یہ ترقی پسندوں کا مشاعرہ نہیں ہے۔ نامی نے کہا۔ "نہیں، وہ تو حلیم کالج میں ہو رہا ہے۔ انھوں نے پھر پوچھا۔ کیا یہ حلیم کالج نہیں ہے ؟ جب ان کو بتلا گیا تو وہ فوراً "چلو بھاگو بھاگو" کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور تیزی سے نامی کے ساتھ گیٹ کی جانب جانے لگے۔ کچھ لوگوں نے مجاز چچا کو روکا۔ وہ "ابھی آرہا ہوں" کہہ کر باہر نکل آئے۔ ...... کچھ دیر بعد اس مشاعرے کے صرف سامعین ہی نہیں بلکہ شعرائے کرام ہمارے مشاعرے میں جلوہ گر نظر آئے۔ انجمن کے مشاعرے کو ناکامیاب بنانے والوں کا خود اپنا

مشاعرہ ناکامیاب ہوگیا۔" [۱]

یہ ہردل عزیزی علی گڈھ کے زمانۂ طالب علمی ہی سے شروع ہوگئی تھی، جب کہ انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا ہی کی تھی، جس کا ذکر ابواللیث صاحب نے یوں کیا ہے:

"علی گڑھ کے مشاعروں میں اس وقت ترنّم سے پڑھنے کا رواج عام ہو چلا تھا... ... لیکن جگر کے والہانہ انداز نے علی گڈھ میں ترنم کا شوق پیدا کیا۔ سردار جعفری تو بے شک نثر میں نظم سناتے، لیکن مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر نے شروع سے ہی ترنم اختیار کیا........ جذبی اور مجاز دونوں کا ترنم بے حد پسند کیا جاتا تھا۔

جذبی کے یہاں نغمگی تھی اور مجاز مجسم نغمہ بن جاتے تھے۔ ان کے پتلے پتلے ہونٹوں پر تبسم کھیلتا رہتا۔ وہ جھوم جھوم کر اپنا کلام سناتے اور والہانہ انداز میں اپنے بڑے بڑے بالوں کو جو پیشانی پر آ پڑتے ہاتھوں سے سنوارتے جاتے۔ ان کی آواز باریک تھی، لیکن بڑے سے بڑے مجمع میں مائیکروفون کے بغیر وہ بلا تکلف اپنی آواز مجمع کے آخری گوشے تک پہونچا سکتے تھے۔" [۲]

مجاز کی آواز میں بلا کا درد و گداز تھا اور ان کا اپنا پڑھنے کا ایک نیا انداز تھا اور کافی مقبول بھی۔

پڑھنے کے انداز میں بھی ایک نیا پن تھا۔ اس زمانے میں جگر صاحب کے ترنم کی دھوم تھی۔ اکثر نوجوان ترنم سے پڑھنے میں انھیں کی نقل کرنے لگے تھے لیکن مجاز کا اپنا ایک انداز تھا۔ سیدھا سادا لیکن حد درجہ موثر اور دل آویز۔ [۳] ایک ایسے واقعے کا ذکر ابوالخیر کشفی صاحب نے بھی کیا ہے۔ حسنین کاظمی صاحب کی دوکان پر ایک شعری نشست تھی۔ مجاز اس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھے۔ حسنین صاحب نے مجاز کی وھسکی کا بھی انتظام کیا تھا۔ مجاز بہت دنوں سے اپنی تنگ دستی کی وجہ سے کوئی اچھی شراب نہ پی سکے تھے۔ لہٰذا وھسکی ملتے ہی انھوں نے خوب پیا اور اتنا پیا کہ اپنے ہوش و حواس سب کھو بیٹھے اور اس قابل بھی نہ رہے کہ کچھ پڑھ سکتے اور اگر کوئی ان سے اصرار کرتا تو وہ بگڑ بگڑ کر یہ کہتے: "نہیں پڑھتے۔ ہم فن کار ہیں۔ کسی کے غلام نہیں، بھاگ جاؤ" حاضرین میں سے ایک صاحب کالی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ مجاز نے

---

[۱] پچھا شاعر ساتھی رند۔ از سید اختر۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۱۱ - ۲۱۳

[۲] مجاز۔ از ابواللیث صدیقی۔ نقوش۔ شخصیات نمبر ۶۰ - ۵۹ - اکتوبر ۵۶ صفحہ ۹۱۲۔

[۳] مطرب بزم دلبراں از عبادت بریلوی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۳۰۸۔

اُن سے پوچھا۔ "کیا آپ علیگ ہیں؟" وہ بولے۔ جی ہاں۔ مگر مجاز صاحب آپ تو علی گڈھ کا نام ڈبو رہے ہیں۔" مجاز پر ان جملوں کا خاطر خواہ اثر پڑا اور وہ آب دیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے:

"مجھے معاف کر دیجئے .... اب .... اب .... م ..... میں ......
ض ..... ضرور پڑھوں گا .... ع .... علی گڈھ .... علی گڈھ کی عزت .... م
...... میری .... ع ...... عزت ہے۔ اس کی عزت کے لئے میں سب کچھ قربان کر سکتا ہوں۔
اپنی بے خودی بھی۔

اور پھر مجاز نے اپنی ساری قوتوں کو جمع کر کے پڑھنا شروع کر دیا:۔

سرشار نگاہِ نرگس ہوں پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

اس فرش سے ہم نے اُڑ اُڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی پروین سے رشتے جوڑے ہیں
اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھیں بچھائی ہیں اس بزم میں دل تک توڑے ہیں

مجاز اسی طرح پڑھتا رہا۔ ایک ایک مصرعہ بار بار پڑھا۔ بار بار دُہرایا۔ خود رو دیا۔ دوسروں کو رُلایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر گر کر گرتے کے دامن میں جذب ہوتے رہے اور جب نظم ختم ہوئی ہے تو سب سوچ رہے تھے:

"یہ ابر ہمیشہ برسا ہے۔ یہ ابر ہمیشہ برسے گا۔"[1]

"میں ہر محفل کی رونق ہوں" کا دعویٰ رکھنے والا شاعر مشاعروں کی محفل کی رونق ضرور رہا ہے اور وہیں اس کا دعویٰ برحق نظر آتا ہے۔ بڑے بڑے شاعر اس کی رونق کے آگے ماند پڑ جاتے۔ ۱۹۴۰ء کی بات ہے کہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے وجیانگرم ہال میں مسلم بورڈنگ ہاؤس کا سالانہ مشاعرہ تھا جو ہر سال بڑے اہتمام سے منایا جاتا تھا۔ اس بار بھی کافی بڑے بڑے شاعر شریک تھے۔ جوش، جذبی، جاں نثار اختر وغیرہ شامل تھے اور استادِ وقت صفی لکھنوی بھی موجود تھے۔ صفی بیچ میں بیٹھے ہوئے

---

[1] اس کے جنوں کی داستاں۔ ابوالخیر کشفی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۱۴-۲۱۵۔

تھے۔ مجاز انھیں کے پاس بیٹھ کر پڑھنے لگے۔ یہی "آوارہ" وہ سنا رہے تھے۔ صفی ایک بے بسی کے عالم میں مجاز کی سانسوں سے بچنے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے مگر مجاز بے خبر اور کھوئے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ سامعین کی تعریفوں سے ہال کا گنبد بڑا گونج رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے مجاز اس بند پر پہنچے:

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں

میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں

زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں

جب وہ آخری مصرع پر پہونچے تو صفی صاحب نے بے اختیار مجاز کی پیشانی چوم لی۔ مجاز رک گئے اور پھر ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے جھک گئے۔ استاد نے ان کے کلام پر مُہرِ توثیق ثبت کر دی تھی۔ اب مجاز آداب۔ تسلیمات کرتے کرتے پیچھے جا رہے تھے۔ اس وقت وہ کچھ زیادہ سرور کے عالم میں تھے اور اب پھر صفی صاحب اپنی گردن دائیں بائیں پھرا رہے تھے۔"[۱]

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مشاعروں میں مجاز کو جتنی اور جیسی کامیابی حاصل ہوئی ویسی کامیابیاں جگر صاحب کے علاوہ شاید ہی کسی کو حاصل ہوئی ہوں۔ وہ پوری محفل پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری کر دیتے تھے۔ ہر کس و ناکس کچھ دیر کے لئے ان کے الفاظ اور آواز کی جادوگری میں گم ہو جاتا تھا۔ سوائے زندگی کے آخری ایام جب کہ ان کی حیات کا شیرازہ منتشر ہو چلا تھا۔ وہ کسی دم اپنے آپے میں رہتے تھے اور اکثر مشاعروں میں ایسا بھی ہوتا تھا اُن کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا گویا ان کا عدم و وجود ایک ہی جیسا ہو۔ بقول عصمت چغتائی:

مشاعروں میں کھڑا کر دیا تو ہاتھ سوکھے پتوں کی طرح۔ آواز گویا کوسوں دور سے گرتی پڑتی چلی آرہی ہے۔ داد دیتے جی ڈرتا ہے کہ کہیں سچ مچ اسٹیج سے نیچے نہ گر پڑیں۔"

ریڈیو کے مشاعرے شروع شروع میں ریکارڈ نہیں ہوتے تھے پہلے سے نظم یا غزل دیکھ لی جاتی تھی اور حسب منشاء ارباب حل و عقد اس میں تبدیلی کے بعد پڑھنے کی اجازت دیتے تھے۔ مجاز آزاد منش تھے۔ کئی بار اس خلاف ورزی کی بنا پر ریڈیو پر پڑھنے سے منع کر دیئے گئے۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب لکھتے ہیں:

"مجاز مشاعرے میں ذرا تاخیر سے پہونچے۔ بڑی طرح نشے میں تھے۔ جب انھیں پڑھنے کے لئے

مائیکروفون پر طلب کیا گیا تو وہ اپنی جگہ سے جھومتے جھامتے اُٹھے اور اپنی نظم یا غزل پڑھنے سے قبل یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا۔ ؎

شاعر ہوں اور امیں ہوں عروسِ سخن کا میں
کرنل نہیں ہوں خان بہادر نہیں ہوں میں

لیکن مجاز کی آواز یہ شعر پڑھتے پڑھتے ڈوب گئی۔ ریڈیو بند کر دیا۔ اس زمانے میں تو یہ حکومت کی تحت تو ہین تھی۔ خان بہادر، کرنل قسم کے شاعر تو خیر اس پر کچھ زیادہ چیں بہ جبیں نہ ہوئے۔ لیکن ریڈیو کے محکمہ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کئی دن تک کھچڑی پکتی رہی اور آخر میں یہ نتیجہ نکلا کہ ریڈیو پر مجاز کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔[1]

مجاز جہاں سامعین کی خواہش کا احترام کرتے وہاں وہ قابو میں کرنے کا گر بھی جانتے تھے۔ جاں نثار اختر صاحب نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے ان کی اس صفت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے:-

دوسرے روز کوی سمیلن تھا۔ سُمن شام ہی سے مجاز کو اپنے گھر لے گئے تھے۔ وہاں ایسی محفل جمی کہ تقریباً ساڑھے دس بج گئے۔ جس وقت مجاز اور سُمن کالج پہونچے۔ کالج کے لڑکے بطور احتجاج کوی سمیلن کے بائیکاٹ پر اُتر آئے۔ سُمن نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی لیکن طلبائے قابو ہو چکے تھے۔ آخر کار مجاز نے اٹھ کر ذاتی طور پر معذرت چاہی اور اس تاخیر کے الزام کو اپنے سر لے لیا۔ اس نے کہا:

"آپ بے شک مجھے نہ سُنیئے گا جس کی وجہ سے آپ کو تکلیف اٹھانی پڑی۔ یہ فنکشن آپ کا ہے۔ آپ خود اس کا بائیکاٹ کیسے کر سکتے ہیں؟"

مجاز کے اس اخلاقی اقدام نے بجلی کا سا اثر کیا۔ اور ساتھ ہی آوارہ آوارہ کے تقاضوں سے ہال گونجنے لگا اور ایک منٹ نہ گذرا تھا کہ مجاز اپنے ترنم مگر ٹوٹے ہوئے لہجے میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی بات کہہ رہا تھا:

"اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ غم کیا کروں"

تقریباً ڈھائی بجے رات کو کوی سمیلن ختم ہوا۔ کالج کے لڑکوں نے مجاز کو ہاتھوں پر اُٹھا لیا۔ اس رات کا ہیرو بھی مجاز ہی تھا۔[2]

---

[1] مطرب بزم دلبراں۔ عبادت بریلوی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۳۳۴

[2] میرا دوست۔ میرا مہمان۔ جان نثار اختر۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۰۲۔۲۰۳۔

شراب نوشی کی کثرت نے ان کی یہ حالت کردی تھی کہ جن مشاعروں کے لئے وہ ہر چیز قربان کرسکتے تھے۔ مشاعروں میں شرکت اور اس پر چھا جانا اپنی شان سمجھتے۔ انھیں مشاعروں میں دو چار جام چڑھا چکنے کے بعد ان کی حالت دگر گوں ہو جاتی اور ان کے لئے اپنا کلام سنانا بھی مشکل نظر آنے لگتا۔ ــــہ کے ایک ایسے ہی مشاعرے کا ذکر عصمت چغتائی نے کیا خوب کیا ہے:

"ریڈیو اسٹیشن پر مشاعرہ تھا۔ ہم لوگ بھی اتفاق سے پہنچ گئے۔ تمام شعراء تو موجود تھے پر آپ نہ جانے کہاں غائب تھے۔ اشاروں سے پوچھنے پر منتظمین میں سے کسی نے اشاروں ہی میں جواب دیا کہ باہر استفراغ فرما رہے ہیں۔ توبہ ــ!

شکر ہے کہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے لوگ آپ کو سمیٹ کر لائے اور کرسی پر لٹکا دیا۔

اب حلیہ ملاحظہ ہو:

میلا چست پاجامہ۔ کن میلیوں جیسا۔ اس پر بدرنگا سا اوور کوٹ۔ گلے میں چیکٹ مفلر اور سر پر چائے پوشی۔ واہ

مائیکروفون پر آکر نہ جانے کیا اول فول بکنے لگے۔ کلیجے میں آب آتش لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں کو قرار نہ تھا۔ ایک زمین پر تو دوسری آسمان پر۔ کبھی ایک دائیں تو دوسری بائیں کونے میں۔ ایک ہاتھ مشین کی رفتار سے بالوں کی ایک ریت آلودہ لٹ کو بادام کن پٹی پر سے اٹھائے جا رہا تھا اور وہ بے حیائی سے بار بار گرے جا رہی تھی۔ اب خوش الحانی شروع ہوئی۔ اللہ جانے کیا کیا کہنا شروع کیا۔ بیچ بیچ میں دانت بھینچ بھینچ کر کچھ بھی دیے جاتے تھے اور پڑھتے پڑھتے مائیکروفون سے دور نکل گئے۔ واپس لائے جانے پر بگڑ کر بیٹھ گئے۔"[1]

مجاز مشاعروں میں عموماً دیر سے پہنچتے۔ ساری محفل کی نگاہیں اُن کی منتظر رہتیں اور وہ جیسے ہی مشاعرے میں قدم رکھتے گویا محفل میں جان پڑ جاتی۔ وہ اپنے اسی مخصوص انداز سے اسٹیج پر آکر بیٹھ جاتے۔

ساری نگاہیں ان کی طرف اٹھ جاتیں۔ لمبے لمبے بکھرے ہوئے بال، شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے، بے تابی کے ساتھ ہاتھ اور زبان چلتی ہوئی۔ آنکھ مڑتی سے کہیں، یاد ماکہیں پڑتا ہے کی تصویر بنے ہوئے۔ ان کے لئے ڈائس پر سکون سے بیٹھنا سخت دشوار ہوتا۔ خود کو سنبھالتے

---

[1] عشقِ مجازی۔ عصمت چغتائی صفحہ ۲۵۶

ضبط کرتے۔ شاعر دوستوں سے اُلٹے سیدھے جملوں میں باتیں کرتے یا پھر ہاتھ جوڑ جوڑ کر کبھی شاعروں، کبھی سامعین سے اشاروں اشاروں میں معذرت کرتے۔ آخر اُن کا پورا نام پکارا جاتا اور اچانک ان میں بلا کی طاقت آجاتی۔ وہ سنبھلتے ہوئے اٹھتے اور مائیکروفون کے سامنے آکر اپنی مخصوص پُرسوز آواز میں کلام سُنانے لگتے۔

مجاز میں ایک بڑی صفت یہ تھی کہ وہ سامعین کا موڈ پہچانتے تھے۔ ان کی خواہشات اور فرمائشوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ جیسے اُن میں یہ جرأت ہی نہ ہو کہ وہ اپنے مداحوں اور سامعین کے اصرار پر کچھ نہ سُنائیں۔ ایک بار بمبئی میں کسی مزدور نے فرمائش کی کہ آپ اپنی وہ نظم سُنا دیں جس میں "رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی"۔

مجاز نے پوری نظم اسی طرح سنا کر سماں باندھ دیا۔ ایک بار اور مزدوروں کے ایک جلسے میں کچھ مزدوروں نے "لال جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں" والی نظم پڑھنے کی درخواست کی۔ مجاز نے ان کی خوشی کی خاطر آج کے بجائے 'لال' پڑھ کر ان کا دل جیت لیا۔

اس سب کے باوجود اکثر و بیشتر مشاعروں میں مجاز میں نہ جانے کہاں سے وہ حوصلہ جاگ پڑتا تھا جو ان کے پہلے مشاعروں کی جان تھا۔

مجاز کی موت سے دو ایک روز قبل جو مشاعرہ لکھنؤ میں ہوا تھا اس میں بھی ان کا کچھ ایسا ہی حال تھا۔ ساری بدنظمی اور شکستہ دم ہونے کے باوجود مجاز نے مشاعرے میں بڑی سنجیدگی اور دلچسپی کا ثبوت دیا۔

رات کو مجاز نے مشاعرے میں بڑی سنجیدگی کا ثبوت دیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ برسوں کا پرانا مجاز زندہ ہوگیا ہے۔ مجھ سے کہا۔ "نہ جانے پھر کب ملاقات ہو"۔
اور یکے بعد دیگرے کئی چیزیں سُنائیں۔ مجمع حیران تھا اور خوش بھی۔ مجاز لہک رہا تھا۔ آخری غزل کے یہ دو شعر بار بار پڑھے:

بہت مشکل ہے دُنیا کا سنورنا — تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
بہ ایں سیلِ غم و سیلِ حوادث — مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

شعر کی خوبی کے علاوہ مجاز کے حالات کے پیشِ نظر آخری مصرع کی بہت داد ملی۔ اگر وہ صبح تک سُناتا رہتا تو بھی لوگ سُنتے رہتے۔ [1]

---

[1] ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ۔ سردار جعفری۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۳۲۔

کچھ بھی ہو، مجاز کا تیور، عزم اور حوصلہ مرتے دم تک مشاعروں کی محفل میں برقرار رہا۔

بقول خود مجاز ؎

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں
شاعرِ محفلِ وفا مطربِ بزمِ دلبراں [مجاز]
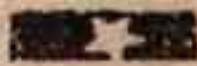
رونقِ انجمنِ یار ہوں میں

علم عمرانیات و نفسیات کے نظریوں کے تحت انسان جن وراثتی روایات و اقدار کے درمیان پروان چڑھتا ہے انھیں سے اس کے کردار کی نشو و نما ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے اپنے نجی تجربات اس کو ایک خاص ماحول میں ایک مخصوص سلوک کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مختلف مواقع و حالات میں انسان سے مختلف رجحانات و میلانات کا اندازہ و اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی انسان گھریلو زندگی میں، کچھ سماجی و اجتماعی زندگی میں کچھ، دفتروں میں کچھ اور یار دوستوں کی محفلوں میں کچھ نظر آتا ہے۔ مجاز کی شخصیت کا سب سے دلکش روپ انھیں یار دوستوں کی محفلوں میں نظر آتا ہے اور بعد میں یہ اُن کی فطرتِ ثانیہ بن گئی۔ کافی ہاؤس کی شامیں انھیں حسین یادوں سے وابستہ ہیں۔ علی گڈھ اور دلّی کی انجمنیں چھوڑ کر جب مجاز لکھنؤ آئے تو ان کا زیادہ تر وقت یہیں گذرا۔ علی گڈھ کا اولڈ انڈیا کافی ہاؤس اس زمانے میں "نیا ادب" اردو کے ادیبوں اور شاعروں کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ دانشوروں، سیاسی کارکنوں، طلبا، اساتذہ، شعراء اور ادیبوں کی ایک بھیڑ سی لگی رہتی تھی۔ یہاں گپ بازیاں ہوتیں، کافی کا دور چلتا، ادبی و سیاسی بحث مباحثے ہوتے۔ یہ کافی ہاؤس اِن دنوں لکھنؤ کی جان تھا۔ جتنی رونق یہاں نظر آتی شاید ہی کہیں اور رہی ہو گی۔ شام کے وقت خصوصاً اس کی رونق اور چہل پہل میں اضافہ ہو جاتا۔ اسی سبب سے اس کا نام انٹلکچول کافی ہاؤس پڑ گیا تھا۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں نیا ادب کا حلقہ موجود تھا جس میں اردو و ہندی کے مشہور و معروف ادیب و شاعر شامل تھے۔ ڈاکٹر علیم آل احمد سرور۔ علی جواد زیدی۔ کمال احمد صدیقی۔ ڈاکٹر محمد حسن ۔ شوکت صدیقی۔ احتشام حسین۔ آنند نرائن ملا۔ نصیر حیدر۔ سلام حسن شہیر۔ یشپال وغیرہ اس حلقے کی جان تھے۔ یہ سارا حلقہ بے حد ذہین اور پڑھے لکھے باشعور لوگوں کا تھا اور زیادہ تر لوگ اس حلقے کے ترقی پسندیت کا رجحان

رکھتے تھے۔ یہ لوگ اکثر کشادہ ذہن اور روشن خیال تھے۔ بحث مباحثے، ہنسی مذاق اور فقرے بازیاں بھی ہوتیں، لیکن کسی قسم کی تنگ نظری اور تنگ ظرفی کا مظاہرہ نہ ہوتا۔ گھٹیا اور سطحی باتیں قطعاً نہ کی جاتیں اور نہ ہی کسی کا مذاق اُڑایا جاتا۔ جملہ بازیوں میں لطافت اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا۔ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگنے پاتی تھی۔ اکثر و بیشتر اختلاف رائے بھی ہوتا۔ لیکن تلخی کی شکل نہ اختیار کرنے پاتا۔ مجاز اس حلقے کی جان سمجھے جاتے تھے۔ چست فقروں "لطیف جملوں" سے اس کی رونق دوبالا کر دیتے۔ مجاز اپنی زندگی کے آخری ایام تک کافی ہاؤس کے اس حلقے میں بے حد مقبول رہے اور خاص طور سے جب سے انھوں نے لکھنؤ میں مستقلاً رہنا شروع کیا تھا۔ ان کے معمول میں تقریباً روز شام کو نہا دھو کر کافی ہاؤس جانا شامل تھا۔

"آزادی کے بعد جب وہ مستقلاً لکھنؤ میں مقیم تھے، عموماً شام کو نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر گھر سے نکلتے اور محمد حسن کے یہاں پہونچتے جو ان دنوں ریسرچ کر رہے تھے اور ان کے نیو حیدر آباد دارالسراج سے قریب ہی کالونی کالج کے اساتذہ کے رہائشی کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر میں مقیم تھے۔ یونیورسٹی روڈ سے یہ دونوں خاصا طویل فاصلہ پیدل طے کر کے حضرت گنج آتے اور کافی ہاؤس میں جم جاتے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ مجاز دوپہر ہی کو گھر سے نکل کھڑے ہوتے اور اکیلے کافی ہاؤس آجاتے۔ شام تک وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا تو وہ اٹھ کر اپنے دوستوں کے پاس سکریٹریٹ کی طرف چلے جاتے جو اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ مثلاً ذوالنورین مرحوم۔ جمال رضوی صاحب۔ علی جواد زیدی یا میاں انصاری وغیرہ۔ اور شام کو کافی ہاؤس لوٹتے۔"[1]

اس کافی ہاؤس میں مختلف نظریوں اور خیالات کے لوگ آتے تھے۔ لہٰذا کہیں پر سیاسی بحث ہو رہی ہے۔ کہیں ہنسی مذاق اور جملے بازیاں۔ لیکن مجاز نے ان سیاسی و ادبی مباحثوں میں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کبھی حصہ نہیں لیا۔ ایسے موقعوں پر وہ بے حد سنجیدگی سے ان مباحثوں کو سنتے۔ ہاں جملے بازیوں میں ضرور حصہ لیتے تھے اور بعض اوقات ایسے برمحل فقرے چست کر دیتے کہ محفل کا رنگ یکسر بدل جاتا اور خاص طور پر اس وقت جب کہ وہ خود بور ہو رہے ہوں یا بحث تلخی کی طرف جا رہی ہو۔ مجاز اس کافی ہاؤس کے ادیبوں اور شاعروں میں ہردلعزیز تھے۔ ان کا سنس آف ہیومر SENSE OF HUMOUR (مذاق) ان دانشوروں کے حلقے میں

---

[1] مجاز: حیات و شاعری۔ منظر سلیم۔ صفحہ ۹۲-۹۳۔

رہ کر اسے بھی بڑھ گیا تھا۔ زیادہ تر ان کے لطیفے اسی کافی ہاؤس کی شاموں سے وابستہ ہیں۔ نئے ادب کے بعد لکھنؤ میں ایک نئے ادبی دور کا آغاز ہوا۔ ادبی نقطۂ نظر سے یہ بڑے انتشار کا زمانہ تھا۔ ترقی پسندیت اور غیر ترقی پسندیت کے رجحانات اپنے شباب پر تھے، لہٰذا اکثر مجاز کو بھی طنز کا نشانہ بننا پڑا لیکن انھوں نے کسی سے تلخ کلامی نہیں کی اور صرف ایک لطیف سے جملے میں بات کو ختم کر دیا۔

مجاز کو بعض لوگ طنز کا نشانہ بناتے تھے اور بعض شاعر اس معاملے میں "عذرِ مستی" کا بھی سہارا لیتے تھے، لیکن مجاز کو کبھی کسی نے اپنے ان دوستوں یا کسی دوسرے ادیب شاعر پر غصہ ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ نہ وہ کسی کی کامیابی سے جلتے تھے نہ کسی کی ناکامی پر بدنیتی سے مذاق اڑاتے تھے۔ جو ادیب، شاعر یا ادبی مرتبے میں ان سے بڑے تھے اُن کا احترام کرتے تھے۔ کافی ہاؤس میں آل احمد سرور، ڈاکٹر علیم، پنڈت آنند نرائن مُلا یا سید احتشام حسین داخل ہوتے اور ادیبوں، شاعروں کی میز کی طرف آتے تو مجاز بھی دوسروں کے ساتھ احتراماً کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کرتے تھے۔ جو ان سے چھوٹے تھے اُن کی تخلیقات غور سے سنتے ان کی حوصلہ افزائی کرتے اور کسی سے تعارف کراتے تو تعریفی کلمات بھی استعمال کرنا کبھی نہ بھولتے۔[1]

مجاز کی باتیں، ان کے فقرے ایسے ضرور تھے کہ ان پر بے ساختہ ہنسی آجاتی، لیکن یہ باتیں شخصیت کے کرب کو کم نہیں کرتی تھیں بلکہ اس کرب میں کچھ زیادتی ہی ہو جاتی تھی اور ان کو قریب سے جاننے والے حیرت سے سوچتے رہ جاتے کہ اس قدر ہنسانے والے شخص کی شخصیت کتنی مختلف ہے کہ اس کی اپنی زندگی میں مسرت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یاروں کی انجمن میں تو زندہ دلی کا یہ عالم لیکن وہی شخص اپنی نجی زندگی میں کس قدر تلخیوں کا شکار ہے، اس تضاد کی توجیہ عبادت صاحب بریلوی نے یوں کی ہے:

"غیر شعوری طور پر غم کے شدید احساس ہی کے باعث وہ اس صورتِ حال سے دوچار ہوئے تھے۔ یہ زندگی کی تلخیاں ہی تھیں جو ان پر شگفتگی کے باوجود اس خاموشی کو مسلط رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہنسی میں کتنی ایک اداسی اور غمگینی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ہنستے تھے شگفتہ باتیں کرتے تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سب کچھ غم غلط کرنے کے لئے کر رہے ہیں"۔[2]

---

[1] مجاز حیات و شاعری۔ منظر سلیم صفحہ ۹۶۔

[2] مطرب بزم دلبراں ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ صفحہ ۲۰۲۔

ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے!۔ شراب عہدِ قدیم سے انسانی تہذیب و تمدن کا جزو بنی رہی۔ کبھی اسے ایک گونہ نشاط کے لئے اور کبھی ایک گونہ بے خودی کے لئے استعمال کیا گیا اور کبھی اس کو انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر ممنوع و حرام بھی قرار دیا گیا۔ اردو شاعری میں شراب کے نشے کو مجازاً عشقِ الٰہی یا روحانی محبت کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں یہ خیال غالب تھا کہ اس کا نشہ تھوڑی ہی دیر کے لئے سہی اس مادّی دنیا سے انسان کے افکار و عوامل کا رشتہ توڑ دیتا ہے۔ اور وہ اپنے مصائب و آلام سے وقتی طور سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ بقولِ حالیؔ :-

" اگلوں نے عشقِ الٰہی یا محبت روحانی کو جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ ہو سکتی ہے، مجازاً شراب کے نشے سے تعبیر کیا تھا اور اس مناسبت سے جام و صراحی۔ خُم و پیمانہ اور ساقی و مے فروش وغیرہ الفاظ بطور استعارہ استعمال کئے تھے یا بعض شعرائے متصوفین نے شراب کو اس وجہ سے کہ وہ اس دار الغرور کے تعلقات سے تھوڑی دیر کو فارغ البال کرنے والی ہے بطور تفاول کے مُوصِل اِلیٰ المطلوب قرار دیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اور اُس کے تمام لوازمات اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہونے لگے۔" [1]

نظامِ نفسیات کے تحت مہذب دنیا میں جو ایک انتشار و تناؤ پایا جاتا ہے اس کا واحد علاج کبھی شراب سمجھی گئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شراب سے انسانی رویئے پر جو اثرات مترتب ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اس کو مائل بہ رجعت کرتے رہتے ہیں اور اسے پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ حد سے بڑھی ہوئی شراب نوشی انسان کے احساس و شعور کو غرقِ مئے ناب کر دیتی ہے۔ اور وہ اسی میں گُم ہو جاتا ہے۔ اور پھر انسان زندگی کی مشکلات سے مقابلہ کرنے کے بجائے شراب کا سہارا ڈھونڈنے لگتا ہے۔

مجازؔ کی شراب نوشی کی ابتدا زندگی کے ناموافق حالات سے تنگ آکر تو نہ ہوئی تھی بلکہ یہ ان کی بدقسمتی کہہ لیجئے کہ جب انھوں نے شراب پینا شروع کیا تو انھیں ہر طرح کی ذہنی اور معاشی آسودگی حاصل تھی۔ یہ شراب کی ابتدا شغل کے طور پر ہوئی۔ علی گڑھ میں نوجوانوں کا ایک طبقہ تھا جو پرانی قدروں سے انحراف اپنی شان سمجھتا تھا اور بورژوا طبقے کی روایات کے برخلاف بغاوت پر آمادہ تھا اور ہر وہ حرکت کرنے پر مُصر رہا کرتا تھا جو اس طبقہ کی نظر میں ناپسندیدہ تھی خواہ وہ خود اس کے لئے کتنی ہی مُضر کیوں نہ ہو۔ مجازؔ نے بھی اس طلقے کے اس ترغیبی رجحان کے زیرِ اثر شراب نوشی

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری۔ حالی صفحہ ۱۱۱۔

کی ابتدا کی۔ لہٰذا یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ غمِ جاناں اور غمِ زیست کی مسلسل ناکامیوں سے تنگ آکر مجاز نے شراب نوشی میں پناہ ڈھونڈی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آگے چل کر انھیں زندگی کے لئے جو جد و جہد کرنی پڑی اور غمِ عشق کے لئے جو صدمے اٹھانے پڑے اس میں البتہ انھوں نے اس شراب کی بے خودی کا سہارا لیا:۔

مجاز کی شراب نوشی کا محرک اک گونہ بیخودی کا خیال ہوا انھوں نے ہمیشہ اپنی زندگی کے بے پایاں غم کو بھولنے کے لئے شراب پی لیکن آخر میں تو یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ بغیر کسی خیال کے پیتے تھے۔ شراب نوشی کو مجاز نے غم غلط کرنے اور زندگی کی تلخیوں کو بھلانے کے لئے اپنایا تھا لیکن وہ اُن کے لے مصیبت بن گئی۔[1]

جب عادت پڑ گئی تو ایک سے ایک مسائل لاکر کھڑے کرتی رہی۔ بہ یک وقت مسائل کا حل بھی بنتی اور خود ایک مسئلہ بن کر ان کی شخصیت میں پست کرداری MALADJUSTMENT کی نشو و نما کرتی رہی۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں بغیر شراب کے افسردہ اور مایوس نظر آنے لگتے تھے۔ ان کی تمام افسردگیاں، محرومیاں اور ان سے پیدا ہونے والے تناؤ، شراب کے دو چار گھونٹ کے بعد وقتی طور پر مٹ جاتے تھے۔ ان کا ذہن کچھ زیادہ ہی بیدار نظر آنے لگتا تھا اور اپنے ماحول پر چھا جانے والے شاعر کا عزم اور اعتماد اپنے عروج پر پہنچ جاتا تھا۔

ان کی شاعری کے اندر "میرا یہ دعویٰ کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں" والی جو شخصیت بنتی ہے وہ بھی زندگی میں اس سے بہت دور تھے۔ یہ ایک خیالی اور مثالی نوعیت کا تصور تھا۔[2]

تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوسِ نظر
مجھ کو بھی دعویٰ کہ ہر محفل میں چھا سکتا ہوں میں
آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

نفسیاتی نقطۂ نظر سے شراب نوشی کی ایک اسٹیج وہ آتی ہے جب انسان فریبِ نظر کا شکار ہونے لگتا ہے۔ نشے کی حالت میں سب کچھ کر گذرنے کا ایک عزم جھلکنے لگتا ہے لیکن حقیقت میں انسان دوسرے کے سہارے کے بغیر ایک قدم آگے بڑھانے کی سکت نہیں رکھتا اور ساتھ ہی اس کی اپنی

---

[1] مطرب بزمِ دلبراں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی صفحہ ۲۲۲۔ [2] مجاز۔ حیات و شاعری۔ منظر سلیم صفحہ ۱۰۲۔

صلاحیتیں اور کارکردگی گھٹتے گھٹتے ختم ہونے لگتی ہے۔ ایک ایک لمحہ کے سکون کی خاطر چھوٹی چھوٹی رنجشوں کو برداشت کرنے کے لئے اسے شراب کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مجاز بھی اس اسٹیج سے گزرے۔

انھیں رفاقت نصیب تھی تو وہ شراب کی۔ وہی ان کا واحد سہارا تھی۔ اندھیری رات کے مسافر کی منزل خود فراموشی کے دھندلکے میں اوجھل سی ہو گئی۔ ان کے چہرے کی تابانی پر دھیرے دھیرے بے بسی کا پردہ گہرا ہوتا گیا۔ آنکھوں کی چمک کی جگہ اتھاہ گہرائی نے لی جس میں امیدیں، تمنائیں دفن ہوں یاس، محرومی جھانک رہی ہو۔ کس غضب کی گہرائی تھی ان آنکھوں میں اور کیا پوشیدہ تھا ان میں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کا دل بجھ سا گیا ہو۔ جیسے ان میں ابھرنے کی خواہش باقی ہی نہ ہو غرض کہ سہم سکڑ کر بقول عصمت آپا کے وہ بالکل کھنڈرہ گئے۔ لکھنؤ بھی ایسا جو شرابی ہو اور شرابی بھی ایسا جسے پیتے وقت اس کا بھی ہوش نہ رہتا ہو کہ کتنی پی رہا ہے اور کیسی پی رہا ہے میں نے اکثر چاہا کہ اُن سے منت کروں، التجا کروں کہ وہ اپنے کو سنبھالیں لیکن جب بھی میں نے ارادہ کیا میری ہمت جواب دے گئی۔ آوارہ کا مصنف اتنا سخت دل نہیں ہو سکتا کہ ماں کے آنسوؤں سے پگھل سکے جیسی وقت ماں انھیں سمجھاتیں، زندگی کا اونچ نیچ سمجھاتیں، گھر کی بگڑی ہوئی حالت کا احساس دلاتیں، اپنی محبت کا باپ کی عزت کا واسطہ دیتیں، ان کے چہرے کے تاثرات بتاتے کہ ماں کے آنسوؤں کا ہر قطرہ ان کے دل پر نشتر کی طرح لگتا۔ پھر بھی نہ جانے وہ کس الجھاوے میں تھے جو اپنے کو نہ نکال پائے[1]

"شراب مجاز کے جمالیاتی احساس گہرے مزاح چھپے ہوئے کرب۔ اس کے فن۔ اس کی کمزوریوں غرض کہ ہر چیز کو اُجاگر کر دیتی تھی۔۔ اور پھر شراب کے بعد کوئی اس کی خوش گفتاری اور گل افشانیِ گفتار کو دیکھے۔ ہر چیز پر تبصرے، سیاست، ادب، نظم، معاشیات، مجاز صاحب ہر چیز پر بولیں گے"[2]

شام ہوتے ہی مجاز کو شغلِ جام و مینا کا خیال آتا۔ اگر کسی کے مہمان ہوتے تو میزبان سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے۔ دوست احباب قدرداں لوگوں کے ساتھ اچھی شراب نہ سہی معمولی ہی سہی۔ کچھ نہ کچھ ہونا ضرور چاہئے اور ایک ہی پگ کے بعد مجاز کی شخصیت کی ساری مایوسیاں

---

[1] جگن بھیا۔ حمیدہ سالم۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۱۹۶۰ ۔ ۱۹ [2] اکس جنوں کی داستاں، ابوالخیر کشفی۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۳۰۔

اور افسردگیاں چھٹ جاتیں اور ان کے سارے رنگ بکھر پڑتے۔ اتنی شدت سے شراب نوشی کے باوجود مجاز کو ہر وقت اس فعل سے ایک شرمندگی کا احساس رہتا تھا۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ وہ ایک گھٹیا قسم کے دیسی شراب خانے میں بیٹھے ٹھرے سے کلیجے کو جلا رہے تھے کہ ایک دم سے چیخ پڑے۔

"سنتے ہو! میری شراب نوشی میرا احساسِ شکست ہے۔ میں نے شراب میں پناہ ڈھونڈی ہے۔ تم مجھ سے اونچے ہو۔ وہ سب مجھ سے اونچے ہیں جنھیں غم روزگار شراب نہ پلا سکا۔ وہ لڑنا جانتے ہیں۔ وہ عارضی زندگی کا سہارا نہیں لیتے۔ تم شراب ہرگز نہیں پینا۔ میں شراب تسکین کے لئے پیتا ہوں۔ اگر تمھیں نماز پڑھنے سے تسکین ہوتی ہے تو نماز پڑھو۔ وہ بھی تو بیخودی ہے۔ ہم دونوں کا مقصد ایک ہے۔ راستے الگ ہیں۔ ہم دونوں GREAT ہیں۔ سارے شرابی GREAT ہیں اور سارے نمازی بھی۔"[1]

مجاز کے ان چند جملوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ شراب نوشی کے اس اسٹیج پر پہنچ گئے ہیں جہاں احساسِ ندامت و شرمندگی اسے دکھ دینے لگتا ہے لیکن وہ اس کی مدافعتی تاویلیں کرکے اپنے فردِ خاندان، دوست احباب اور سب سے زیادہ خود اپنے کو مطمئن کرنا چاہتا ہے۔ اور آخر میں اپنے شب و روز کو بغیر شراب کے گوارا نہیں کر پاتا کیونکہ اس کا احساسِ ندامت، افسردگی، ذہنی انتشار اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ مجاز بھی کچھ ایسی ہی حالت سے گذرے۔ اپنے گھر کے افراد، دوست احباب کے سمجھانے کے باوجود وہ اس عادت کو ترک نہ کر پائے۔ اگر کبھی ہفتہ عشرہ کے لئے چھوڑ بھی دیا تو ذرا سی پیش کش پر ان کے قدم لڑکھڑا جاتے جو فطری بات تھی۔

ان کی ظرافتِ طبع اور بذلہ سنجی سے لطف اٹھانے والے ناسمجھ دوستوں اور ان کی شاعری کو کھلونا سمجھ کر دل بہلانے والے نادان ادب نوازوں نے انھیں پھر شراب خانے کی طرف رجوع کرنا شروع کیا۔ وہاں قدم رکھنے کے بعد ان کے قدم تیزی سے اس طرف اٹھنے لگے۔ راتوں کو مدہوشی کے عالم میں دو تین بجے گھر واپس آنا۔ دن کے دس گیارہ بجے خمار کے عالم میں اٹھنا، منہ ہاتھ دھو کر برآمدے میں پڑے ہوئے پلنگ پر ناشتہ کرنا۔ تھوڑی دیر اخبار کے ورق اِدھر اُدھر پلٹنا: یہ تھا ان کا پروگرام۔ اس درمیان میں موقع پاکر ماں کوشش کرتیں کہ رات کی کیفیت کا انھیں احساس دلائیں اور آیندہ

---

[1] اس کے جنوں کی داستاں۔ ابوالخیر کشفی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۰۶۔

کے لئے احتیاط پر انھیں آمادہ کریں۔ وہ چپ چاپ سب کچھ سنا کرتے۔ ایک خاموشی ہر بات کا جواب تھی۔ جب اندرونی کش مکش برداشت سے باہر ہو جاتی تو اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتے۔ [1]

شراب نوشی کی ایک اسٹیج وہ بھی آتی ہے جب انسان شراب میں کسی کی شرکت کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور کوئی بھی پیش کرے اس کے قبول کرنے میں عار نہیں سمجھتا۔ اس پر ایک خوف دہراس کی سی کیفیت طاری رہتی ہے اور وہ ہر کس و ناکس سے کترانے لگتا ہے۔ اس میں کبھی کبھی وہ تشدد کی حدوں کو بھی چھونے لگتا اور ایسی حالت میں اپنے قریبی دوستوں سے بھی دور بھاگنے لگتا ہے۔ اپنے اور بیگانوں کی نصیحت اسے بُری لگنے لگتی ہے۔ شراب نوشی کے سامنے بھوک پیاس کا احساس بھی ختم ہونے لگتا ہے۔ اس لئے دھیرے دھیرے شراب اس کی زندگی کا جزو بن جاتی ہے۔ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ شراب کی دستیابی یا اس کو حاصل کرنا اس کی زندگی کا مقصد اور نصب العین بن جاتا ہے۔

مجاز اس منزل سے گذر چکے تھے "جب انسان پر کسی بات کا اثر ہوتا ہے۔ انھیں خود اپنے اوپر قابو نہیں رہا تھا۔ اس کی شراب نوشی کا یہ عالم تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہی چاہتے بھی تھے۔ زندگی ان کے لئے ایک بوجھ تھی اور اس بوجھ کو اٹھانے کی ان میں سکت باقی نہیں رہی تھی۔ اس لئے انھوں نے شراب کا سہارا لیا۔ ساری زندگی اسی کے سہارے جئے اور بالآخر اسی کے سہارے دنیا سے سفر کر گئے"۔ [2]

شراب کے مقصدِ حیات بن جانے کے باوجود کوئی بھی غلط قدم اٹھاتے وقت اس کی اپنی تہذیب و تربیت مانع آتی ہے۔ اُسے ہر وقت اپنی تباہی و بربادی کا ڈر اور خوف لاحق رہتا ہے۔ مسلسل ذہنی تاویلوں اور الجھنوں کے بعد خود اپنے آپ کو ہی گناہگار تصور کرنے لگتا ہے اور اقبال و اعتراف کرنے لگتا ہے کہ ترکِ شراب اس کے لئے اب ممکن نہیں ہے۔ مجاز پر بھی ذہنی انتشار کی کچھ ایسی ہی کیفیت گذری ہے۔ ایک طرف شراب کی دستیابی کے لئے مادی وسائل کی ضرورت اور اس کی غیر موجودگی سے اس کے اندر پیدا شدہ افسردگی نے ان کی زندگی میں اور گھن لگا دیا۔ مایوسیاں اپنے عروج پر پہونچ گئیں لیکن یہ ان کی اعلیٰ تہذیب و تربیت تھی جس نے شرابِ نوشی کی حالت میں بھی پستی و رکاکت کبھی نہ پیدا ہونے دی۔

---

[1] و [2] مجاز حیات و شاعری، منظر سلیم صفحہ ۱۰۱

وہ بدمستی کے عالم میں بھی جب اُنھیں سر پیر کا ہوش نہیں رہتا تھا بعض باتوں کو حتی الامکان نبھاتے تھے۔ مثلاً کسی کی توہین نہیں کرتے تھے کسی کو گالی نہیں دیتے تھے۔ کسی کی شاعری کو حقیر نہیں قرار دیتے تھے۔ کوئی بھی ایسی بات نہیں کرتے تھے جو عام حالت میں تہذیب سے گری ہوئی تصور کی جاتی ہے اس نشے کے عالم میں بھی بزرگوں کے احترام کا خیال رہتا جس کا ایک واقعہ آل احمد سرور صاحب نے بیان کیا ہے:۔

برابر کے کمرے میں پنڈت کیفی تھے۔ اس کے بعد کے کمرے میں مجاز اور جذبی تھے۔ رات کو سب سونے لیٹے ہی تھے کہ پنڈت جی کے کمرے سے شور بلند ہوا" ارے دوڑیو۔ بچائیو۔ یہ مارے ڈالتا ہے۔ ہم لوگ گھبرا کر دوڑے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ مجاز صاحب نشے میں پنڈت جی کے پیر زور زور سے ابھر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آپ بزرگ ہیں آپ کی خدمت میں سعادت ہے اور پنڈت جی چیخ رہے تھے کہ "ہائے میں مرا" بڑی مشکل سے مجاز کو علیحدہ کیا گیا۔ صبح ہوئی تو اب مجاز پنڈت جی کے پاس نہیں آتے آخر پنڈت جی نے بلایا گلے سے لگایا اور کہا کہ "مجاز! تم سے اردو شاعری کو بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ تمھارے خلوص سے میں بڑا متاثر ہوا۔ مگر خلوص میں تم نے میرا کام ہی تمام کردیا ہوتا۔[1]

شراب کی فراہمی کے لئے کبھی کبھی جیسا کہ ہر شرابی کا وطیرہ بن جاتا ہے وہ اپنی بیش بہا اور قیمتی چیز مٹی کے مول فروخت کر دیتا ہے۔ لہٰذا مجاز نے بھی مجبوری ایک بار ایسی حرکت کی تھی۔

ایک دن جب شراب پلانے والا کوئی دوست نہ ملا تو ایک پبلشر کے پاس پہونچے اور اپنے مجموعۂ کلام کا معاملہ صرف پچاس روپیے میں طے کرلیا۔ پچاس روپئے پبلشر نے دے دیے اور مجاز نے ان پیسوں کی شراب پی لی۔ پبلشر نے "ساز نو" کے نام سے ان کا مجموعۂ کلام چھاپ لیا۔ دوستوں کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے مجاز کو آڑے ہاتھوں لیا۔ انھوں نے اپنی غلطی تسلیم کرلی۔ اپنے کیے پر نادم بھی ہوئے لیکن وہ مجبور تھے۔ بعض باتیں ان کے اختیار سے باہر تھیں۔[2]

نصرت اللہ انصاری جو لکھنؤ میں نیا ادب کے حلقے کے ادیبوں میں شامل تھے مجاز کے گہرے

---

[1] مجاز رومانیت کا نقیب۔ آل احمد سرور۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۱۶۵-۱۶۶

[2] مطرب بزم دلبراں۔ عبادت بریلوی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۳۴۲۔

دوستوں اور مداحوں میں تھے۔ اُن کی شراب نوشی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:-

"جب ان دونوں کا خیال آتا ہے تو ایک بات جو رہ رہ کر یاد آتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے پیتے تھے تو پیتے ہی اُن کی رقابتیں اور کثافتیں اُمنڈنے لگتی تھیں اور کبھی کبھی تو اس زور شور سے کہ ساری محفل درہم برہم ہو جاتی تھی مگر مجاز جتنی ہی پیتا جاتا تھا اتنی ہی اس کی محبت اور شرافت عود کرتی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے محبت کا ایک سرچشمہ ہے جو پھوٹا پڑتا ہے۔"[1]

شراب کی ایک اسٹیج وہ بھی آتی ہے جب آدمی چسکیاں لینے کے بجائے جام کے جام چڑھا جانے کی خواہش کرنے لگتا ہے اور یہیں سے یہ شغل بربادی و مصیبت کا باعث بننا شروع ہو جاتا ہے اور یہ دَور مجاز پر دلّی کے دورانِ قیام آگیا تھا۔ دلّی میں جوش صاحب کی محفل میں پینے کا ذکر عبادت بریلوی صاحب نے بھی کیا ہے:-

"جوش صاحب کی محفلِ نائے و نوش میں انھیں دیکھا اور انھیں دیکھ کر ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں شراب جلد سے جلد اپنے اندر اتار لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ تیزی سے پینے اور زیادہ پینے کی کوشش کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ بہت جلد بہکنے لگتے اور تھوڑی دیر بعد انھیں اپنا ہوش نہ رہتا ...... ان کے اعصاب نے جواب دے دیا تھا۔ شراب ان کی برداشت سے باہر تھی۔ لیکن اس صورت نے شراب کے معاملے میں ان کی حالت ایک ایسے بیمار کی سی کر دی تھی جو کھانا کھا نہیں سکتا لیکن کھانے کی ہوس جس کے یہاں شدید سے شدید تر ہو جاتی ہے۔ مجاز کو شراب کا ہَوکا ہو گیا تھا۔"[2]

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مجاز بے حد شراب پیتے تھے اور ان پر شراب نوشی کی وہ کیفیت طاری ہو چکی تھی جب وہ ہر قسم کی شراب پی سکتے تھے۔

مجاز بری طرح پیتے تھے۔ لیکن ان کی یہ شراب نوشی بھی اپنے آپ کو بھلانے کے لئے تھی۔ اس میں کسی قسم کا نشاطیہ پہلو نہیں تھا وہ اک گونہ بیخودی چاہتے تھے۔ شراب سے انھیں جو والہانہ وابستگی تھی اُس کو دیکھ کر یہ احساس ضرور ہوتا تھا۔ اسی لئے شراب کے لطیف

---

[1] شاعرِ محفلِ وفا مطربِ بزمِ دلبراں۔ فرحت اللہ انصاری۔ قومی آواز مجاز نمبر۔

[2] مطربِ بزمِ دلبراں۔ عبادت بریلوی۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۳۲۱-۳۲۲

پہلوؤں کی طرف انھوں نے کبھی بھی توجہ نہیں کی تھی۔ وہ ہر قسم کی شراب پی سکتے تھے کیونکہ انھیں تو نشے سے غرض تھی اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے وہ دیسی شراب تک سے گریز نہ کرتے تھے"۔[1]

یہ صحیح ہے کہ مجازؔ نے شراب کبھی نشاطیہ پہلو سے نہیں پی ہے بلکہ وہ اپنے کرب اور غم کو بھول جانا چاہتے تھے۔ بقول عبادت بریلوی :۔

"شراب کے سرور سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ پیتے تھے تو بس پیتے ہی چلے جاتے تھے اور جلد ہی ایک ایسی منزل آجاتی تھی جب انھیں دنیا و مافیہا کا خیال ہی نہیں رہتا تھا اور وہ اپنے آپ اور گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتے تھے اور اس عالم میں دیکھنے والے کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ صرف اسی غرض سے پی رہے تھے کہ جلد سے جلد بے حال ہو کر اپنے آپ سے باہر ہو جائیں"۔[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کے اپنے حالات یار دوستوں کی صحبت، وقت کے تقاضے اور اس کا ساتھ دینا۔ یہ ساری چیزیں یکجا ہو کر اس کی شراب نوشی کی عادت کو راسخ بنانا شروع کر دیتی ہیں اور اگر ان میں کہیں غمِ جاناں اور غمِ دوراں بھی شامل ہو جائے تو اس کی شدت بڑھتی ہی جاتی ہے۔

مجازؔ پر بھی یہ دور اس وقت گذرا جب وہ علی گڈھ سے دِلّی گئے اور وہاں انھیں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ساتھ ہی ان کے دل نے بھی ایسی چوٹ کھائی جس کے کرب نے شراب کی خواہش کو دوبالا کر دیا۔ بقول سردار جعفری کے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ شراب نے اس کے ذہنی توازن کو خراب کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک شکستہ شخصیت کو ذہنی توازن کی کمی نے شراب میں غرق کر دیا۔

یا بقول عصمت چغتائی

"وہ شراب پیتے ہیں اور حماقت کی حد تک پیتے ہیں پیتے وقت صرف ایک بات کا خیال رہتا ہے کہ جلد جلد پئیں اور بہت سی پی لیں تاکہ دوسروں سے زیادہ حصہ ملے جس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے

---

[1] مطرب بزم دلبراں۔ عبادت بریلوی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۳۲۰۔

[2] مطرب بزم دلبراں۔ عبادت بریلوی۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۳۲۱، ۳۲۲ [3] عشق مجازی۔ عصمت چغتائی۔

کہ حالت خراب ہو جاتی ہے۔ وقتی طور پر تو کچھ نہیں۔ بعد میں آگ کی بارش جب متواتر معدے اور جگر پر ہوتی ہے تو صحت کا تو کوئی سوال ہی ایک سرے سے نہیں رہتا۔ شاید یہی وہ سب سے شدید مرض ہے جو جان کو لاگو ہے جس نے جسم کو کھوکھلا کر دیا ہے اور دماغ پژمردہ ہو گیا ہے[1]

شراب نوشی کی ایک کیفیت مجاز پر ایسی بھی گذری ہے جب ان کی تہذیب و شرافت کا دامن بھی ان کے ہاتھ سے چھوٹنے لگا تھا۔ وہ نشے کی حالت میں ایسی عجیب و غریب حرکتیں کرتے جسے دیکھ کر یہ احساس ہوتا کہ مجاز جیسا انسانیت کا درد رکھنے والا انسان بھی اتنا گر سکتا ہے۔

"اس بھنور میں پھنس کر وہ کبھی کبھی اپنی انسانیت اور شرافت سے بھی گر گئے ہیں، جس کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ شراب پی کر رات گئے سڑکوں پر لڑکھڑاتے پھرنا، لوگوں سے جھگڑنا اور اول فول بکنا ان کا شعار بن گیا تھا۔ شراب پینے کے لئے پیسے نہ ہوں تو وہ طرح طرح سے پیسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ کوئی جاننے والا مل جاتا تو اس کی شامت آجاتی۔ مجاز اسے چھوڑتے نہیں تھے جو کچھ بھی جس طرح بھی مل جاتا وصول کر لیتے۔ شراب نہ ہو تو انھیں خیال نہیں رہتا تھا کہ وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا کچھ کر رہے ہیں"[2]

خود داری جو انھیں جان سے زیادہ عزیز تھی اور نہایت تنگدستی کے دور میں بھی کسی کی مدد اور اعانت نہ چاہتے تھے لیکن شراب کی خاطر کبھی کبھی اس کا خون بھی کر دیتے۔ ان کی زندگی میں ایسے چند ہی لمحے کیوں نہ ہوں ضرور گذرے ہیں کہ اس طلب نائے و نوش کے لئے اپنے قریبی دوستوں سے اقرار و وعدہ لیتے اور اعزا سے اپنی اس ضرورت کا اظہار کرتے دیکھا گیا ہے۔

"وہ روز شام کو شراب پینے کے لئے مجھ سے پانچ روپے لیتا تھا اس سے پہلا جام آجاتا تھا باقی جاموں کا انتظام مے خانے میں آنے والے کر دیتے تھے۔ ایک روز مجاز نے دس روپے مانگے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو کہنے لگا "سردار تمہارے بیوی بچے ہیں، گھر ہے۔ شاعری کرتے ہو۔ میرے پاس کیا ہے اب شراب بھی نہیں پینے دیتے"[3]

بقول جذبی صاحب کے۔ "آخری دور میں اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر مجاز کے پاس دس

---

[1] عشق مجازی عصمت چغتائی صفحہ ۲۴۔ [2] مطرب بزم دلبری۔ عبادت بریلوی۔ مجاز ایک آہنگ صفحہ ۳۲۳۔۳۲۴۔
[3] ہم پہ ہے ختم شام غریبان لکھنؤ۔ سردار جعفری۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۲۲۱۔

روپے ہوں اور اس سے کہا جائے کہ تمہارے کسی دوست کو ان روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔ تو وہ ایک بار یہ سوچے گا کہ آیا اس کی شراب پی جائے یا دے دیا جائے اور میرے خیال میں شراب پینے کو ہی بہتر سمجھتا تھا[1] وہ مجاز جسے اپنے دوست اتنے عزیز تھے اس پر شراب نوشی کی ایسی بھی حالت گذری ہے کہ جہاں وہ شراب کی خواہش پر دوستی کو بھی قربان کر سکتا ہے۔

حیات اللہ انصاری صاحب نے دورانِ گفتگو مجاز کی شراب نوشی کے سلسلے میں تقریباً یہی بات کہی کہ شراب نوشی اس کو اتنی عزیز ہو گئی تھی کہ اس کے لئے وہ معمولی سے معمولی جان پہچان والوں کے آگے بھی ہاتھ پھیلا دیا کرتے تھے۔ جیسے بھی اور جہاں سے بھی پیسے حاصل ہو جاتے اس سے جلد از جلد شراب پی جانا چاہتے تھے۔

مجاز کی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ مجاز نے شراب نوشی کو مقصدِ حیات بنا لیا تھا اور اسی شراب کی شدت نے ان کی زندگی کو ختم کر دیا، لیکن کیا یہ بات ممکن نہیں تھی کہ وہ شراب جسے انھوں نے شغل کے طور پر شروع کیا تھا ان سے چھوٹ جاتی۔ زندگی کی کاوشوں میں انھیں جن ناکامیوں اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑا اس نے انھیں شراب کی بے خودی میں ڈوب جانے پر مجبور کر دیا۔ آخر کار وہ اسٹیج آگئی جب وہ اپنے آپ کو ایذا پہنچا کر مطمئن ہوتے۔ شاید ان کا لاشعور ان کو اس غلط کام پر شرمندہ کرتا اور وہ اسی احساسِ ندامت کے تحت بے بس ہو کر دو چار جام اور چڑھا لیتے۔ بقول سردار جعفری صاحب کے :-

"ذہنی اور جسمانی قوت برداشت کی ہوتی ہیں۔ بعض لوگوں کے اعصاب فولادی ہوتے ہیں۔ بعض کے اعصاب گوشت پوست کے۔ مجاز کے اعصاب شیشے کی طرح نازک تھے اور ذرا سی ٹھیس میں چٹخنے لگتے تھے"[2]

اکثر نقادوں نے مجاز کی شراب نوشی پر سخت تنقیدیں کی ہیں لیکن میرے خیال میں مجاز کو تنقیص و تنقید کا ہدف بنانے سے قبل ان کے حالات کا بھی جائزہ لینا چاہئے جنھوں نے انھیں مے خانے کی طرف مائل کیا۔ یہ ضرور ہے کہ انسان کے دکھوں کا مداوا صرف شراب ہی نہیں ہے، بلکہ ان غموں سے نجات دلانے کے اور بھی طریقے ہیں۔ پر مجاز کے ساتھ یہ مجبوری تھی یا بدقسمتی کہہ لیجئے

---

[1] جذبی صاحب سے انٹرویو جو ان سے علی گڈھ میں لیا گیا اور ٹیپ بند ہے

[2] ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ۔ قومی آواز۔ مجاز نمبر۔ دسمبر ۵۵ء۔

کہ وہ شروع ہی سے شراب کے مزے اور نشے سے آشنا تھے اور جب غمِ روزگار اور غمِ عشق نے انھیں اس طرح گھیرا تو مجبوراً انھیں عارضی بیگانگی کا سہارا لینا پڑا۔ اگر شاید خود مجاز کے لفظوں میں جو انھوں نے سردار سے کہا تھا۔ سردار تمھارے بیوی بچے ہیں، گھر ہے"۔ یا جذبی سے شکایت کہ" وہ فیملی میں ہو گیا ہے۔ بچوں کے جوتے لینے شہر جاتا ہے اور چھوٹے بڑے ہوتے ہیں تو کئی کئی بار چکر لگاتا ہے۔ اب جذبی وہ جذبی نہیں رہا" سراسر اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اسے اپنی ان ازدواجی محرومیوں کا شدید احساس تھا۔ ممکن ہے کہ خود فیملی مین ہو کر ساری بے اعتدالیاں ترک نہ کر سکتا تو بھی جوش صاحب کی طرح متوازن انداز میں زندگی گذارتا۔ مجاز کے اکثر معاصرین زندہ تھے۔ اور یہ مُضر عادت بھی اُنھیں کوئی ایسا خاص نقصان نہ پہنچا سکی' لیکن اس شیشے سے بھی نازک دل رکھنے والے انسان کو اس قدر مصائب کا سامنا کرنا پڑا کہ اس کا دل ہی کیا پورا وجود پارہ پارہ ہو گیا۔ انھیں زندگی کے ہر محاذ پر ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی زہرہ جبینوں کے ستم اُٹھائے۔ کبھی بے روزگاری کے صدمے اٹھانے پڑے اور جب گھبرا کر دوست آشناؤں کا سہارا لینا چاہا تو وہاں بھی خاطر خواہ دل جوئی نہ ہوئی۔ لہٰذا اس حساس شاعر کو اپنے غموں سے نجات کا ذریعہ صرف پرانی رفیق شراب ہی میں غیر محسوس طور پر نظر آیا لیکن ان سارے ناموافق حالات کے باوجود مجاز کا ذہن اور احساس کبھی بھی شکستہ نہیں ہوا۔ سکت نہ ہونے کی بات اور ہے ورنہ اُن آخری ایامِ زندگی میں" فکر" جیسی لافانی نظم ہرگز نہ تخلیق ہوتی۔ اور ان محرومیوں کے باوجود ان میں زندہ رہنے کا عزم اور حوصلہ باقی تھا ؎

مٹ کے۔ برباد جہاں ہو کے۔ سبھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں
کارفرما ہے کوئی تازہ جنونِ تعمیر
دلِ مضطر ابھی آماجگِ یاس نہیں
"فکر"

اس نظم کے آخری بند کا ایک ایک لفظ ان کے عزم کی نشان دہی کرتا ہے ؎

بہ ایں انعام دنا اُف یہ تقاضائے حیات — زندگی وقفِ غمِ خاک نشیناں کردے
خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو — خونِ دل نذرِ چمن بندیِ دوراں کردے
"فکر"

بہر کیف مجازؔ نے اپنے تمام دکھوں اور غموں کو غرقِ مئے ناب کر دیا اور شراب کو اس شدت سے پیا کہ اس کا ساتھ کوئی بھی نہ دے سکا۔

اس عالمِ کیف و مستی میں۔ اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے۔ ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

مجاز کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ

مجاز جن کی شخصیت کے اتنے دلکش، مختلف اور متضاد روپ ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔

مے خانوں کا مجاز، مشاعروں کا مجاز، یار دوستوں کی انجمن کا مجاز اور بزم دلبراں کا مجاز۔ ہر محفل پر اس کی اپنی شخصیت چھائی رہی لیکن وہ اپنی نجی زندگی میں کیوں اس قدر ناکام رہا۔ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں۔ اکثر ناقدین کی رائے ہے کہ شراب نوشی نے مجاز کو برباد کر دیا۔ لیکن کیا یہ حقیقت ہے؟؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ شراب نوشی کو ترک کر دیتا جسے اس نے محض تفریحاً شروع کیا تھا۔ ان ناکامیوں اور محرومیوں میں اس کا اپنا کتنا دخل تھا، میری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ کسی بھی انسان کو برباد کر دینے میں غلط معاشرہ اور اس کے غلط افراد کا ہاتھ جتنا زیادہ ہوتا اُتنا خود اس انسان کا نہیں۔ مجاز کی بربادیوں میں مجاز کی اپنی فطرت کا بھی دخل یقیناً تھا۔ لیکن یہ بات بھی ضرور ہے کہ اس کی فطرت کی تعمیر میں اس زمانے اور معاشرے کے حالات اثر انداز ہوئے ہوں گے۔ نسل و قوم کی وراثت اور اودھ کی تہذیب پھر اس سے پیدا شدہ خامیاں جس میں عیش پرستی، حسن پرستی اور سہل پسندی کا جذبہ تقریباً پورے معاشرے کی فطرت ثانیہ بن گیا تھا۔ اور انسان ایسے معاشرے میں رہ کر ان اثرات سے بچ نہیں سکتا۔

مجاز اودھ کی اسی جاگیردارانہ تہذیب میں پلے، بڑھے جہاں دولت کی فراوانی اور عیش و عشرت کی کمی نہ تھی۔ اس ماحول نے مجاز کو بھی سہل پسند اور آرام طلب بنا دیا۔ اس سہل پسندی کے نتیجے میں ان کی زندگی میں بے عملی اور بے اعتدالی کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ کسی بھی کام میں کوئی نظم و ضبط نہیں رہ گیا۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ مجاز کو تلاشِ معاش میں قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

مجاز کو اپنے گھر میں بھی کچھ ایسی فضا میسر تھی جہاں ان کو ہر چیز ان کی خواہش کے

مطابق بغیر کسی حیل و حجت کے حاصل ہو جاتی۔ ان کی خواہشات کی راہ میں کبھی کوئی رکاوٹ نہ آنے پائی۔ ہر وقت ان کی پسند مقدم رکھی جاتی جس سے اُن کے اند وجد و جہد کرنے کی کمی اور کسی بھی رکاوٹ کو اپنی راہ سے ہٹا کر آگے بڑھنے کی ہمت پیدا ہونے نہ پائی۔ لہٰذا کوئی چھوٹی سی بھی دشواری راہ میں حائل ہوتی تو وہ اس سے مقابلہ کرکے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرتے۔ بلکہ فوراً دل برداشتہ ہو جاتے۔ ماں کے بے انتہا پیار اور رہر ہر قدم پر ماں باپ کے سہارے نے اُن میں خود اعتمادی کی کمی واقع کر دی تھی، ماہرِ نفسیات نے مختلف انسانوں کے اطوار و کردار کے مطالعے سے یہ ثابت کیا ہے کہ جہاں ماں کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے وہاں اولاد نرینہ میں خود اعتمادی اور خود مختاری کی کمی ہونے لگتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں خود کو ساری کوتاہیوں کا ذمہ دار قرار دینے کا رجحان بننے لگتا ہے۔ وہ تمام ناکامیوں کے لیے دوسروں کو نہیں بلکہ خود کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتا ہے[1]۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ مجازؔ نے تمام زندگی اپنی بربادیوں کا شکوہ شاید کبھی اپنی زبان سے نہیں کیا۔ اپنے غموں کو خود اکیلا ہی جھیلتا رہا۔ اگر کبھی کچھ کہا بھی تو صرف اتنا:

مری بربادیوں کا ہمنشینو　　　تمھیں کو کیا مجھے بھی غم نہیں ہے

ماں کے اس لاڈ پیار کے نتیجے میں مجازؔ میں خود کو چاہے جانے کی خواہش بڑھتی گئی اور اس نے ایک جذباتیت کا روپ لے لیا اور اس جذبے کی تسکین کے لیے ان کی افتادِ طبع ایک سہارا بن گئی۔ مزید برآں یہ ان کی خوش قسمتی کہہ لیجیے یا بد قسمتی کہ علی گڈھ اور دلّی کے ادبی حلقے میں وہ فضا بھی میسر آگئی اور خاطر خواہ مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ شاعر جس کی دنیا حُسن ہی حُسن تھی "شاعرِ محفلِ وفا، مُطربِ بزمِ دلبراں" بن گیا جس سے اُن کے ان جذبات کو بے حد تسکین ملی اور اتفاق دیکھئے کہ انھیں دلّی میں اپنے حُسن کا معیار مل گیا۔ عورت کا جو تصوّر اُن کے ذہن میں تھا وہ اُن کی آنکھوں کے سامنے آگیا اور وہی ان کی شاعری کا محور بن گیا۔ لیکن یہ ان کی بد قسمتی تھی کہ ابھی ان کے یہ جذبات پوری طرح آسودہ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ اُس حُسن کے دروازے اُن کے لئے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔ ان کے تصورات کی دُنیا بکھر گئی۔ چاہے جانے کے جذبے کو گہری چوٹ پہونچی جس کے نتیجے میں وہ اپنے اس جذبہ کی تسکین کے لئے اِدھر اُدھر سرگرداں پھرنے لگے۔ اگر کہیں تھوڑی سی بھی نگاہِ التفات

---

[1] سوشل سائیکلوجی از

ملتی۔ مجازؔ فوراً اُس طرف جُھک جاتے اور اس نے کہیں "نورا" کہیں "مادام" کہیں "ینگ لیڈی" اور کہیں "شہناز" کی شکل اختیار کرلی ہے۔ لیکن کہیں بھی اس کے جذبات کو آسودگی نصیب نہ ہوتی۔ اور کوئی بھی اس کا سہارا نہ بن سکا۔ اس سب کے باوجود مجازؔ نے خود کوئی غلط قدم نہ اُٹھایا کبھی بھی کوئی پیش قدمی نہ کی۔ اور وہ ایسا کر بھی کیسے سکتا تھا۔ اس کی اپنی فطرت کی شرافت اور شرمیلاپن اُن کی اِن خواہشات کے اظہار میں مانع آتا جس کی وجہ غالبًا یہ تھی کہ جس ماحول اور فضا میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی وہاں ایک طرف تعیش کا دور دورہ تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تادیب کی جکڑ بند اور اس کا اثر۔ انسان کو کھُل کر اپنے جذبات اور خواہشات کے اظہار و آسودگی میں مانع تھا۔ ان متضاد اثرات کی حامل فضا میں انسان کے فطری جذبات اور اصول و قواعد میں تصادم ہونا لازم ہے۔ انسان کے جذباتِ نفسی دب جاتے ہیں اور اصول و ضابطے حاوی ہوجاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں انسان کی ہزاروں فطری و جبلی خواہشات کا خون ہوتا ہے اور انسان ایک انجانے خوف کا شکار ہوجاتا ہے جو شرمیلے پن کو جنم دیتا ہے۔

مجازؔ بے حد شرمیلے آدمی تھے۔ میں نے کسی سے انھیں آنکھ ملا کر بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اُن کی آنکھیں ہمیشہ نیچی ہی رہتی تھیں، لیکن اس شرمیلے پن کے باوجود بزمِ دلبراں سے انھیں گہری دل چسپی تھی۔ "نگارانِ لکھنؤ اور عشوہ کارانِ علی گڈھ کا ذکر ان کا محبوب مشغلہ تھا لیکن یہ ذکر بھی وہ کبھی کھُل کر نہ کر سکے۔ . . . . . . یہ باتیں بھی بلیغ اشاروں اور معنی خیز فقروں اور ذہانت سے بھرپور لطیفوں میں ہوتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود انھیں 'مطربِ بزمِ دلبراں' بننے کی آرزو تھی اور شاید یہی آرزو جو انھیں علی گڈھ میں میرس روڈ کے چکر لگانے، لکھنؤ میں حضرت گنج اور امین آباد کا طواف کرنے اور دلّی میں کناٹ پیلس اور چاندنی چوک کی سڑکیں ناپنے کے لئے مجبور کرتی تھی۔ [1]

اِس شرمیلے پن کی وجہ سے مجازؔ اپنے حُسن پرستی کے جذبے کو تسکین تو نہ دے سکے، لیکن اس کا اظہار قدم قدم پر کرتے رہے ؎

حُسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمانِ محبّت نے سپر ڈالی ہے

---

[1] مطربِ بزمِ دلبراں۔ از عبادت بریلوی۔ مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۳۱۰۔ ۳۱۱

ان دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پہ سرشاریِ عشرت کا جنوں طاری تھا
ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہریاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا
بسترِ مخمل و سنجاب تھی دُنیا میری
ایک رنگین و حسیں خواب تھی دُنیا میری

آہ وہ دوشیزہ لب۔ گل ریز لب۔ گلنار لب
آہ وہ لب آشنا لب۔ شوخ لب۔ خونبار لب
وہ حجاب آگیں تکلم۔ وہ رسیلے قہقہے
گفتگو کچھ اس سلیقے سے۔ کچھ اس انداز سے
دل بچانا سخت مشکل تھا کمندِ ناز سے

اس حُسن و عشق کے پرستار کو عشق کی راہ میں اتنی ٹھوکریں کھانی پڑیں کہ وہ خود یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:

'میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار'

اور اس کے اندر یہ احساسِ شکست پیدا ہو گیا۔ ع

"میں نے خود اپنے کئے کی یہ سزا پائی ہے"

لہٰذا اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک حسین بازوئے سیمیں کا سہارا ڈھونڈنے والے شاعر کی مایوسیوں، ناکامیوں اور حسرتوں کے ردِ عمل کا دل مظاہرہ ہوا جس کے سلسلہ میں ابوالخیر کشفی صاحب نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مجاز سڑک پر ان کے ساتھ چہل قدمی کرتے چلے جا رہے تھے اور شراب کی کمی کو مونگ پھلیاں کھا کر پورا کر رہے تھے۔ اتفاق سے دو لڑکیاں تانگے پر ادھر سے گذریں۔ غالباً دونوں بہنیں تھیں۔ مجاز کو دیکھ کر چھوٹی بہن نے کہا۔" دیکھو بجیا! یہ مجاز ہیں۔" مجاز پر ان الفاظ سے دورہ سا پڑنے لگا اور وہ چیخ چیخ کر کہنے لگے:۔

سُنتے ہو کیا کہہ گئی "۔ بجیا یہ ہے مجاز۔" اور ان لڑکیوں کا کام ہی کیا ہے۔ یہ تو ہماری زندگیوں میں اسی طرح ہنستی ہوئی آتی اور ہنستی ہوئی چلی جاتی ہیں اور ہم سے سب کچھ چھین لیتی ہیں۔ ادیب اور شاعر کی شخصیت اور اس کی آوارہ مزاجی سے محبت بھی کرتی ہیں لیکن خارزاروں میں ساتھ نہیں دیتیں۔ کسی آئی۔ سی۔ ایس۔ سے شادی کرنے کے خواب دیکھتی رہتی ہیں اور

شملہ۔ مسوری یا نینی تال کی کوئی شام انھیں کسی موٹے اور بھدے سے آئی۔سی۔ایس۔
سے وابستہ کر دیتی ہے اور ہماری زندگیوں کی تمام روشنیاں بجھ جاتی ہیں۔میری طرف
اشارہ کیوں کیا؟ کیوں کہا کہ یہ مجاز ہے۔ ایسا کرنے کا اُسے کیا حق تھا؟ یہ سب سالیاں
اپنے آپ کو "اعتراف" کی "بنتِ مہتاب" سمجھنا چاہتی ہیں۔ اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتی ہیں۔"

یہ اس کی نامرادیوں اور محرومیوں سے پیدا شدہ کرب کا لاوا تھا۔ یہ کچلی ہوئی آرزوؤں
اور خواہشات کا آتش نشاں تھا جس کی راکھ میں اس کی زندگی کی ساری رونق دفن ہو گئی۔
اس کے ساز کے سارے تار بکھر گئے اور اب اس کی زندگی میں صرف ایک ہی سے باقی تھی اور
وہ تھی شراب جس کو سہارا بنانے کے لیے وہ نفسیاتی طور پر مجبور تھا۔ یہ اچھی طرح جانتے ہوئے
کہ یہ اس کے لیے موت کا پیغام ہے وہ دو چار گھونٹ اور چڑھا لیتا اور یہ کہہ دیتا ؎

اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

شراب نوشی سے پیدا ہونے والی بہت سی خامیوں کے باوجود مجاز کے کردار میں کچھ
ایسی خوبیاں بھی تھیں جن پر شراب کی تیزی بھی اثر انداز نہ ہو سکی۔ مجاز بے حد خوددار اور
انسانیت دوست اور انسانیت پسند تھے۔ کبھی کسی کی برائی یا غیبت کرنا تو دور کی بات ہے۔
کسی کی برائی سننا بھی پسند نہ کرتے۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ تنگ دستی کے باوجود کبھی
رفیقوں کے آگے بھی ہاتھ نہ پھیلایا۔ بلکہ سربلندی و سرشاری کا اظہار کرتے رہے۔ دل بھی بہت
نازک پایا تھا۔ بقول سردار کے "اُن کے اعصاب شیشے کی طرح نازک تھے جو ذرا سی ٹھیس سے
چھنچھنے لگتے۔" سادگی۔ سچائی۔ محبت۔ مروّت اُن کی عین فطرت تھی جس کی تعریف ان کے ہر دوست
اور ملنے والے نے کی ہے۔

جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اُن کے ذہن میں انسانیت کا تصوّر
بہت واضح اور بلند تر تھا اور اس نظام کے منفی اثرات اور سخت رویے سے انھیں سخت نفرت
تھی۔ وہ انسانیت کا خون ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔

آدمی منت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا　　　درد انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا
اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی　　　آدمیت ظلم کی چکّی میں پستی ہی رہی

مجاز کے احساس کی نزاکت اور خودداری کا یہ حال تھا کہ ان کو کسی کی ذرا بھی

ان دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پہ سرشاریِ عشرت کا جنوں طاری تھا
ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہر یاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا
بسترِ مخمل و سنجاب تھی دُنیا میری
ایک رنگین و حسیں خواب تھی دُنیا میری

آہ وہ دوشیزہ لب۔ گل ریز لب۔ گلنار لب
آہ وہ لب آشنا لب۔ شوخ لب۔ خونبار لب
وہ حجاب آگیں تکلم۔ وہ رسیلے قہقہے
گفتگو کچھ اس سلیقے سے۔ کچھ اس انداز سے
دل بچانا سخت مشکل تھا کمندِ ناز سے

اس حُسن و عشق کے پرستار کو عشق کی راہ میں اتنی ٹھوکریں کھانی پڑیں کہ وہ خود یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:

'میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار'

اور اس کے اندر یہ احساسِ شکست پیدا ہو گیا۔ ع

"میں نے خود اپنے کئے کی یہ سزا پائی ہے"

لہٰذا اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک حسین بازوئے سیمیں کا سہارا ڈھونڈنے والے شاعر کی مایوسیوں، ناکامیوں اور حسرتوں کے ردِّ عمل کا دل مظاہرہ ہوا جس کے سلسلہ میں ابوالخیر کشفی صاحب نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مجاز سڑک پر ان کے ساتھ چہل قدمی کرتے چلے جا رہے تھے اور شراب کی کمی کو مونگ پھلیاں کھا کر پورا کر رہے تھے۔ اتفاق سے دو لڑکیاں تانگے پر ادھر سے گذریں۔ غالباً دونوں بہنیں تھیں۔ مجاز کو دیکھ کر چھوٹی بہن نے کہا: "دیکھو بجیا! یہ مجاز ہیں۔" مجاز پر ان الفاظ سے دورہ سا پڑنے لگا اور وہ چیخ چیخ کر کہنے لگے:۔

سُنتے ہو کیا کہہ گئی۔ "بجیا یہ ہے مجاز۔" اور ان لڑکیوں کا کام ہی کیا ہے۔ یہ تو ہماری زندگیوں میں اسی طرح ہنستی ہوئی آتی اور ہنستی ہوئی چلی جاتی ہیں اور ہم سے سب کچھ چھین لیتی ہیں۔ ادیب اور شاعر کی شخصیت اور اس کی آوارہ مزاجی سے محبت بھی کرتی ہیں لیکن خارزارِ زندگی میں ساتھ نہیں دیتیں۔ کسی آئی۔ سی۔ ایس۔ سے شادی کرنے کے خواب دیکھتی رہتی ہیں اور

شملہ۔ مسوری یا نینی تال کی کوئی شام انھیں کسی موٹے اور بھدّے سے آئی۔ سی۔ ایس۔ سے وابستہ کر دیتی ہے اور ہماری زندگیوں کی تمام روشنیاں بجھ جاتی ہیں۔ میری طرف اشارہ کیوں کیا؟ کیوں کہا کہ یہ مجاز ہے۔ ایسا کرنے کا اُسے کیا حق تھا؟ یہ سب سالیاں اپنے آپ کو "اعتراف" کی "بنتِ مہتاب" سمجھنا چاہتی ہیں۔ اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتی ہیں۔"

یہ اس کی نامرادیوں اور محرومیوں سے پیدا شدہ کرب کا لاوا تھا۔ یہ کچلی ہوئی آرزوؤں اور خواہشات کا آتش فشاں تھا جس کی راکھ میں اس کی زندگی کی ساری رونق دفن ہو گئی۔ اس کے ساز کے سارے تار بکھر گئے اور اب اس کی زندگی میں صرف ایک ہی سے باقی تھی اور وہ تھی شراب جس کو سہارا بنانے کے لئے وہ نفسیاتی طور پر مجبور تھا۔ یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ یہ اس کے لئے موت کا پیغام ہے وہ دو چار گھونٹ اور چڑھا لیتا اور یہ کہہ دیتا سے

اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

شراب نوشی سے پیدا ہونے والی بہت سی خامیوں کے باوجود مجاز کے کردار میں کچھ ایسی خوبیاں بھی تھیں جن پر شراب کی تیزی کبھی اثر انداز نہ ہو سکی۔ مجاز بے حد خوددار اور انسانیت دوست اور انسانیت پسند تھے۔ کبھی کسی کی برائی یا غیبت کرنا تو دور کی بات ہے۔ کسی کی برائی سننا بھی پسند نہ کرتے۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ تنگ دستی کے باوجود کبھی رفیقوں کے آگے کبھی ہاتھ نہ پھیلایا۔ بلکہ سربلندی و سرشاری کا اظہار کرتے رہے۔ دل بھی بہت نازک پایا تھا۔ بقول سردار کے "اُن کے اعصاب شیشے کی طرح نازک تھے جو ذرا سی ٹھیس سے جھنجھنے لگتے۔" سادگی۔ سچائی۔ محبت۔ مروّت اُن کی عین فطرت تھی جس کی تعریف ان کے ہر دوست اور ملنے والے نے کی ہے۔

جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اُن کے ذہن میں انسانیت کا تصوّر بہت واضح اور بلند تر تھا اور اس نظام کے منفی اثرات اور سخت رویّے سے انھیں سخت نفرت تھی۔ وہ انسانیت کا خون ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔

آدمی منت کش اربابِ عرفاں ہی رہا ‏ درد انسانی مگر محروم درماں ہی رہا
اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی ‏ آدمیت ظلم کی چکّی میں پستی ہی رہی

مجاز کے احساس کی نزاکت اور خودداری کا یہ حال تھا کہ ان کو کسی کی ذرا بھی

نکتہ چینی ناگوار گزرتی۔ گوکہ انھوں نے اس کا شکوہ کھل کر کبھی نہیں کیا۔ جب لوگوں نے ان کی شراب نوشی کی عادت اور اس کی کثرت پر نکتہ چینی کرنی شروع کی تو صرف اتنا کہہ دیا۔"

مجاز اک بادہ کش تو ہے یقیناً
جو ہم سنتے تھے وہ عالم نہیں ہے

اور جب لوگوں نے خطابات سے نوازنا شروع کیا تو کہا ؎

آوارہ و مجنوں ہی پہ موقوف نہیں کچھ
ملنے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ

ساحر نے جو مجاز کے اچھے دوستوں میں تھے مجاز کے نروس بریک ڈاؤن پر "سویرا" میں تبصرہ کیا تھا جسے پڑھ کر مجاز کو بہت شاق گذرا۔ انھوں نے لکھا:

"مع ان تمام ملامتوں کے جو میرے حصے میں ودیعت کی جاچکی ہیں جن کا علاج نہ میرے پاس ہے نہ تمھارے پاس اور نہ کسی اور کے پاس۔ دو دفعہ دیوانگی کے مراحل طے کر چکا ہوں واقعاتی طور پر غلط ہے۔ ہاں دو بار میرا (NEVOUS BREAKDOWN) ضرور ہو چکا ہے، جسے کسی حد تک اور بہت حد تک دوستوں نے جنون سے تعبیر کیا ہے۔ یہ کہنے کی چیز نہیں تھی۔ جنوں کی تشہیر بس شعر کی حد تک ٹھیک ہے .... دوسری بات یہ کہ قدم بقدم خودکشی کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اگر یہ تمھارا اپنا فیصلہ ہے تو تمھیں لکھنے کا پورا حق ہے .... دن رات شراب پیتا ہوں اور گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ اس کا پہلا ٹکڑا تو سراسر غلط ہے میری جان! شراب ہے کسی زمانے میں زیادہ ہو گئی کسی زمانے میں کم مگر بقول کسے ؎

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

.... دوبارہ غور کرو گے تو میری کیفیات کا صحیح اندازہ کر سکو گے .... میں جانتا ہوں تیر جب کمان سے نکل چکا ہو پھر مداوا تو ممکن نہیں .... اپنے محسوسات اگر تم تک نہ پہنچاتا تو اپنے ساتھ بے ایمانی کرتا۔"[۱]

۱؎ ساحر لدھیانوی کے نام خط۔ مورخہ لکھنؤ ۳۰ جنوری ۴۸ء

مجاز کے اس خط سے اس کے احساس کی نزاکت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنے جنوں کی تشہیر کتنی گراں گذری ہے۔

مجاز کی پوری شخصیت کے تجزیہ سے یہ بات بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں خود کو چاہے جانے کا بے پناہ جذبہ۔ حُسن پرستی کا رجحان اور سہل پسندی کی عادت۔ خود مختاری و خود اعتمادی کی کمی اور ہر ہر قدم پر نظامِ خواہشات کا کچلا جانا جس میں عشق کی ناکامیاں اور نامرادیاں بھی شامل ہیں، مزید براں شراب کا سہارا سب نے مل کر مجاز میں ایک مساکیت (MASOCHISM) کو جنم دے دیا اور انھوں نے اپنے کو وقت سے پہلے شکستہ کر لیا جس سے ان کو اور ان کے اندر کے شاعر دونوں کو نقصان پہنچا۔ لیکن یہ نقصان ان کی اپنی ذات تک محدود تھا۔ جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے، مجاز میں جس قدر اعلیٰ قدریں یکجا تھیں شاید ہی اس نسل کے نوجوان شاعر میں ملیں۔ بقول عبدالحق صاحب:

> "مجاز بہت خوددار تھا۔ خوددار آدمی کی موت بہت بڑا حادثہ ہوتی ہے۔ واقعی وہ اچھا شاعر تھا۔ اچھا آدمی تھا۔ تبھی تو اچھا شاعر تھا۔" [۱]

---

[۱] مجاز ایک آہنگ۔ صفحہ ۸۹ ، ۹۰۔

مجاز

ایک بذلہ سنج

"کسی ملک کے متمدن ہونے کی اعلیٰ کسوٹی یہ ہے کہ
آیا وہاں طربیہ اور ظرافت پھلتے پھولتے ہیں کہ نہیں....
اور سچے طربیہ کی پرکھ یہ ہے کہ وہ ہنسائے اور ہنسی
کے ساتھ زندگی کو بھی بیدار کرے۔"

"مجرمِ شوخیِ گفتار ہوں میں"
مجاز

مجاز ایک بذلہ سنج

"زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔"

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس کو نطق کے ساتھ جو ایک وصف خصوصی ظرافت کا ودیعت ہوا ہے وہ اسے تمام مخلوقاتِ عالم میں نمایاں کرتا ہے۔ خود ہنس سکتا ہے۔ دوسروں کو بھی ہنسا سکتا ہے۔ میریڈیتھ کا قول ہے۔

"کسی ملک کے متمدن ہونے کی اعلیٰ کسوٹی یہ ہے کہ آیا وہاں طربیہ اور ظرافت پھلتے پھولتے ہیں کہ نہیں۔ اور سچے طربیہ کی پرکھ یہ ہے کہ وہ ہنسائے مگر ہنسی کے ساتھ زندگی کو بھی بیدار کرے اس قول کی روشنی میں مجاز کی بذلہ سنجی کا تجزیہ کیا جائے تو اس بات کا ثبوت قدم قدم پر فراہم ہوتا ہے۔"

حکومت ادیبوں کے لئے ایک علٰحدہ کالونی بنارہی ہے۔ مجاز نے پوچھا "ڈسٹرکٹ جیل میں یا سنٹرل جیل میں؟"

جب معاشرہ بھوکا ہو تو طنز و مزاح کو فروغ ملتا ہے۔ تخریب، تشریت اور برہمی کے عناصر اُبھرتے ہیں[1] مجاز کا زمانہ کچھ ایسے ہی انتشار اور افراتفری کا تھا۔ زندگی، سیاست ادب کے مختلف اور متضاد نظریئے جنم لے رہے تھے اور ان کے باہمی ٹکراؤ نے ادیبوں اور شاعروں کو شدت سے متاثر کیا تھا اور اس کے اظہار نے طنز کی صورت اختیار کرلی تھی۔

آج کے انسان کے ہنسی کا المیہ یہ ہے کہ اس کی ہنسی کبھی آنسو بن کر آنکھ سے ٹپک پڑتی ہے اور کبھی آہ بن کر فضا میں تحلیل ہوجاتی ہے۔[2]

یہ قول مجاز کے اوپر صادق آتا ہے۔ شدید زبان بندی کا دور تھا۔ جو بات ببانگ دُہل یا بہ آواز بلند نہیں کہی جاسکتی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے طنزیہ جملوں اور اشاروں میں بخیر و خوبی کہی جاسکتی تھی جس کے لئے ذومعنی الفاظ کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ مجاز کی ظرافت اور بذلہ سنجی کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ انھوں نے کبھی کسی کو نشانۂ ملامت نہیں بنایا بلکہ اس انداز سے جملے سر کرتے کہ سُننے والے کی سماعت پر ذرا بھی گراں نہ گذرتے اور سامعین پورا پورا لطف اُٹھاتے۔

---

[1] شاعر خصوصی نمبر ۷۷۔ ۷۔ ۶۔ ۵ قمر رئیس۔ عصر حاضر میں اردو طنز و مزاح۔

[2]

ایک بار کسی ادیب نے کہا :

مجازؔ صاحب ! آپ نے تو شعروں سے زیادہ لطیفے کہنے شروع کر دیئے ہیں ۔

مجازؔ : تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ۔

وہ صاحب بولے ۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مشاعروں میں لوگ آپ سے فرمائشیں کیا کریں گے کہ آپ اپنے لطیفے سنائیے ۔

مجازؔ : "اور میں اُن سے کہوں گا کہ حضرت شاعری بھی فنون لطیفہ میں سے ہے"۔

ایک نہایت مشہور زبان داں اور پختہ مشق شاعر جو اپنی پیرانہ سالی کے باوجود مشاعروں میں انتہائی شوخی و طراری سے اپنا کلام پڑھتے تھے۔ ان کو اپنی زبان دانی پر ناز تھا۔ ایک بار کسی مشاعرے میں اپنی غزل سنا رہے تھے کہ نحیف و نزار جسم کی بار بار جنبش سے ان کے مصنوعی دانت ڈائس پر گر پڑے ۔

مجازؔ نے یہ منظر دیکھ کر بلند آواز سے کہا ۔

"سنئے حضرات ! قبلہ شاعر صاحب خالص زبان کا شعر ارشاد فرما رہے ہیں ۔

خوش مذاقی اور بذلہ سنجی کے لئے لازمی ہے کہ بات بحد مختصر پیرائے میں کہی جائے تاکہ سننے والے اس سے پہلے کہ اس کی توجیہ کر سکیں اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو جائیں۔ پھر اگر اس میں عصری اجتماعی زندگی کی جھلک ہو تو جملے یا فقرے عرصۂ دراز تک کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔

ایک بار نیاز حیدر نے پوچھا ۔

مجازؔ صاحب ! ہندوستان اور پاکستان کے بٹوارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

مجازؔ بولے ۔ خیال بٹ جاتا ہے ۔

۱۹۴۷ء میں جب پہلی بار آزادی کا جھنڈا لہرایا گیا تو اس پر اشوک چکر بنا دیکھ کر کسی نے مجازؔ سے پوچھا ۔ حضرت ! یہ جھنڈے پر پہیا کیسا بنا ہے ؟

مجازؔ نے برجستہ جواب دیا ۔ "بھئی یہ فری انڈیا کا فری وہیل ہے"۔

ہنسنا ہنسانا موقع محل اور انسان کے موڈ پر منحصر ہوتا ہے۔ موڈ کے لئے خوش گوار اور عمدہ بات کا ہونا ہی لازمی نہیں ہے بلکہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع میں بھی اکثر طنز و مزاح کے چٹخارے پیدا کئے جا سکتے ہیں اور مجازؔ میں احساسِ ظرافت بہت بلند تھا۔ صرف ایک دو جملوں سے

پوری محفل کا رنگ بدل دیتے۔ خشک سے خشک مباحثوں کو ذاتی مخاصمتوں اور آپسی بدمزگیوں سے اکثر بچا لیتے۔

کوریا میں جنگ کے زمانے میں پارٹی لائن کے مطابق ترقی پسند ادیبوں نے کوریا پر افسانے۔ نظمیں اور مرثیے لکھنے شروع کر دیئے۔

ایک صاحب نے مجاز سے کہا۔ "جناب کوریا پر بھی کچھ لکھئے۔"

"کوریا پر؟" مجاز نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"کاش! ایسا ہو سکتا۔" مجاز نے منہ لٹکا کر کہا۔

"کیوں؟"

مجاز نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولے۔

ہائے افسوس! "آج ہی گھر میں کوریا نہ ہوا!"

مجاز لاہور گئے۔ وہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے ان کی بڑی تواضع کی اور انہیں لاہور کی خوب سیر کرائی۔

رخصت کرتے وقت فیض صاحب نے ان سے پوچھا۔ "کہئے مجاز صاحب! آپ کو لاہور پسند آیا؟"

مجاز نے کہا۔ "ہاں شہر تو بہت اچھا ہے لیکن یہاں پنجابی بہت ہیں۔"

اس وقت کے تیزی سے بدلتے ہوئے ملک کے سیاسی، سماجی حالات اور ساتھ ہی طبقاتی مفادات اور نظریات میں تصادم کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی انسانی قدروں، رویّوں اور رشتوں نے تمام زندگی و ادب میں ایک انقلابی رجحان پیدا کر دیا۔ جس میں انسانیت کا دم ڈوبتا، ابھرتا اور کبھی گھٹتا نظر آنے لگا۔ تو مجاز نے ان مضحک عناصر کو چھوٹے چھوٹے جملوں سے ابھارا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد پر ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ دوسرے شاعروں کے ساتھ جب مجاز مشاعرہ گاہ میں داخل ہوئے تو وہاں دروازے پر لکھا ہوا تھا۔ "مذہب کے نام پر لڑنا حماقت ہے۔" مجاز نے ایک لمحہ اس عبارت پر نظر ڈالنے کے بعد کہا۔ "اور حماقت کے نام پر لڑنا مذہب ہے۔"

کسی نے مجاز سے پوچھا۔ "ان پہاڑوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" مجاز نے کہا۔ "ان پہاڑوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کے پیچھے کیا ہے کچھ نہیں دکھائی دیتا۔"

ایک روز ریڈیو اسٹیشن پر کچھ طوائفوں کے گانے کا پروگرام چل رہا تھا اور مجاز حسب معمول

وقت سے پہلے ریڈیو اسٹیشن سے نکل رہے تھے کہ پطرس بخاری اپنی کار سے آئے اور کار روک کر مجاز سے پوچھا" ریڈیو اسٹیشن کا کیا حال ہے ؟ مجاز بولے " طوائف الملوکی چل رہی ہے"۔ اور چل دیئے۔

ایک ادبی جلسے میں میراجی اپنی نظم پڑھ رہے تھے۔ دو صفحے پڑھ گئے۔ لیجئے تیسرا صفحہ بھی ختم ہوگیا اور چوتھا بھی۔ میراجی نے اپنی زرد آنکھیں کھول کر سنجیدگی سے فرمایا۔ یہ نظم کا مصرعہ تھا۔ مجاز نے فوراً مشورہ دیا۔

" تو اسے کسی مشاعرے کی طرح کے لئے کیوں نہ دے دیجئے۔"

عصمت چغتائی جب بمبئی سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہونے لگیں تو شاہد لطیف ان کے شوہر نے کہا" عصمت! تم لکھنؤ سے میرے لئے دو چیزیں لانا مت بھولنا۔ ایک تو کرتے اور دوسرے مجاز۔

عصمت لکھنؤ پہنچ کر مجاز سے ملیں اور شاہد لطیف کی فرمایش دُہرادی۔ مجاز نے کہا! اچھا! " گریبان اور گریباں چاک دونوں منگوائے ہیں"۔

سرور صاحب لکھنؤ یونیورسٹی سے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ جانے والے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایوانِ ادب کی طرف سے ان کو ایک عشائیہ دیا جانے والا تھا۔ لیکن کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے سرور صاحب اس کی تاریخ بڑھواتے چلے آرہے تھے۔ اسی درمیان میں علامہ کیفی کا انتقال ہوگیا۔ مجاز صاحب نے اتفاق سے اسی دن عشائیہ کے بارے میں پوچھا۔ جمال پاشا نے کہا" کیا بتاؤں ، سرور صاحب کو کوئی تاریخ ہی راس نہیں آرہی ہے۔ بتایئے۔ کیا کیا جائے"۔ مجاز برجستہ بولے" اگر سرور صاحب راضی نہیں ہوتے تو اسی پیسے سے علامہ کیفی کا چالیسواں کرادو"۔

مجاز کے گہرے دوست سلام مچھلی شہری کے بارے میں مختلف احباب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔

اپل سنگھ بولے: " سلام کا کہنا وہ تو انتہائی بور آدمی ہے!"

" بور، مجاز چونک اٹھے " نہ سلام بور ہے، نہ ڈبل بور، نہ بارہ بور۔ بلکہ وہ تو آغا خاں کی طرح بوروں کا خدا ہے۔"

نمائش میں مجاز اپنے گہرے دوست سلام مچھلی شہری کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ منتظمین کی طرف سے لاؤڈ اسپیکر پر نمایش میں کھوئے ہوئے بچوں کی شناخت کے اعلانات ہورہے تھے۔ مجاز سلام صاحب کو ایک جگہ ٹھا کر نمائش کے دفتر پہونچے اور تھوڑی دیر بعد لاؤڈ اسپیکر سے یہ اعلان

ہو رہا تھا۔ ایک بچہ جس کا نام سلام ہے اور صورت سے پھلی شہری معلوم ہوتا ہے جن صاحب کو ملے دفتر میں پہونچا دیں"۔

ایک انڈو پاک مشاعرے میں ایک حسینہ مشاہیر شعراء سے آٹو گراف لے رہی تھی۔ اس مشاعرے میں جوشؔ، جگرؔ، فراقؔ، حفیظؔ، ساغرؔ اور مجازؔ کے ساتھ نریش کمار شادؔ وغیرہ بھی تھے۔ مجاز کے پاس جب آٹو گراف بک پہنچی تو لکھنے سے قبل انھوں نے ورق گردانی کی۔ جوش اور شاد کا آٹو گراف دیکھنے کے بعد وہ مسکرائے اور انھوں نے آٹو گراف پر لکھا۔ "آٹو گراف ایک ایسا اصطبل ہے جس میں گھوڑے اور گدھے ایک ساتھ باندھے جاتے ہیں"۔

نشے کے عالم میں مجاز اور سلام میں شعر و شاعری پر بات ہوتی تو دونوں ایک دوسرے پر اپنی عظمت کا سکہ جمانے کے لئے ثابت کرتے کہ "میں تم سے بڑا شاعر ہوں"۔ ایسے ہی موقعہ پر ایک بار سلام نے ان سے انگریزی میں کہا:

"MAJAZ IS DEAD BUT SALAM IS STILL LIVING & KICKING."

مجاز صاحب نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا:
مجاز تو مر گیا ہے لیکن سلام اب تک زندہ ہے اور دولتیاں جھاڑے چلا جا رہا ہے۔

مجاز کے ایک بے تکلف دوست سردار اچل سنگھ جب پنجاب سے نئے نئے لکھنؤ آئے تو ٹھیٹھ پنجابی تھے۔ ادبی ذوق رکھتے تھے اور کافی ہاؤس میں مجاز کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ان کو لکھنؤ کی ہوا لگی کہ انھوں نے اپنے کو صفا چٹ کروا دیا اور بالکل سپاٹ ہو کر کافی ہاؤس میں پہونچے۔ مجاز ان کا حلیہ دیکھ کر برجستہ بولے۔ "یا خدا یہ پہلا سردار ہے جسے تو نے فارغ البالی عطا کی ہے"۔

ایک محفل میں مجاز، جذبی اور جعفری وغیرہ جمع تھے۔ گپیں ہو رہی تھیں۔ باتوں باتوں میں مجاز نے جذبی سے پوچھا کہ "امیں تم کب پیدا ہوئے تھے"؟ جذبی بولے۔ "میری ماں سوتیلی ہیں۔"
مجاز نے کہا۔ "اچھا اچھا۔ ارے ہاں جب ماں سوتیلی ہیں تو پھر پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔"

شوکت تھانوی صاحب نے "وہی دہانوی" کے نام سے ایک ناول لکھی۔ مجاز کو معلوم ہوا تو انھوں نے شوکت صاحب سے کہا کہ آیندہ ناول کا نام "فلاں فلانوی" کیسا رہے گا۔

مجاز صاحب بمبئی گئے تو سردار جعفری سے ملنے ان کے گھر گئے۔ وہ اتفاق سے گھر پر موجود نہیں تھے۔ ان کا بھتیجا نوکر گھر سے نکلا اور بتایا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ مجاز نے پوچھا کہ "عموماً صاحب کتنے بجے آتے ہیں؟" نوکر سمجھا کہ عموماً کسی صاحب کا نام ہے۔ بولا۔ "عموماً صاحب یہاں نہیں آتا۔" مجاز نے یہ سن کر اطمینان سے گردن ہلائی اور بولے۔ "تو پھر خصوصاً صاحب بھی نہ آتا ہوگا۔"

مجاز اپنے ایک نہایت بے تکلف دوست اور بہت بڑے شاعر کے یہاں مہمان ہوئے۔ ان کے شاعر دوست نے ایک بہت کم سن بچی سے انھیں ملاتے ہوئے بتایا کہ مجاز صاحب! یہ میری بھانجی ہے۔ بہت شریر ہے۔ کل دوپہر کو میں سو رہا تھا۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہ میرے سرہانے کھڑی میری پیشانی کو سہلاتی جاتی ہے اور کہتی جاتی ہے۔ "پاجی۔ پاجی۔ پاجی۔" مجاز نے بچی کے معصوم چہرے پر اپنی مسکراتی ہوئی نظر ڈال کر کہا:

"کافی مردم شناس بچی معلوم ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ "پیسہ اور پرچھائیں" دیکھ کر مجاز بولے: چھپائی تو خوب ہے مگر کاغذ ایسا ہے کہ ایک طرف کی روشنائی دوسری طرف پھوٹ آئی ہے۔ ایک طرف سے پیسہ معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف سے پرچھائیں۔

ایک بار مجاز نے کہا۔ "ہزار صاحب! آپ نے تخلص میں اس قدر بخل سے کیوں کام لیا؟" "کیا مطلب آپ کا؟" ہزار صاحب نے وضاحت چاہی۔ مجاز بولے:

"ارے صاحب! لاکھ نہ دو لاکھ بس صرف ہزار؟"

کسی مشاعرے میں مجاز اپنی غزل پڑھ رہے تھے۔ دفعتاً سامعین میں سے ایک خاتون کی گود میں اس کا شیر خوار بچہ زور سے چلانے چلا۔ مجاز نے اپنی غزل ناتمام چھوڑتے ہوئے پوچھا:

ع۔ "نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا"

مجاز کی شاعری کا ارتقاء

مجاز اور ادبی تحریکیں :

۱- رومانی تحریک

۲- ترقی پسند تحریک

۳- مجاز کا ذہنی و فکری ارتقاء

"ادب (جو) انسانیت کے حصول کا، ذہنی
و سماجی زندگی کی نشوونما کا، شعور کے ارتقاء
کا اور خود ارتقاء کا ایک وسیلہ ہے۔"

ملک راج آنند

مجاز کی شاعری کا ارتقا

ادب کوئی جامد شے نہیں ہے بلکہ اضافی اور ارتقائی ہے۔ انسانی فکر و ذہن کے ساتھ زمانے کی دھڑکنیں شامل ہو کر شعر و ادب کی نشو و نما کرتی رہی ہیں۔ اس پر کسی بھی نظریوں کا اطلاق کیا جاتا رہا ہو۔ خواہ وہ افلاطون کا نظریہ عینیت و ظلال ہو جس میں اخلاقی پہلو پر زور دیا گیا ہو۔ لہٰذا فنون لطیفہ کا تعلق محسوسات کی دنیا میں پائی جانے والی اشیاء اور اس کی پرچھائیوں کو قرار دیا گیا۔ یا مجموعی طور پر افلاطون نے شاعری کو قابل اعتنا نہ سمجھا اور اپنی ریاست میں اسی بنا پر اسے شامل نہ کیا کہ وہ مخرب اخلاق ہے۔ یا ارسطو نے اس کے برخلاف شعر و ادب میں اعمال کی نمایندگی یا نقل اور آہنگ پر زور دیا اور اس کی اہمیت کا احساس دلایا اور اسے عین فطرت انسانی بتایا۔ ان سب کے باوجود ادب کے بنیادی اجزائے ترکیبی فکر انسانی اور زمانے کی صورت حال سے کسی صورت انحراف نہیں کیا جا سکتا ہے۔

شاعری کا وجود دو چیزوں کا مرہونِ منت ہے اور دونوں کی جڑیں فطرت کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ نقل کا جذبہ انسان میں بچپن سے ہی نمو پذیر ہوتا ہے۔ انسان اور دوسرے ذی روح میں ایک فرق یہ ہے کہ انسان میں نقل کا مادہ تمام جانداروں سے زیادہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ نقل کے ذریعہ پیش کی ہوئی چیزوں سے لطف اندوز ہونے کا مادہ بھی انسانوں میں اتنا مقبول اور جبلی ہے جتنا خود نقل کرنے کا جذبہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لہٰذا نقل کا جذبہ ہماری سرشت میں داخل ہے۔ اس کے بعد پھر سُریلی آواز اور آہنگ کے لئے ہمارے احساس کا درجہ ہے۔ شعر کی بحر بھی آہنگ میں شامل ہے کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ بحر آہنگ کا ایک منطقہ ہے۔ ان فطری رجحانات سے ابتدا کر کے ان کو درجہ بدرجہ ترقی دینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ان کے موٹے جھوٹے اور ناہموار اظہارات نے شاعری کو جنم دیا۔ [1]

ارسطو اپنے اس نظریۂ شعری کے تحت کسی منظوم تاریخ و طب کی کتاب کو شعری فن پارہ ماننے کو تیار نہیں کیونکہ اس میں حقایق اور اس کے علم کو بیان کیا جاتا ہے اور مورخ اس وجدانی کیفیت سے دوچار نہیں ہوتا جو محسوسات کے دنیا کے اصلی تصورات اور

---

[1] شعریات (بوطیقا) از ارسطو۔ مترجمہ شمس الرحمٰن فاروقی صفحہ

انسانی جذبات کے حامل ہوتے ہیں اور قاری کو وجدان و کیف کی حالت میں پہنچا سکتے ہوں. نتیجہ میں مسرت و انبساط سے دوچار کرتے ہوں. اسی لئے اس نے مورخ اور شاعر کے درمیان ایک واضح حدِ فاصل طے کردی تھی۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ تاریخ کے برخلاف شاعری میں مستقبل کا ادراک پایا جاتا ہے اور آفاقیت کا اظہار ہوتا ہے۔

" شاعری تاریخ سے بلند تر ہے اور زیادہ فلسفیانہ چیز ہے. کیونکہ شاعری ان چیزوں کے اظہار کی طرف جھکتی ہے جو آفاقی ہیں جب کہ تاریخ کو صرف مخصوص حقایق سے علاقہ ہوتا ہے۔ آفاقی سے مُراد یہ ہے کہ قانون لزوم یا قانونِ احتمال کی رو سے کسی مخصوص طرح کا شخص کسی صورت حال میں کس طرح گفتگو یا کام کرے گا چاہے وہ اپنے کرداروں کو مخصوص ناموں سے کیوں نہ پکارے لیکن شاعری اسی قسم کی آفاقیت کو حاصل کرنے کی سعی کرتی ہے"[۱]

ان سطور بالا سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے اپنے احساسات، فطری رجحانات و میلانات کے ساتھ ساتھ صورت حال کا پورا پورا اثر انسان کی گفتگو اور کردار پر پڑتا ہے اور اسی کے تحت اس کے اعمال و افکار شعری فن پاروں میں ڈھلتے ہیں اس میں اگر شاعر بعید از قیاس واقعات کو بھی اس طور پر بیان کرتا ہے کہ گویا وہ ماضی قریب میں وقوع پذیر ہو چکے ہیں. ساتھ ہی انسانی فطرت سے قریب تر ہوں تو انھیں آفاقیت ضرور نصیب ہوگی۔ ارسطو بھی شعری ادب میں حقایقِ فطرت (جو قرینِ قیاس ہوں) کی نفی نہیں کرتا بلکہ وہ مافوق الفطرت اور بعید از قیاس واقعات و اظہارات کو اس طور پر شامل کرنا چاہتا ہے کہ یہ احساس ہو کہ یہ واقع ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شعر و ادب انسانی جذبات اور مادی حالات کے آزادانہ تفاعل کا نتیجہ ہیں جن میں حقایقِ انسانی و جمالیات کا ایک متوازن امتزاج ہو نہ کہ صرف اظہار ذات یا واقعیت کے نظریوں کے تحت جو کچھ کہ وہ محسوس کئے گئے ہوں یا جیسے کہ وہ ہوں بیان کردیے جائیں یا کلاسیکیت کی جکڑبند میں شعر و ادب۔ اخلاقیات و اصلی تصورات کا ایک محبوس بن جائیں۔ اس طرح شعر و ادب ہمیشہ دو اجزا کے تحت پروان چڑھتا ہے۔ پہلے انسانی جذبہ کا شدتِ احساس دوسرے اپنے عہد کی صورتِ حال جب ان عناصر کا امتزاج آزادانہ فضا میں ہوتا ہے تو بہترین فن پارے تخلیق پاتے ہیں۔

---

[۱] شعریات (بوطیقا) از ارسطو مترجمہ شمس الرحمن فاروقی صفحہ

اس کے برعکس جب قواعد وضوابط کی پابندی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ فنکار گھٹن محسوس کرنے لگتا ہے یا اپنے کو مجبور پانے لگتا ہے تو اس حالت میں جو ادب تخلیق ہوتا ہے اُس میں جذبات کی گھٹن اور زمانے اور عہد کے شعور کی کمی کا احساس جا بجا ہونے لگتا ہے اور ادب ایک خاص بندھے ٹکے ڈھرے پر گامزن نظر آتا ہے۔ ایسی ہی ادبی فضا میں ادب کے خلاف بغاوتیں تحریکوں کی شکل میں اُبھرتی ہیں۔

رومانوی تحریک

اردو ادب میں مغربی ادب کے برخلاف ان دونوں اجزا کا امتزاج فطری طور پر روزِ اوّل سے ملتا ہے کیونکہ اس پر کلاسیکیت کے نظریوں کا کوئی ضابطہ باقاعدہ طور پر لاگو نہ تھا۔ اردو شعری ادب نے فارسی کی چھاؤں میں آنکھ ہی نہیں کھولا بلکہ پروان بھی چڑھا ہے۔ لہٰذا اس کی ساری خصوصیات شعری فارسی کی مرہونِ منت ہیں۔ رومان پسندی، خطر پسندی اور اس کے تمام لوازمات جن کا احاطہ رومانوی تحریک میں کیا گیا ہے، اردو شاعری میں کسی حد تک پہلے سے ہی پائے جاتے ہیں۔

رومانی عناصر اردو شاعری میں ابتدا ہی سے حاوی رہے ہیں۔ ان کی ترجمانی غزلوں میں خصوصیت کے ساتھ ملتی ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ یہ باقاعدہ تحریک کی شکل میں رائج نہ تھی۔ اور بقول ڈاکٹر محمد حسن "نہ یہ کلاسیکیت سے بغاوت کے طور پر "صاعقہ بردوش" آئی تھی کیونکہ اردو ادب میں کلاسیکیت کے ضابطے اور سختیاں شعوری طور پر لاگو نہ تھیں بلکہ رومانی عناصر اردو شاعری کی سرشت میں داخل ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ دورِ جدید میں انگریزی ادب سے واقفیت کی بنا پر ان رومانی عناصر کو باقاعدگی سے برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک اجمالی جائزہ لینے سے قبل یہ دیکھنا ہوگا کہ رومانیت ہے کیا؟ بقول ڈاکٹر محمد حسن صاحب:-

"رومان کا لفظ رومانس سے نکلا ہے اور رومانس زبانوں میں اس قسم کی کہانیوں پر اس کا اطلاق ہوتا تھا جو انتہائی آراستہ اور پُرشکوہ پس منظر کے ساتھ عشق و محبت کی ایسی داستانیں سناتی تھیں جو عام طور پر دورِ وسطیٰ کے جنگجو، اور خطر پسند نوجوانوں کے مہمات سے متعلق ہوتی تھیں۔ اس طرح اس لفظ سے تین خاص مفہوم وابستہ ہو گئے:-

۱۔ عشق و محبت سے متعلق تمام چیزوں کو رومانوی کہا جانے لگا۔

۲۔ غیر معمولی آراستگی شان و شکوہ۔ آرائش۔ فراوانی اور محاکاتی تفصیل پسندی

کو رومانی کہنے لگے۔

۳۔ عہد وسطیٰ سے وابستہ تمام چیزوں سے لگاؤ اور قدامت پسندی اور ماضی پرستی کو رومانیت کا لقب دیا گیا۔[1]

سطور بالا کی روشنی میں اگر اردو ادب پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو یہ تینوں خصوصیات مختلف صورتوں میں جا بجا بکھری ہوئی دکھائی دیں گی اور ایسا محسوس ہوگا کہ یہ ساری باتیں اردو شاعری کے خمیر میں پہلے سے موجود تھیں۔ خاص طور سے غزل میں تو ہر جگہ یہ خصوصیات تلاش کی جا سکتی ہیں۔ غزل کے سیکڑوں اشعار عشق و محبت سے متعلق ملیں گے اور ساتھ ہی خطر پسندی کا رُجحان مشکلات اور مصائب کو جھیلنے کا حوصلہ قدم قدم پر نظر آئے گا۔ ؎

ہم بھی چلتے ہیں اک حشم لے کر — دستۂ داغ و فوجِ غم لے کر
دست کش نالہ پیش رُو گریہ — آہ چلتی ہے یاں عَلَم لے کر (میر)

کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد — روح پتھر سے سر پٹکتی ہے (آبرو)

فکرِ معاش، عشقِ بتاں یادِ رفتگاں — اِس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے
(سودا)

ہاتھ دامن میں ترے مارتے جھنجلا کے ہم — اپنے جامے میں اگر آج گریباں ہوتا
(میر)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے (درد)

لگتی ہے اب تو قلقلِ مینا سے دل کو ٹھیس — وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا
(کلیم)

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
خود اُٹھا لاتے ہیں جو تیر خطا ہوتا ہے (غالب)

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو۔ کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں (غالب)

عشّاق میں خطر پسندی کا رجحان خاص طور سے اردو غزل کا خاصّہ اور مزاج رہا ہے۔ عاشق ہر ہر قدم پر سینہ سپر دکھائی دیتا ہے۔ مہمات کو سر کرنے اور امتحانات سے گذرنے کا

---

[1] اردو ادب میں رومانوی تحریک از ڈاکٹر محمد حسن صفحہ ۱۱

شیدائی نظر آتا ہے۔ جفا پسندی و مہم پسندی میں اسے ایک لطف ملنے لگتا ہے۔ شعرا اردو نے اپنی خستہ حالی کے باوجود خطر پسندی کو اپنی زندگی اور شاعری دونوں کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ مظالم کو دعوت دینے اور اس سے گذرنے میں اپنی قوت برداشت اور مردانگی کو آزمایش میں ڈال کر ان خصوصیات کو اُجاگر کرنا فخر سمجھتے تھے۔

دیا قاتل نے پہلی ہی نظر میں جان کو دہلا
الٰہی شرم رکھ لیجو ابھی یہ وار ہے پہلا (نظیر)
کیا عشق کی بازی بگڑی ہے تن ہار چکے من ہار چکے
یہ داؤں ہمارا آخر ہے ہم جان لگائے بیٹھے ہیں (میر)
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا (غالب)
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا (میر)

یہی طرز رسمی یا شعوری طور پر قصیدہ، مثنوی وغیرہ میں بھی جا بجا کارفرما نظر آتا ہے۔ اس لئے اس بات کی یکسر نفی نہیں کی جاسکتی کہ اردو کے عشق و محبت کی داستانوں میں رومانی خصوصیات یا اس کے عناصر کا فقدان تھا۔ فرق اتنا ہے کہ ان کی بُنیاد دَور وسطیٰ کے خطر پسند اور جنگ جو نوجوانوں کی مہمات پر نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے ماضی کی شان و شوکت اور آراستگی تھی جو اُسے فارسی سے ورثہ میں ملی تھی اور جنھیں شعرائے اردو نے ایک قیمتی میراث خیال کر کے صرف اصنافِ سخن کی حد تک اس کا اظہار کیا ہے کیونکہ اُن کے دور میں ان کو اپنی عملی زندگی میں شجاعت اور دلیری کے وہ مواقع حاصل نہ تھے۔

جہاں تک غیر معمولی آراستگی، شان و شکوہ، آرایش فراوانی اور محاکاتی تفصیل پسندی کا سوال ہے۔ یہ باقاعدہ طور پر اُردو میں سوائے نظیر اکبر آبادی کے کہیں بھی نظر نہیں آتی، لیکن قصیدہ، مثنوی اور مرثیوں میں بعد کو اکثر و بیشتر یہ اجزا مل جاتے ہیں جن میں سودا، میر حسن اور میر انیس نے ان اجزا کو اپنی اصناف سخن میں برتا ہے اور باقی جگہ ان کی حیثیت ضمنی سی ہے۔

قدامت پرستی اور ماضی پرستی سے ہماری اردو شاعری ایک لمبے عرصے تک وابستہ رہی ہے اور اس کا اظہار کرتی رہی۔ اردو شعرا ماضی پرستی و قدامت پرستی کو ہمیشہ مایۂ ناز

سمجھتے رہے۔ تبدیل ہوتے ہوئے حالات اور زندگی کے بدلتے ہوئے رویوں کے باوجود عہدِ ماضی کو عہدِ زریں سمجھ کر سینے سے لگائے رہے اور اسی کے گیت گاتے رہے اور خوش ہوتے رہے۔ نتیجہ میں وہ اپنے دور کی اقدار اور رجحانات سے ہم آہنگ نہ ہو سکے اور تغیر کی اصل روح کو نہ پا سکے۔ ان کا ذہنی اور روحانی ربط ہمیشہ ماضی اور اس کی اقدار سے وابستہ رہا۔ ظاہر ہے ان حالات میں وہ اپنے میں وہ قوت اور سکت نہ پاتے تھے کہ حال سے آنکھیں چار کر سکیں اور مستقبل کو خوش آیند شکل میں دیکھ سکیں۔

اردو میں رومانوی تحریک کا آغاز اور اس کی ابتدا تلاش کرتے ہوئے ذہن میں یہ بات واضح رہنا چاہیے کہ یورپ کی تحریک سے براہِ راست اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن :-

"اگر ہم رومانیت کو محض ایک مخصوص ضابطہ سمجھنے کے بجائے ایک زاویہ نظر سمجھتے ہیں تو ہمارے سامنے غور و فکر کے نئے راستے کھلتے ہیں"[1]

اس زاویۂ نظر کو سامنے رکھ کر جب ہم اپنے اردو شعر و ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں جذبات کی فراوانی تھی اور شاعری اسی کے آئینے میں کائنات کی حقیقتوں کی ترجمانی کرتی تھی۔ عقل اور عشق کی پیکار شروع سے ہی ناصح مشفق کی چھیڑ چھاڑ اور نصائح میں نظر آتی ہے۔ عقل کا ایمان منطق اور استدلال ہے۔ عشق صرف جذبات اور کیفیات کا تابع ہوتا ہے اور اسی کے توسط سے دنیا میں ہر شے کی توجیہہ کرتا ہے اور اسے سمجھنا چاہتا ہے۔ خواب و خیال کی دنیا اسے حیاتِ جاوداں نظر آتی ہے۔ اس کے برخلاف عقل نظم و ضبط کے بغیر ایک قدم چلنے کو تیار نہیں۔ آئین و اصول کو زندگی کا مرکز اور محور مانتی ہے اور اسی کے گرد طواف کرتی ہوئی منزلِ مقصود کو پانا چاہتی ہے اور جذبات کو عقل کے راستے گوارا نہیں۔ آئین و اصول کی ہر طرح کی پابندیاں اسے گراں گذرتی ہیں۔ جذبات ان تمام قید و بند سے آزاد رہ کر اپنی دنیا الگ بسانا چاہتے ہیں اور ان پابندیوں سے ہمیشہ بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔ اور رومانوی ادب اسی نظریہ کے تحت تخلیق ہوتا رہا۔

---

[1] اردو ادب میں رومانی تحریک از ڈاکٹر محمد حسن صفحہ

رومانوی ادب کے نزدیک عقل محض چیزوں کی ظاہری شکل وصورت اور ترتیب سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ ہمیں اس میں ماورائی حقیقت کے پرتو نہیں دکھائی دیتے جو ان کے اندر ایک نئی تابناکی پیدا کرتی ہیں۔ اُس کے نزدیک عقل چراغِ راہ سے زیادہ نہیں اور جذبات اور وجدان ہی وہ آگ پیدا کرتے ہیں جو کائنات کو نئے اُجالوں سے روشناس کرتی ہے۔ عقل کی رسائی حقیقت کے محض ایک جزو تک ہوتی ہے اور اس لحاظ سے وہ اس کے اصول وضوابط بناتی ہے۔ حسن کو قاعدوں اور زاویوں میں اسیر کرتی ہے اور اصل روح کو فراموش کر دیتی ہے[1]

اس رومانوی تحریک کے شعور کے ساتھ سب سے پہلے اردو شاعری کو نئے خیالات اور موضوعات دینے والے آزاد اور حالی ہیں۔ حالانکہ ان کی زیادہ توجہ مقصد و اخلاقیات پر تھی۔ ساتھ ساتھ دوسری بندشوں کے باوجود سادگی اور جذبات سے مملو شاعری کو ترجیح دی۔ اپنے نظریات کی وضاحت حالی نے مقدمہ لکھ کر کی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن۔ اس ضابطہ بندی کے خلاف حالی کا مقدمہ شعر و شاعری پہلا پُرزور احتجاج ہے لیکن کیا ہم حالی کی آواز کو رومانوی بغاوت کی آواز کہہ سکتے ہیں۔؟

حالی کے سامنے شاعری کا اصل مقصد سوسائٹی کا رفارم اور اس کے افادی پہلو تھے۔ وہ انفرادی آرزومندی اور جذباتِ انسانی کو ترجیح ضرور دیتے تھے لیکن ان میں رومانوی جذباتیت یا کلاسیکیت سے بغاوت کا جذبہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ میانہ روی اور سنجیدہ عقیدت اور حسن و عشق کی عنان اخلاق و مذہب کے ہاتھ میں دئے رہنے کے قائل ہیں۔ تحریک کے زیرِ اثر تبدیل ہوتے ہوئے حالات جذبات کو عقل و مذہب سے آزادی دلانے کے درپے تھے۔ انھیں ضابطوں اور شکنجوں میں رکھنا ممکن نہ تھا۔ مغربی ادب نے اردو ادب کے سامنے نئی راہیں کھول دی تھیں۔ حیات کے نئے نظریئے اور فلسفے بن رہے تھے۔ پرانے اور فرسودہ رواج اور رسوم خود بخود اپنی جھوٹی آب و تاب کھوتے جا رہے تھے۔ مذہب اور اخلاق کی پابندیوں اور وعظ و نصائح کا دَور ختم ہو رہا تھا اور نیا دَور اب فطرت انسان کے قید و بند کی ساری زنجیروں کو توڑنے پر مجبور کر رہا تھا اور وہ تمام فطری محسوسات جن پر مذہب اور اخلاق، فرسودہ رسوم و روایات کا خوف و ہراس طاری تھا۔ اب اُن کا آزادانہ اظہار

---

[1] زندگی اور ادب۔ از ڈاکٹر ظلِ حسنین صفحہ ۱۰۷۔۱۰۸

وقت کے تقاضے اور ضرورت کے تحت کیا جارہا تھا۔ اردو شاعری کو اسی آزاد نگاہی کی ضرورت تھی۔ وہ اس طرح اس ڈگر پر خود بخود چل پڑی۔

آزاد پر تو مقصدیت اس حد تک غالب تھی کہ وہ شعروادب کو حاکموں کا آلۂ کار بنانا چاہتے تھے۔[۱] جہاں حالی فرسودہ خیالی کو ترک کر کے جدت اور تنوع چاہتے تھے اور جذباتِ انسانی کی قدر کرتے تھے اور اس میں جو ایک طرح کا حظ وانبساط ہوتا ہے اس کے بھی قائل تھے لیکن اخلاقیات کو کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

"شعر سے جس طرح نفسیاتی جذبات کو اشتعال ہوتی ہے اسی طرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں اور انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں کو اس کے اخلاق کے ساتھ ایسا صریح تعلق ہے جس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ شعر اگرچہ براہِ راست علم اخلاق کی تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن ازروئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔"[۲]

جہاں تک آزاد اور حالی کی رسائی تھی اُس کا اثر یہ ہوا کہ اخلاقی اقدار اور ضوابط کی جکڑبندیاں ختم ہونے لگیں لیکن سماجی مقصد کو عین مقصد شعروادب سمجھا جانے لگا۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن "اب شاعر دہلی کے کوچوں کا آوارہ گرد نہیں تھا بلکہ طورِ معنی پر ید بیضا رکھنے والا کلیم تھا۔"[۳]

آگے چل کر اقبال کا لہجہ صاف رومانوی ہے۔ حالانکہ ان کو مذہب سے ایک خاص شغف اور لگاؤ تھا لیکن وہ اس کی تعبیر میں بہت آزاد خیالی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اُن کے یہاں وجدان اور جذبات کی بے حد فراوانی ہے۔ وہ عقل وعشق کے تصادم بڑے رومانی انداز میں بیان کرتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یا

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے

---

[۱] آبِ حیات صفحہ ۸۱ و صفحہ ۱۰۳　　[۲] مقدمہ شعروشاعری از حالی صفحہ ۱۸

[۳] اردو ادب میں رومانوی تحریک از ڈاکٹر محمد حسن صفحہ ۳۲

ایک مقام پر تو یہ شرط بھی نہیں رہ جاتی :

عقل تمام بولہب عشق تمام مصطفےٰ

اقبال کے یہاں بیچارگی اور مجبوری نام کی کوئی چیز نہیں ہے، کیونکہ یہ عقل کی دی ہوئی پس و پیش کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ تو انسان کو ہر حال میں آزاد اور بلند تر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے دورئ جنت پر آنسو نہیں بہاتا بلکہ اسی دُنیا کو جنت بنانا چاہتا ہے ؎

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت پہ روتی چشمِ آدم کب تلک

یہیں تک بس نہیں کرتا بلکہ اس کی پوری پوری تعمیر کے لئے اپنے خُدا سے انتظار کرنے کا مشورہ بھی دیتا ہے ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

اقبال کا قلندر رومانیت کا ہیرو معلوم ہوتا ہے۔ وہ وجدان و کیف کے سوا کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتا اور اقبال کی بیشتر شاعری میں اس طرح کی رومانی تصویریں بڑے دلکش اور حسین پیرائے میں بکھری پڑی ہیں۔

اقبال میں خطر پسندی اور بے باکی سے فطری لگاؤ دکھائی دیتا ہے وہ بھی ان کو رومانی شعرا کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ان کا "شاہین" ان کا "مردِ مومن" یہ سب علامتی طور پر اسی دور وسطیٰ کے خطر پسند جنگ جو نوجوانوں کا تصور ہے انھیں کی شان و شکوہ اور آراستگی ہے۔ ان میں شاہین کا کبوتر پر جھپٹنا اس کی جبلّی فطرت ہے۔ اسی میں اسے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ کبوتر کے خون کا شایق نہیں ہے۔ یہ گویا مسرت کے تلاش کا جذبہ ہے جو مختلف شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی   اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اقبال کے یہاں اساطیری تلمیحیں جابجا ملتی ہیں ؎

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل
آگ ہے۔ اولادِ ابراہیم ہے۔ نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

نثری ادیبوں میں ابوالکلام آزاد۔ سجاد حیدر یلدرم۔ خلیقی۔ نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی۔ مہدی افادی۔ سجاد حسین۔ قاضی عبدالغفار وغیرہ ہیں جنھوں نے حسن و عشق اور زندگی کی مسرت کی تلاش جاری رکھی۔ رومانیت کو توازن بخشا، فکر کو نئی راہیں دیں اور حقیقت پسندی کی راہ دکھائی۔

شعری ادب میں سب سے واضح تصور رومانیت کا اقبال کے بعد بھرپور انداز میں اختر شیرانی کے یہاں ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن "اختر اردو ادب میں رومانوی تحریک کی اعلیٰ ترین تخلیق ہیں"۔ [1]

اس رومانی تحریک کے ارتقا میں اختر شیرانی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے بہت جرأت مندانہ انداز میں اپنی محبت کو نام عطا کیا اور اس محبت کے جذبے کو اس انداز میں پیش کیا کہ اس سے قبل کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ حسن کو انھوں نے روحانی غذا سمجھا، ساتھ ہی اسے لطف و انبساط کی معراج جانا لیکن مریضانہ ذہنیت کے شکار نہ رہے اور کھل کر جذبۂ محبت کا اظہار کیا جس کو دنیا وجہ رسوائی اور بے شرمی سمجھتی تھی۔ اختر شیرانی نے باعثِ عزت و تسکینِ دل سمجھا کیونکہ جنسی محبت کو وہ جرم نہیں سمجھتے۔ اس پر نادم نہیں ہوتے۔ اپنی محبوبہ سے دو بدو محبت کی باتیں کرتے ہیں۔ اور اسے عطیۂ فطرت جانتے ہیں اور ساری دنیا کی مسرت و شادمانی اسی میں دیکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں غم کے پہلو شاذ ہی ملتے ہیں۔ مجموعی طور پر اختر کے یہاں عورت کا تصور ایک محبوبہ کا ہے جو اس کے عشق کی سرمستی اور جذبۂ رومان کو تسکین دیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

"اختر نے ماورائی لطافت اور سرمستی کی جس طرح پرستش کی ہے اُس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اسے حُسن سے نہیں عشق سے محبت ہے۔ وہ کسی خاص محبوبہ کے غمزوں کا شکار نہیں بلکہ خود اپنی سرمستی پر عاشق ہے۔ اسے مست رہنے کے لئے جذبۂ رومان کی ضرورت ہے"۔ [2]

جوش اس تحریک میں جذبات اور وجدانی کیف کی علم برداری میں بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے طرزِ تخیل میں رومان اس قدر غالب ہے کہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اُسے رومانی رنگ دے دیتے ہیں۔ وہ بھی حقیقت تک رسائی کے لئے جذبات کو ہی قابلِ اعتبار راہبر اور پاسبانِ عقل سمجھتے ہیں۔ وطن کی محبت ہو یا مناظرِ قدرت۔ ان سب سے والہانہ عشق اور

---

[1] اردو ادب میں رومانوی تحریک از ڈاکٹر محمد حسن ص ۳۸ [2] اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ از ڈاکٹر محمد حسن صفحہ ۳۸

جذباتی لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں اور اس مادی دنیا سے الگ ایک دنیا صرف حسن و عشق کی بسانا چاہتے ہیں اور اپنے عشق میں جذبات کو اعلیٰ ترین مقام دینا چاہتے ہیں اور اپنے محسوسات کا بے باکانہ اظہار کر کے فضا میں گرمی پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ ساتھ ہی ان کا اظہار کچھ اس خلوص دل سے کرتے ہیں کہ کلام میں بلا کا جوش اور سادگی آجاتی ہے۔

مروجہ روایت سے ہٹ کر انھوں نے پہلی بار عشق و محبت میں طبقاتی کشمکش اور بندشوں کو توڑنے کی کوشش کی اور جہاں کہیں انھیں حسن نظر آیا سچے حسن پرست انسان کی طرح اس کی تعریف کی۔ یہاں تک کہ مہترانی تک کا ذکر شاعری میں کیا اور اسے اپنی نظموں میں جگہ دی۔ اس ضمن میں اظہار خیال کے لئے اخلاقی جکڑ بندیاں مانع تھیں باوجود اس کے اس کا جمال اس کا متقاضی تھا۔ جوش نے ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں "جامن والیاں۔ مالن۔ مہترانی۔ کوہستان دکن کی عورت۔ جنگل کی شہزادی شامل ہیں۔

ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے انھوں نے "انقلاب کی آرزو" کے ساتھ بھی انصاف کیا ہے۔ اس طرح للکارا ہے کہ زنداں کی دیواریں ہل گئیں۔ انسانوں میں غلامی کے خلاف جذبۂ نفرت جاگ اٹھا۔ میدانِ کارزار میں پورے رومانوی جوش اور ولولہ کے ساتھ للکارتے ہوئے رجز خواں نظر آتے ہیں۔ جذبہ میں زور پیدا کرنے کے لئے بہترین مقامی تشبیہیں اور استعاروں کا بھی استعمال کرتے ہیں۔

جہاں کہیں زندگی کی تلخ حقیقتیں سامنے آئی ہیں وہاں ان کی شاعری میں غم کے عنصر گھول گئیں جس سے پیدا شدہ درد میں انھیں ایک لذت کا احساس ہونے لگا جس کی بنا پر اس کے سارے غم قابلِ برداشت ہو جاتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن صاحب:

"ہر رومانوی کی طرح جوش کو بھی اداسی اور غم سے ایک خاموش لگاؤ ہے۔ خاموش اس لئے کہ اس میں نہ میر کا سا سوز و گداز ہے نہ فانی کا سا خروش! جوش بھی اداس ہوتے ہیں۔ خاص طور سے اُس وقت جب عرفان کا بار وبالِ دوش ہوتا ہے۔ جب زندگی کی تلخ حقیقتیں ایک ایک کر کے عریاں ہوتی ہیں۔ دوست جدا ہوتے ہیں اور ماضی خوشگوار یادوں کا ایک انبار چھوڑ جاتا ہے۔"[1]

---

[1] اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ ڈاکٹر محمد حسن ص ۶۵

اس دور جدید میں رومانوی اثرات نے اور بھی شاعروں کو اس سے وابستہ رکھا۔ زمانے کے تقاضے اور تنوع اور جدت پسندی نے اس کو مقبول عام بنا دیا۔ جمالیات اور فن کے تقاضوں پر زور دیا گیا اور رسمی اور روایتی اندازِ بیان کو چھوڑ کر زندگی کی حقیقتوں اور ان کی مسرتوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان میں حفیظ جالندھری نے شاہنامۂ اسلام اور دوسری ہلکی پھلکی رومانی نظمیں لکھیں اور احسان بن دانش نے غریب اور مزدور عوام کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ چونکہ ان کا اپنا خود تعلق اسی کمزور طبقے سے تھا۔ لہٰذا اس طبقے کے جذبات و احساسات کی تصویر کشی بڑے رومانوی انداز میں کی ہے۔ ؎

احسان! میں ہر چند ہوں اک شاعرِ مزدور
اشعار مرے زندہ و پایندہ رہیں گے

لیکن پھر بعد میں وہ بھی ماضی پرستی میں پھنس کر رہ گئے۔

اُردو میں جو تحریک جوش، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری سے شروع ہوتی ہے اس میں آگے چل کر نئی نسل کے شعراء آفسر میرٹھی، ساغر نظامی۔ احسان دانش جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ اختر انصاری، مجاز اور روش صدیقی کے نام آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے شعراء ہیں جنھوں نے اپنی صلاحیتوں سے اردو کی رومانی شاعری کو حسین اور دلکش بنانے کی کوشش کی ہے۔

مجموعی طور پر رومانی تحریک نے اردو شاعری کو متنوع بنایا۔ ایسے موضوع جن کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا جاتا تھا بڑے دلکش اور خوبصورت انداز میں پیش کئے گئے اور جذبات کی فراوانی نسانی فطرت کے نفسیاتی پہلو اور ان کا ذکر اور جمالیاتی تصور کے مختلف روپ "حُسن صداقت ہے اور صداقت حسن" کے نظریوں کو عمدہ اور دلکش پیرائے میں ہماری شاعری میں سمویا گیا۔ لیکن جلد ہی رومان پرستی کی طرف راغب ہونے لگی اور اس کی خامیاں حاوی ہونے لگیں۔ ابہام۔ بے نظمی۔ موہوم آرزومندی اور بے اطمینانی نے جگہ پالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی اور شاعری دونوں ان کے نزدیک صرف چند ذاتی تجربوں اور داخلی تاثرات کے علاوہ کچھ نہ بن پائی بلکہ یہ ایک مجموعہ بے معنی ہو کر رہ گئی۔ جذبے پر اس قدر زور صرف ہونے لگا کہ صرف انفرادیت کے موہوم اظہار کو ہی شاعری سمجھا جانے لگا اور یہ مریضانہ حد تک داخلیت کا شکار ہونے لگی اور ایک منزل یہ آئی کہ ابہام پرستی اور علامت پرستی ہی کو جانِ شاعری گردانا جانے لگا۔ ٹیگور اور اقبال کی روحانیت کی تفہیم نہ کر کے پھر وہ جیسے پٹری سے اترتی چلی گئی اور دنیا کے مسائل سے آنکھیں

چار کرنے کے بجائے صرف مریضانہ جنسیت اور ژولیدہ بیانی تک محدود ہو کر رہ گئی۔

آہستہ آہستہ ہمارے رومانوی ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ اپنی انفرادیت کے دائرے کو تنگ سے تنگ تر کرتا گیا اور آنے والی نسل کے رومانوی ادیب مریضانہ حد تک داخلیت میں اسیر ہو کر رہ گئے۔ اسی راستے سے جدید شاعری ابہام پرستی اور علامت پرستی کی منزل تک پہونچی۔[1]

اس موڑ پر پہنچ کر جب کہ لوگ صرف جذبات کی زد میں بہتے جا رہے تھے اور ان کو مسائلِ زمانہ سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اپنی جذبات کی دنیا میں خوش تھے کہ ایک دوسرا گروہ اٹھا۔ یا اُس کے ردِ عمل میں ایک دوسری تحریک نے جنم لیا جس سے وابستہ ادیب و شاعر غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کو تسلیم کرتے اور اپنے عہد کے مسائل کو سائنٹفک طور پر حل کرنے کے لئے شعوری طور پر کوشاں تھے۔

ترقی پسند ادبی تحریک

روز آفرینش سے انسان زندگی کے حقایق سے دوچار رہا ہے اور جب کبھی بھی کوئی قابل قدر اور وقیع ادب وجود میں آیا ہے تو اس میں حقایق کی ترجمانی اور اپنے ماحول و عہد کا عکس شعوری یا غیر شعوری طور پر ملتا ہے۔ بقول فراق گورکھپوری

" جس کلچر کو خاکی ہونے میں شرم آتی ہے اُسے دنیا ہنس پھلتی "

لہٰذا اردو شاعری نے خاکی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ آبرو۔ جرأت اور ولی سبھی کے یہاں کم و بیش ان عناصر کی نشان دہی ملتی ہے۔ بقول عزیز احمد:

" کوئی تحریر جس معنی بھی ہوں، زندگی اور حقیقت سے خالی نہیں ہو سکتی لیکن بہت سی تحریروں میں، بہت سی تصنیفوں میں یہاں تک کہ کسی ملک کی صدیوں کی شاعری یا ادب میں زندگی اور حقیقت کا اظہار ـــ خصوصیت سے طبعی زندگی کا اظہار ـــ تشنہ نامکمل رہ سکتا ہے۔ چنانچہ غدر سے پہلے تک کی اردو شاعری میں حقیقت تو یقیناً ہر جگہ، ہر شعر اور شاید ہر لفظ میں موجود ہے لیکن حقیقت کے بہت سے پہلو، بہت سے بر تو ایسے ہیں جو موجود نہیں۔"[2]

---

[1] اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ ڈاکٹر محمد حسن صفحہ ۹ [2] ترقی پسند ادب از عزیز احمد صفحہ ۶

یہ تحریک شعوری طور پر ہمارے ادب میں یورپ کی مرہون منت ہے۔ اس وقت کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات ایک باقاعدہ منظم تحریک کی تشکیل میں معاون ثابت ہوئے۔ کیونکہ جب ملک میں ہر طرف تباہی و بربادی کا دور دورہ ہو تو ایسے وقت میں محبت کے نغمے بے معنی اور بے محل لگنے لگتے ہیں۔ ایسی ہی صورت حال میں شاعروں اور ادیبوں کو سر جوڑ کر یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ اردو ادب میں جو کمیاں اس نہج کی ہیں ان کا تدارک ہو جائے اور ادب زمانے کے حالات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل اور زندگی کی حقیقتوں کے اظہار میں پوری طرح معاون بن سکے۔

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث اس موقع پر لایعنی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ادب کے تمام اجزائے ترکیبی جیسے زبان، اس کے الفاظ و معانی اور خیال انسانی سب انسانی زندگی کے پرتو کو کسی نہ کسی طرح پیش کرتے ہیں۔ زندگی حرکت کا نام ہے۔ اس حرکت میں داخلی اور خارجی دونوں عناصر شامل ہوتے ہیں۔ شاعر یا ادیب کی تخلیق بحیثیت مجموعی خارجی اثرات کے محسوسات اور جو کچھ کہ شاعر یا ادیب کے نہاں خانوں میں ہوتا ہے۔ سے ایک انجانے یا غیر شعوری تفاعل کا نتیجہ ہوتی ہے جو بعد میں الفاظ کی شکل اختیار کرتی ہے کیونکہ خارجی اثرات کے مرتب ہوئے بغیر محسوسات کا اظہار ممکن نہیں۔

ادب برائے ادب کی تحریک یا نظریہ اُس وقت تقویت پاتا ہے جب ملک میں آزادانہ خیالات کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ بقول پیخونوف فن برائے فن کا نظریہ اس وقت ابھرتا ہے جب فن کار اپنے سماجی ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں بُری طرح ناکام ہوتا ہے[1] اور سارا ادب اخلاقی قدروں کے گرد گھومتا ہے اور فن کار کی ناکامیابی خود کی نہیں بلکہ اس پر لادی ہوئی ہوتی ہے اور وہ جا بجا اپنی اس گُھٹن کا اظہار بھی کرتا ہے۔ حکومت وقت فن اور ادب کو اخلاقیات کے درس و تدریس کے لئے وقف سمجھتی رہی ہے اور جب کبھی ایسی حقیقتیں سامنے آئیں جن سے کوئی نیا خیال پیدا ہوا یا روایت شکنی کا خطرہ لاحق ہوتا نظر آیا تو حکومتوں نے اسے مخرب اخلاق و ممنوع قرار دے دیا ہے۔

چرنوسکی نے اپنے عہد میں ان نظریوں کی تشریح و وضاحت کی ہے کہ ہمارے دور میں

---

[1] آرٹ اینڈ سوشل لائف از پیخونوف صفحہ ۱۴۳

فن برائے فن کا خیال یا نظریہ بالکل اسی طرح غیر معروف ہے جیسے دولت برائے دولت یا سائنس برائے سائنس کا نظریہ یا اور اسی طرح کے نظریات۔

تمام انسانی اعمال کو، اگر وہ بے مصرف اور بے کار نہیں رہ جانا چاہتے۔ انسانیت کی خدمت کے لئے وقف ہونا چاہیے۔ دولت کی موجودگی صرف اس لئے ہے کہ اُس سے انسان کو فائدہ پہونچے۔ سائنس کا وجود انسان کو راہ راست پر ڈالتا ہے۔ فن کو بھی کوئی سود مند مقصد کے لئے نہ کہ صرف بے ثمر انبساط کے لئے ہونا چاہیے۔[1]

سیاسی جبر کے نتیجہ میں سماجی حالات سے عدم ہم آہنگی فنی تخلیق میں اس حد تک منعکس ہوتی ہے کہ فن کار کو اپنے ماحول سے علیحدہ کرنے میں مدد گار بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر نکولس اول کے دور میں پشکن کی یہی حالت ہوئی تھی لیکن تخلیقی فن کا کام فن کار میں ایک طاقتور محافظ کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ باغی اور شاعر میں لوگ شاعر سے پرجوش استدعا اس قسم کی شاعری کی کرتے ہیں جو سماجی اور اخلاقی قدروں کو بہتر بنائے۔ چاہے اُسے ہتک عزت سے ہی دوچار ہونا پڑے یا کوئی یہ کہہ دے کہ یہ تو جھڑکی نما اور غیر مہذب ہے۔ یہاں پشکن میں وہی محافظ فن وادب جاگ پڑتا ہے۔[2]

ان دونوں نظریوں میں کون سا نظریہ صحیح ہے، صرف ان نظریوں کے کیا فرائض منصبی ہیں۔ کو طے کر دینے سے نہیں معلوم ہو سکتا۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ اس وقت ملک کے کیا حالات تھے۔ فن کار کس حد تک خاموش رہ سکتا ہے اور کس حد تک جدوجہد و سرکشی و سرتابی کر سکتا ہے۔ اس جدوجہد اور تفاوت کے لئے اس کی خواہش کتنی شدید ہے۔ مختلف زمانے میں مختلف فرائض جو کسی کے تجویز کردہ نہ ہوں بلکہ کچھ سماجی حالات کے تحت اس پر عائد ہوں ان سب عناصر کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

پشکن ایسا بیدار مغز شاعر جو سکندر اول کے دور میں فن برائے فن کے نظریوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ جدوجہد سے انحراف نہیں کر سکتا تھا بلکہ حقیقتاً زندگی کی جدوجہد کے لئے کوشاں نظر آتا تھا۔ اس وقت اسے اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ کبھی لوگ آزادانہ اظہار خیال کے لئے قید و بند اور کوڑوں کی تادیبی اذیت سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود اس طرح

---

[1] تھوٹ اینڈ سوشل لائف از پلیخونوف۔

کے جابرانہ قید و بند کے تصور سے نفرت محسوس کرتا ہے اور ایسی صورتِ حال میں قوم کی کیا حالت ہوتی ہے کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

پوری قوم میں خوشیوں کا فقدان ہے۔ انسان کوڑوں اور زنجیروں کی اذیت میں گرفتار ہیں۔ ہر طرف بے انصافیوں کی حکمرانی ہے۔ خود سر اُمرا اپنے اختیارات کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ ہر طرف تعصب کی تیرگی پھیلی ہوئی ہے" کا کہنے والا وہی پشکن حالات جب تبدیل ہوتے ہیں اور نیکولس اول کا دور آتا ہے فن برائے فن کی حمایت میں جائے پناہ ڈھونڈتا نظر آنے لگتا ہے۔ اس بنیادی تبدیلی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

نکولس اول کا یہ دورِ حکومت سب سے پہلے دسمبرسٹ کی سرکوبی کر کے اپنی ابتدا کرتا ہے جس کا شدید اور گہرا اثر آنے والے سماجی ارتقا پر اور پشکن کی اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ دسمبرسٹ کو دبا دینے یا ان کی سرکوبی کر دینے سے سماج کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ دانشور طبقے کی نمائندگی صفحۂ ہستی سے مٹ گئی جس نے وقتی طور پر ہی سہی لیکن اخلاق و دانشورانہ سطح کو پست کر دیا۔ بقول ہرزن:

"میں نوعمری کے دور میں تھا۔ مجھے یاد ہے کتنی اعلیٰ سوسائٹی پستی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ نکولس کے تخت پر آتے ہی غلامانہ ذہنیت، تنگدلی اور کمینگی نے پوری سوسائٹی کو گھیر لیا۔ سکندر اول کے دور کی تمام خصوصیات پُر جوش عمل کی روح اور اشرافیہ کی آزادی ختم ہو گئی۔ ۱۸۲۶ء میں ان سب کا وجود مٹ گیا۔ حساس دانشوروں کے لیے اس سوسائٹی میں زندہ رہنا تکلیف دہ تھا۔ ہر طرف موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ نتیجہ میں تمام لوگ خوشامد پسند، بے رحم، افسردہ اور اندر سے بے حد کھوکھلے، بیوقوف اور کم حیثیت نظر آنے لگے۔ جو ہمدردی کی تلاش کرتا اُسے ڈرے سہمے چہروں سے سابقہ پڑتا۔ نفرت انگیز نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ بعض اوقات انھیں خاموش کر دیا جاتا یا اُسے اپنی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا۔[1]

اس طرح کے حالات ہر ملک اور ہر دورِ حکومت میں بنتے رہے ہیں اور ہندوستان میں تو فن و ادب کی مطلق خود مختاری کبھی بھی نہ رہی جس کو اپنی اور اپنے فن کی آزاد خیالی پیشِ خاطر رہی۔ وہ گوشہ نشین ہونے پر مجبور پایا گیا ہے۔

ہندوستان کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی صورتِ حال کا تفصیلی جائزہ پچھلے

---

[1] کورٹ اور سوشل لائف از بچو نوف۔

ابو میں لیا گیا ہے۔ ان کے پیش نظر جو بے چینی و انتشار ہندوستانی دانشوروں اور شعراء اور ادیبوں میں پھیلا ہوا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سب ایک سے رجحان رکھنے والے کسی خاص نظم و ضبط کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ساتھ ہی ان میں بین الاقوامی مسائل کا شعور اور ادراک بھی پیدا ہو چلا تھا۔ ہماری قومی تحریکِ آزادی اپنے عروج پر تھی۔ پورے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک ہو رہا تھا۔ انقلاب کا ایک خاص رجحان عام تھا۔ دنیا کے انقلابات سے خواہ وہ فرانس کے ہوں کہ روس کے ایک عجیب سی اپنائیت، دل چسپی اور لگاؤ کا اظہار ہو رہا تھا۔ جنگ عظیم نے پورے یورپ میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔ ہمارے دانشور طلباء اور نوجوان ان تمام حالات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ ان میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، پرمود سین گپتا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ جب نازیوں نے خاص طور پر جرمنی کے ادیبوں، شاعروں کو قید کر کے ظلم کرنا شروع کیا تو پورا یورپ تلملا اٹھا اور یہ حضرات بھی ان حالات سے متاثر تھے۔ فاشزم اور نازی ازم کے خلاف شدید غم و غصہ کا اظہار شروع ہو گیا اور یہ غصہ کی لہر صرف یورپ ہی تک نہ رہی بلکہ یہ لہر امریکہ تک پہنچ گئی۔ اور وہاں کے اہلِ علم اور دانشور متحدہ طور پر اس کے خلاف تحریک میں شامل ہونے لگے اور انسانیت دشمن اور رجعت پسند طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ نتیجہ میں بین الاقوامی سطح پر ایک سیاسی شعور ابھرنے لگا اور انسانیت دوست ادیبوں اور دانشوروں نے ایک ہی لائن میں سوچنا شروع کیا۔ بقول سجاد ظہیر :-

"ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی روز بروز بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور سلجھانے میں مدد دے سکے۔ ہمیں اس بات سے اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ سے مصیبتیں اور آفتیں رہی ہیں اور رہیں گی۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔ جیسے جیسے ہم اپنے مطالعے کو بڑھاتے، آپس میں بحثیں کرتے۔ سماجی، تاریخی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے۔ اسی نسبت سے ہمارے دماغ روشن اور ہمارے قلب کو سکون ہوتا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک نئے لامتناہی تحصیل علم کی ابتدا تھی۔"[1]

---

[1] یادیں از سجاد ظہیر۔ نیا ادب جنوری فروری ۱۹۴۱ء

ہندوستان کے نوجوانوں کے اس گروہ نے جو لندن میں زیرِ تعلیم تھا۔ ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم کی۔ ان میں ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر ملک راج آنند، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور سجاد ظہیر شریک تھے۔ لندن میں ہی تحریک کے مینوفسٹو کا مسودہ بھی تیار کیا گیا اور بعد میں ہندوستان میں مختلف مقاموں پر ادیبوں اور شاعروں کو بھیجا گیا۔ ان میں قابلِ ذکر لوگ علی گڈھ میں ڈاکٹر محمد اشرف، امرتسر میں محمود الظفر اور ان کی بیوی ڈاکٹر رشید جہاں، کلکتہ میں ہیرن مکرجی، حیدرآباد میں قاضی عبدالغفار۔ بمبئی میں ہتی سنگھ تھے۔ اس کا باقاعدہ پہلا جلسہ لندن میں ہی ہندوستانی ترقی پسندوں کی انجمن (INDIAN PROGRESSIVE WRITERS ASSOCIATION) کے نام سے کیا گیا۔ ملک راج آنند اس کے صدر تھے۔ اس انجمن کو جولائی ۱۹۳۵ء میں ہونے والی "ورلڈس کانگریس آف دی رائٹرس فار ڈیفنس آف کلچر" "WORLD CONGRESS OF THE WRITERS FOR DEFENCE OF CULTURS. سے حوصلہ ملا جس میں فاشزم کے خطرے کے خلاف دنیا کے تمام روشن خیال ادیبوں نے شرکت کی۔ ہندوستان کی جانب سے سجاد ظہیر اور ملک راج آنند بھی شریک تھے۔ اس کانگریس میں رفیقانِ قلم کو موت کے داعیوں کے خلاف علَم بغاوت بلند کرنے اور اُن کے حربوں سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔

"رفیقانِ قلم! موت کے خلاف زندگی کی ہمنوائی کیجئے۔ ہمارا قلم، ہمارا فن، ہمارا علم اِن طاقتوں کے خلاف رُکنے نہ پائے جو موت کو دعوت دیتی ہے، جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں۔ جو روپیے کے بل پر حکومت کرتی ہیں۔ اور بالآخر فاشزم کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی طاقتیں جو معصوم طاقتوں کا خون چوستی رہتی ہیں"[۱]

ترقی پسند ادیبوں کا پہلا مینی فسٹو تیار ہو چکا تھا اور ہندوستان کے کونے کونے میں اہلِ قلم حضرات کے پاس بھیجا جا چکا تھا۔

"ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور جاں بلب رجعت پرستی جس کی موت لازمی اور یقینی ہے، اپنی زندگی کی مدت بڑھانے کے لئے دیوانہ وار

---

[۱] سویرا لاہور۔ شمارہ ۸۔

ہاتھ پیر مار رہی ہے۔ پرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے اور زندگی کے حقایق سے گریز کر کے کھوکھلی روحانیت اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھونڈتا رہا ہے جس کے باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا ہے۔ اور اب شدید ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔

ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے اندازِ تنقید کو رواج دیں، جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشو و نما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔

ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔

ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں اور ان روایات کو اپناتے ہوئے ہم اپنے ملک میں ہر طرح کی رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں، تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔" ؎۱

؎۱ ترقی پسند ادب از سردار جعفری صفحہ ۲۳-۲۴۔

"انجمن کی پہلی کانفرنس کی تجویز لکھنؤ (اپریل ۱۹۳۶ء) میں منظور ہوئی:
رفقائے کار اس انجمن کو شروع سے ہی صرف ادبی حلقہ تک محدود رکھنا چاہتے تھے بلکہ اس کو ایک تحریک کی شکل دے کر پورے ملک میں اور دوسری زبانوں کے ادیبوں میں پھیلا دینا چاہتے تھے تاکہ تمام ہم خیال ادیبوں کو ایک جماعت کی شکل دے سکیں اور جب سجاد ظہیر لندن سے ۵ دسمبر ۱۹۳۵ء میں ہندوستان لوٹے اور الٰہ آباد میں قیام کیا تو یہیں سے اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ وہ چاہتے تھے۔
۱۔ الٰہ آباد میں اردو ہندی کے ادیبوں کو ملاکر ترقی پسند ادب کا حلقہ قائم کرنا۔
۲۔ ترقی پسند مصنفین کے مینی فسٹو کے مسودہ پر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے دستخط حاصل کر کے شائع کرانا۔
۳۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں اپنے ہم خیال ادیبوں سے ربط قائم کر کے اُنھیں آمادہ کرنا کہ وہ بھی ایسا ہی کریں۔[1]

اتفاق سے ڈاکٹر تارا چند نے ہندوستانی اکاڈمی کی ایک کانفرنس دسمبر ۱۹۳۵ء کے آخر میں الٰہ آباد میں کی اور اس میں شرکاء منشی پریم چند۔ مولوی عبدالحق۔ جوش ملیح آبادی۔ بھی تھے۔ ان کے علاوہ عبدالسلام ندوی۔ منشی دیانرائن نگم۔ ڈاکٹر محی الدین زور۔ رشید جہاں وغیرہ بھی شریک تھے۔ سجاد ظہیر نے اپنے مقاصد و منصوبے ان حضرات کے سامنے رکھے اور ان لوگوں کو اس رائے سے متفق پایا تو مینو فسٹو پر سب کے دستخط لے لئے۔

اب تحریک کی شاخیں مختلف شہروں میں قائم ہونے لگیں۔ ان کے جلسے بھی ہونے لگے۔ اور ہم خیال ادیبوں نے ان میں شرکت اپنا نصب العین بنا لیا۔ لاہور۔ علی گڈھ۔ لکھنؤ۔ حیدرآباد۔ بمبئی وغیرہ تو ادبی مرکز سے بنے ہوئے تھے۔

علی گڈھ میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا جلسہ ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ علی سردار جعفری۔ جاں نثار اختر۔ حیات اللہ انصاری۔ مجاز۔ اختر رائے پوری۔ خواجہ احمد عباس۔ شاہد لطیف وغیرہ یہاں طالب علم تھے۔ یہ لوگ اشتراکی خیالات کے حامی تھے اور ترقی پسند رجحانات کو یہاں پہلے ہی سے ادب میں ترقی مل رہی تھی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم اس زمانے میں یہاں عربی کے لکچرر تھے۔ سبط حسن

---

[1] روشنائی از سجاد ظہیر۔ صفحہ ۳۴۔

حصولِ تعلیم کے بعد حیدرآباد میں قاضی عبدالغفار کے ساتھ تھے اور قاضی صاحب وہاں اخبار پیام نکال رہے تھے ان دونوں حضرات نے وہاں انجمن کو منظم کیا۔ امرتسر اور لاہور میں فیض احمد فیض۔ محمود الظفر اور رشید جہاں وغیرہ نے انجمنیں قائم کیں۔ صوفی غلام مصطفےٰ لاہور میں عارضی سکریٹری مقرر ہوئے۔[1] بہار میں سہیل عظیم آبادی۔ تمنائی اور اختر اورینوی وغیرہ نے ایک حلقہ قائم کیا۔ اختر رائے پوری کا رسالہ "اردو" میں ایک مضمون "ادب اور زندگی" شائع ہوا۔ جس نے انجمن کے مینی فسٹو کی تشریح و تصریح بڑی تفصیل سے پیش کی تھی :-

"ہمارا خیال ہے کہ ادب کے مسائل کو زندگی کے دوسرے مسائل سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی مکمل اکائی ہے۔ اسے ادب۔ فلسفہ۔ سیاست وغیرہ کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ کاروانِ حیات کا رہبر ہے۔ اسے محض زندگی کی ہم رکابی ہی نہیں کرنا ہے بلکہ اس کی رہنمائی بھی کرنا ہے ......

احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حال زار ہمیں بے حس کیونکر رکھ سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بیکاری و افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں تو حاشا یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو وہ کیا کہئے کن سے کہئے اور کس طریقے سے کہئے .... زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔ اُسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جملہ نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک کا ادب زندگی سے اپنے کو وابستہ کرے گا اور زندگی کے ارتقا کا علم بردار ہوگا۔[2]

اس تحریک نے پورے ملک میں نہ صرف اردو کے بلکہ سارے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں میں اس قدر مقبولیت حاصل کرلی کہ اپریل ۳۶ء میں ایک کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت چودھری محمد علی ردولوی نے کی اور شرکا میں پریم چند۔ مولانا حسرتِ موہانی۔ جے پرکاش نرائن۔ کملادیوی۔ چٹوپادھیائے۔ میاں افتخار الدین۔ یوسف میر علی۔ اندولال یاجنک اور جتیندر کمار وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ بنگال۔ گجرات۔ مہاراشٹر اور مدراس کے ادیبوں نے بھی شرکت کی اور اپنے اپنے ادبی مسائل زیر بحث لائے۔

---

[1] روشنائی از سجاد ظہیر۔ صفحہ [2] ادب اور انقلاب از اختر رائے پوری۔

اسی کانفرنس میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا اعلان نامہ پڑھا گیا جس میں موقف کی پوری وضاحت کی گئی۔ دوسرے پریم چند نے اپنا خطبۂ صدارت پیش کیا جو ایک ادبی ڈاکومنٹ ہے۔ اپنا خطبہ ان الفاظ پر ختم کیا:۔

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حُسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔ جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سُلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔" [1]

اس کے بعد مختلف شہروں میں جلسے اور کانفرنسیں ہوتی رہیں اور مشاہیر وقت نے تحریک اور اس کے ادیبوں کی خوب خوب حوصلہ افزائی کی اور پھر دلّی میں تیسری کل ہند کانفرنس ۴۲ء میں منعقد ہوئی۔ اس وقت قومی و بین الاقوامی سیاسی حالات بڑے نازک دور میں داخل ہو چکے تھے۔ دوسری عالمگیر جنگ کی زہرناکی اپنا اثر دکھانے کے لئے بےحد بےچین تھی۔ فاشزم کے خلاف ایک محاذ بن رہا تھا۔ ہندوستان کے ساتھ ساتھ تحریک بھی فاشزم کے خلاف اور جمہوری حقوق کی حمایت میں سینہ سپر تھی۔ اس نازک موقعے پر کانفرنس میں تحریک کی موافقت و مخالفت کرنے والے دونوں شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں جوشؔ اور ساغر نظامی نے بھی مشترکہ بیانات دئے جس میں جنگ کے متعلق اپنی پالیسی کی وضاحت تھی۔ اسی زمانے میں مجازؔ نے ایک بیان اخبار میں دیا اور ایک نظم "آہنگ نو" لکھی:۔

" اس کھلی ہوئی حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے ایک اتنا بڑا ہنگامہ دیکھ رہے ہیں جس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ ایک ایسا ہنگامہ جس کا انجام خوش آیند بھی ہے اور ہیبت ناک بھی۔ اس قدر خوش آیند کہ یہ دنیا آزادی واخوت وانبساط ومسرت کی ایک جنّت بن جائے اور اس قدر ہیبت ناک کہ ہماری یہی دنیا ایک جہنّم اور ناقابلِ برداشت جہنّم بن جائے۔

ابھی ہماری صالح اور تندرست قوتوں نے ایک دنیا، ایک نئے نظامِ عالم کی تعمیر کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ رجعت پسند طاقتیں اپنی تمام قہرمانیوں کے ساتھ اخلاق و تمدن، شرافت و رواداری کے ہر آئین واصول کو پامال کرکے پورے زور شور سے ہم پر ٹوٹ پڑیں۔ تباہی و بربادی

---

[1] نیا ادب، جنوری فروری ۱۹۴۱ء۔

ے گرجتے گونجتے بادل۔ ملک گیری کی ہوس۔ خون کی پیاس۔ ہولناک آتشزدگی اور غارت گری۔
ان سب نے مل کر جرمن اطالوی اور جاپانی فاشزم کی شکل اختیار کی ہے۔ فاشزم کا یہ طوفان
ساری دنیا پر چھا جانے کے لئے پیچ و تاب کھا رہا ہے اور یہ منحوس بلا خود ہم سے (ہندوستانیوں سے)
قریب تر ہوتی جا رہی ہے خواہ ہم محسوس کریں یا نہ کریں یا اس ہنگامۂ عظیم میں ہماری حیثیت سب سے زیادہ
عبرت ناک ہے۔ ہماری حیثیت تو شکستہ پر پرندے کی سی ہے جو ایک طرف خود پہلے سے شکنجے میں جکڑا
ہوا ہو اور دوسری طرف ایک تیز منقار اور خونیں پنجوں والا شاہین دبوچنے کے لئے منڈلا رہا ہے۔
ایک طرف اندرونی۔ سامراجی دباؤ سے ہمارے لئے آواز بلند کرنا تو کیا سانس لینا مشکل۔ دوسری
طرف بیرونی بلا جاپانی حملے کی شکل میں ہر آن قریب تر...... اسی طرح ہم بہ یک وقت دو مصیبتوں سے
دست و گریبان ہیں۔ ہمیں دونوں کا بہ یک وقت مقابلہ کرنا ہے
یہ نازک اور پیچیدہ مسئلہ کیوں کر حل کرنا چاہئے۔ ہمارے سیاست داں رفیق بتا چکے
ہیں اور بتا رہے ہیں۔ میں تو شاعر کی حیثیت سے نہیں ادب کے طالب علم کی حیثیت سے۔ ایک رہنما کی
حیثیت سے نہیں صرف ایک مسافر کی حیثیت سے اپنے شاعروں اور ادیبوں کو صورت حال کی نزاکت
بتا دینا چاہتا ہوں۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ قومی تخریب و تعمیر میں شاعروں اور ادیبوں کا بڑا
ہاتھ رہا ہے تو یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ اس نازک دور میں ہر ادبی اقدام بڑی ذمہ دارانہ
حیثیت رکھتا ہے۔

اس وقت بعض نوجوان شعراء اور ادیبوں کو ہم سخت سراسیمگی میں دیکھ رہے ہیں۔ وہ
اپنے آپ کو سخت اندھیرے میں پا رہے ہیں اور کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس سراسیمگی سے دو خطرناک
نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ وہ حساس فرد جسے ادیب یا شاعر کہا جاتا ہے ان حالات سے پریشان ہو کر
سکوت اختیار کرے اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے غیب سے کسی تبدیلی کا انتظار کرتا رہے یا پھر حقایق کی
تلخیوں سے بیزار ہو کر خود کو جام و سبو کی سرمستیوں اور زلف و عارض کی تابناکیوں کی نذر کر دے۔
مجھے اس بات کے اعتراف میں کوئی عار نہیں کہ میں ان دونوں کا شکار رہ چکا ہوں اور اب بھی
کسی حد تک ہوں مگر بمبئی کے چند روز قیام اور اپنے ان سرفروش دوستوں کی قربت نے جنھیں میں نے
ہمیشہ اپنا دست و بازو سمجھا ہے، میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ دیا ہے میں اپنے ویران سینہ میں
ایک تازہ حرارت محسوس کر رہا ہوں۔ ہم اتنے بے بس نہیں ہیں جتنا سمجھتے ہیں۔ ہم ایسے پر شکستہ
اور بے دست و پا نہیں ہیں جیسا کہ غلطی سے محسوس کرتے ہیں۔ ہم اپنے ملک، اپنے تہذیب و تمدن

کے سرمایہ کو۔ اپنے آرٹ اور ادب کو فاشزم کی دست درازیوں سے بچا سکتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سوا کوئی دوسرا بچا نہیں سکتا۔ آج ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے اہلِ وطن کے دل میں امید کی روشنی پیدا کریں۔ ان کی تھکی ہوئی نبضوں میں ہمت کا خون دوڑا دیں۔ ہم ترقی پسند ادیب اب تک اپنے آرٹ سے تلوار کا کام لیتے رہے ہیں۔ ہم نے ہر قسم کے ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی ہے پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسانیت اور تمدن کے سب سے بڑے دشمن فاشزم کے مقابلہ میں ہم اپنی تلوار نیام میں رکھ لیں۔

ہمارے نغموں کو آج دوبارہ وطن کی فضاؤں میں گونجنا چاہئے تاکہ اتحاد، خود اعتمادی، سرفروشی اور حمیت کے جذبات سے معمور ہو کر ہم اپنے راستہ سے ہر اس رکاوٹ کو ہٹا دیں جو اندھے سامراجی ہماری راہ میں حائل کرتے ہیں اور تمام دنیا کے عوام کے ساتھ مل کر اس جنگ آزادی میں اس طرح شریک ہوں جو ہماری عظیم المرتبت قوم کے شایانِ شان ہے۔ [1]

مجازؔ کے اس بیان میں انسانیت کے لئے بے پناہ محبت اور درد ہے اور اس کے دشمن عناصر کے لئے شدید نفرت اور غم و غصّہ کا اظہار ہے۔ اس میں شاعر کی روح کا کرب جھلکتا ہے اور لائحہ عمل کے لئے بھی صحیح راہ نمائی ملتی ہے۔

مارچ ۵۳ء میں چھٹی کل ہند کانفرنس دہلی میں پھر بلائی گئی۔ ترقی پسند تحریک نہ کہ صرف اردو ہی بلکہ ہندوستان کی سب سے بڑی ادبی تحریک ہے جس سے ہندوستان اور پاکستان کی ہر ترقی یافتہ زبان کے مایۂ ناز ادیب وابستہ رہے ہیں۔ اس تحریک نے انسانیت کا ایک ایسا تصور پیش کیا جس میں انسان ہی سب سے برتر ہے۔ نسل و قوم اور مذہب و ملت کا فرق انسانیت کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ اس کے پیروکاروں اور ماننے والوں کا دل انصاف و محبت اور آزادی کے جذبے سے سرشار ہے۔ —

نگہ بلند، سخن دل نواز جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

ترقی پسند مصنفین کا عقیدہ تھا کہ ادب کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق عوام سے ہے اور عوام کا تعلق سماج سے ہے لہٰذا ترقی پسند ادب میں سماج کی عکاسی اور عوام کے جذبات و احساسات

---

[1] نیا ادب سہ ماہی ۴۳ء شمارہ (۱)

کی ترجمانی ہونا لازمی ہے :-

" عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانہ محض رہ جائیں گے۔ ادیبوں کو انسانوں سے مِل جل کر انھیں پہچاننا ہے۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ میں نے ایک مدت تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں جو غلطی کی ہے، اب میں اسے سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ آج یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے شعور کا تقاضا ہے کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنا چاہئے۔ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہوا تو وہ ناکام و نامراد رہے گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغِ حق کی طرح روشن ہے اور کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا۔[1]

ترقی پسند مصنّفین نے جو ادب سماج کا آئینہ دار ہے کے مقولے کو ثابت کر دکھانے کی کوشش کی وہ ادب اور عوام کے ٹوٹتے ہوئے رشتہ کو جوڑنے کے لئے کوشاں تھے :-

" ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنونِ لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دُکھ سکھ اور جدو جہد کا ترجمان بنا کر روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔[2]

ترقی پسند تحریک جب ہندوستان میں ۱۹۳۵ء میں شروع ہوئی تو اس سے قبل ہی ذہنی طور پر جاگیردارانہ و سامنتی نظام کے خلاف اس کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ بات اور ہے کہ یہ کھُل کر تحریک کے طور پر نہیں آئی تھی۔ تمام شاعر و ادیب بین الاقوامی سطح پر سامراجی خطرات کو محسوس کر رہے تھے، اسی لئے پوری دُنیا میں اس کے خلاف نفرت کا اظہار ہو رہا تھا، اور اس بات کی کوشش کی جا رہی تھی کہ ادب کو مزدوروں، کسانوں کے مسائل کو اپنا موضوع بنانا چاہئے اور زندگی کے حقایق کی ترجمانی کرنی چاہئے۔ ترقی پسند مصنفین نے ادب کے ذریعہ انقلاب کی دعوت دی اور اس سرمایہ دارانہ نظام جس میں انسانیت اور انصاف کا خون کیا جاتا ہے اور چند لوگوں کی خوشیوں کی خاطر عوام کی خواہشات و خوشیاں دفن کر دی جاتی ہیں، کے خلاف بغاوت کرنے کی دعوت دی اس کے لئے انھیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، دکھ جھیلنے پڑے۔ جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں، جان و مال کی قربانیاں دینی پڑیں، خیالات کے

---

[1] ٹیگو کا پیغام۔ نیا ادب۔ جنوری، فروری ۱۹۴۱ء۔

[2] انجمن ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ۔ نیا ادب۔ جنوری، فروری ۱۹۴۱ء۔

اظہارات پر پابندیاں لگائی گئیں لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی راہ مستقیم پر اڑے رہے تب کہیں جاکر حسن کا معیار تبدیل ہونا شروع ہوا اور وہ ادب تخلیق ہونا شروع ہوا جس میں زندگی کے دل کی دھڑکنیں، عوام کے جذبات اور تاریخ کا خون ہے۔“ [۱]

مجاز کا ذہنی و فکری ارتقا

انسان سماج میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں اس کے فکر و ذہن کی نشو و نما ہوتی ہے۔ کسی فن کار کے فن کو پرکھنے سے پہلے اس زمانے اور سماج کا مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے جس میں اس شاعر یا فن کار نے اپنا ذہنی سفر طے کیا۔ مجاز کی شاعری کا دور ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا جب کہ پورا ہندوستانی معاشرہ ہی نہیں بلکہ پورا ایشیا ایک ذہنی کرب و انتشار اور بیداری کے دور سے گزر رہا تھا۔ پرانے فرسودہ نظام کی جگہ نئے نظام حیات اور تازہ سماج کی آمد آمد تھی۔ ہندوستان کے عوام بھی خوش آئند مستقبل کے خواب آنکھوں میں لیے نئی منزلوں کی جانب گامزن تھے لیکن ساتھ ہی کچھ عجیب سی غیر یقینی صورت حال کا شکار بھی تھے کبھی انھیں نظام کہنہ بری طرح کھلنے لگتا اور کبھی اس نئے بدلتے ہوئے سماج کے مطابق اپنے ذہنوں کو ڈھالنا بہت مشکل نظر آنے لگتا بہر حال سیاسی، سماجی، ادبی اور تہذیبی ہر اعتبار سے یہ دور نشاۃ ثانیہ کا دور تھا۔ زندگی کا ہر پہلو متاثر تھا۔ ان حالات کا اثر ادب پر پڑنا بھی لازمی تھا۔ تمام شاعر و ادیب ارادی و غیر ارادی طور پر ان حالات سے متاثر ضرور ہوئے۔

مجاز کے ذہن و فکر کی نشو و نما میں بھی ان بدلتے ہوئے حالات نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک کا زمانہ مجاز کی شاعری کے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے اور یہی زمانہ ہندوستان کی تاریخ و ادب میں بڑی بڑی دین بھی لایا۔ اردو ادب کی دنیا میں ایک طرف تو اقبال کے فکر و فلسفے کی عظمتیں تھیں دوسری طرف پریم چند ہندوستان کے بھوکے ننگے عوام کی تصویر کشی بڑے دلکش انداز میں کر رہے تھے کہیں آزاد دہلوی کا جذبۂ حب الوطنی کار فرما نظر آرہا تھا اور کہیں فانی، اصغر، اختر شیرانی اور جگر حسن و عشق کے راگ ایک نئے انداز سے الاپ رہے تھے ان سب کے علاوہ ایک اور گروہ تھا جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھا اور جس کو اس بات کا احساس تھا کہ اس دور

---

[۱] ترقی پسند ادب۔ از سردار جعفری۔ ص ۲۳۵

میں جبکہ روٹی انسان کا سب سے بڑا المیہ بن گئی ہو صرف حسن و عشق کے نغمے گا کر کام نہیں چلایا جا سکتا تھا کیوں کہ فاقہ کش عوام کا پیٹ روٹیوں سے بھرتا ہے نغموں سے نہیں۔ لہذا ان نظریات کے ساتھ یہ نیا گروپ سامنے آیا جو ادب کو زندگی کے تلخ حقائق کا ترجمان بنانا چاہتا تھا۔ ان کا ایک واضح نقطہ نظر تھا "ادب کو زندگی کے حقائق کا ترجمان ہونا چاہیے"۔ اس حلقے کے ادیب و شاعر جوش، حسرت، فیض، مخدوم، سردار جعفری، مجاز، پریم چند، کرشن چندر، مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، احمد علی، احتشام حسین وغیرہ تھے

ہندوستان کی اس تہذیبی و تمدنی زندگی کا یہ نیا آفتاب بڑی تابانی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا اور مجاز نے اسی آفتاب تازہ سے کسب نور کیا اور اس کے رجز خواں اور نقیب بن گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ادب اور زندگی کی ہر سطح پر ہر طرف حب الوطنی اور انسانیت کے خواب دیکھے جا رہے تھے جہاں نسل و قوم کا فرق مٹ جاتا ہے اور پورے ہندوستان کا فرد واحد ایک ہو کر نئی زندگی کی جستجو میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ خواب صرف خواب ہی رہا جس کی تعبیر بہت بھیانک نکلی۔

"وہ زمانہ نشاۃ الثانیہ کی رونق اور چہل پہل اور جوش و خروش کے باوجود بڑا کٹھن اور بڑا پر پیچ اور بڑا خطرناک تھا ہم سب ایک جوالا مکھی کے کنارے پر بیٹھے رت جگے منا رہے تھے ملک میں کئی نسلیں یا قومیں بستی تھیں ان میں سے ایک کا نام مسلمان قوم تھا۔ اس مسلمان قوم کا سیاسی و سماجی ارتقا جس طور سے ہو رہا تھا ہوتا رہا۔ ۱۹۳۵ء کے بعد جب مجاز اور ان کے ساتھیوں نے نیشنلسٹ اور انقلابی شاعری شروع کی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ سیاست کی سطح پر مختلف تحریکوں نے زور پکڑا جن کو اس نئے سماجی شعور سے کوئی ہمدردی نہ تھی جس کے تحت پہلے ماہتاب کو ملا کے عمامے اور بنیئے کی کتاب سے تشبیہ دی گئی تھی۔ ترقی پسند تحریک کی جڑیں تو اسی وقت سے کھوکھلی ہونا شروع ہو گئی تھیں جس کا نتیجہ آج اس ملک میں ہمارے سامنے موجود ہے اور اس کا علاج بہر حال نہ کرشن چند کے پاس تھا اور نہ اسرار الحق مجاز کے پاس۔"[1]

علی گڑھ یونیورسٹی کے ادبی و سیاسی ماحول کا اثر مجاز کے ذہن و فکر پر بہت گہرا پڑا۔

---

[1] اندھیری رات کا مسافر۔ از قرۃ العین حیدر، مجاز ایک آہنگ ص ۳۰۱ - ۳۰۲

اس زمانے کا ادب ملک کی بدلتی ہوئی سماجی قدروں اور سیاسی بیداری کے رجحانات کا آئینہ دار تھا۔ مجاز کی شاعری کی ابتدا یوں تو آگرہ کے قیام سے ہوگئی تھی۔ لیکن وہاں ان کے ذہن کو وہ بالیدگی اور پختگی نہ مل سکی جو علی گڑھ کی فضا نے میسر کر دی تھی۔ علی گڑھ کا ادبی و سیاسی ماحول آگرہ سے یکسر مختلف تھا۔ یہاں ملک کے بڑے بڑے دانشور، ادیب اور شاعروں کا پورا ایک حلقہ تھا جو نئے خیالات کا دلدادہ اور نئی تہذیب کا پرستار تھا۔ پرانی روایات اور ماضی پرستی کو اپنی کسر شان سمجھتا تھا۔ نئے اشتراکی خیالات کا اظہار برملا ہوتا تھا۔ ان کے اظہار میں کسی طرح کی رکاوٹ اور جھجک نہ محسوس کی جاتی۔

"یہ زمانہ جتنا ہندوستان کی تاریخ میں اہم ہے اتنا ہی اردو ادب اور ہندوستان کی تاریخ میں بھی۔ علی گڑھ کی تحریک نے انیسویں صدی میں اردو ادب کے دھارے کو موڑا تھا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں غزل کی اصلاح کا سہرا بھی علی گڑھ کے ایک سپوت حسرت موہانی کے سر ہے۔ دوسری دہائی میں وہاں کی رومانی تحریک میں بھی علی گڑھ کا اچھا خاصہ حصہ ہے۔ اور تیسری دہائی میں جب ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو نیا رخ دیا تو یہاں بھی علی گڑھ پیچھے نہیں رہا۔

جس زمانے میں میں وہاں پہنچا نئی تحریک کے اولین نقوش بن رہے تھے اور ادب و سیاست مل کر ایک ہوئے جا رہے تھے۔ اختر رائے پوری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، مجاز، جاں نثار اختر، آل احمد سرور سب وہاں کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر عبدالعلیم استادوں میں تھے۔ بعد کو عصمت چغتائی بھی وہاں پہنچ گئیں اور جذبی بھی۔ اور یہ سب جدید اردو ادب کے نہایت اہم اور ہوشمند معمار تھے۔

وہ زمانہ یورپ میں فاشزم کے عروج کا زمانہ تھا اور ہندوستان میں تحریک آزادی کی لہریں اونچی اٹھ رہی تھیں۔"[۱]

ان نئے خیالات و حالات کا اثر مجاز پر بھی پڑا۔ اور بقول آل احمد سرور "نمائش اور صبح بہار کا لکھنے والا انقلاب کا نقیب بن گیا۔"[۲] مجاز کی رومان پرور طبیعت پر جو انقلاب کا رنگ نظر آتا ہے وہ بھی اسی علی گڑھ کے ماحول کی دین تھا جہاں حسن و عشق اور تیغ و تفنگ کی

[۱] لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ از سردار جعفری۔ [۲] مجاز رومانیت کا شہید۔ از آل احمد سرور۔ علی گڑھ میگزین مجاز نمبر

آوازیں ایک ساتھ سنائی دیتی تھیں۔ ان کی شرافت مروت وضع داری اور انسانیت دوستی پر ان کے اپنے گھر کے ساتھ ساتھ علی گڑھ کے آزاد و روشن خیالات کا بھی اثر تھا اس لیے مجاز کہیں "ساز و جام کا دلدادہ کہیں تلوار کا دھنی نظر آتا ہے"۔ ؎

مجاز ابتدا ہی سے حسن کے پرستار تھے۔ علی گڑھ کے اس حسن پرور ماحول میں جہاں وہ لڑکیوں کے مقبول شاعر بن گئے تھے اُن کے شورشِ جذبات کو تسکین ملی اور ان کے رومانوی رنگ کو اجاگر کر دیا۔ "نمائش"، "آج کی رات"، "صبح بہار"، "تعارف" اور انگنت غزلیں اُن کے ذہنی سفر کی ابتدائی سنگ میل کی نشاندہی کرتی ہیں جن میں اُن کا فطری رومانوی رنگ غالب ہے اس رومان پرور طبیعت کے باوجود مجاز انسانیت دوست تھے اُن کی دنیا صرف عشق ہی عشق نہ تھی بلکہ اس کے پردے میں وہ سرمایہ داری کی خونخواری سے پریشان اور انقلاب کے خوش آئین تصور سے محظوظ ہوتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے اس انداز فکر پر بھی علی گڑھ کے اس اشتراکی ماحول و فضا کا اثر ہے جہاں جوش، فیض، علی سردار جعفری، آل احمد سرور، حیات اللہ انصاری، اختر رائے پوری، جاں نثار اختر، سبط حسن، جذبی، ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ جن سے مجاز کے گہرے تعلقات تھے، مارکسزم کے نظریوں کے حامی تھے اور اپنی تحریروں سے ترقی پسند ادب کی وضاحت و اشاعت کر رہے تھے۔ مجاز کی بھی ذہنی و فکری دنیا کی تشکیل میں یہ سارے اشتراکی و انقلابی نظریات معاون ثابت ہوئے۔ انسانیت کا درد رکھنے والے انسان کی رومان پرور طبیعت نے انسانی ہمدردی کے جذبہ کو بھی ایک رومانوی روپ دے دیا جس کے زیر اثر رومانویت اور انقلابیت کے عناصر کا امتزاج حسین تخلیقات کی شکل میں سامنے آیا جن میں "رات اور ریل"، "انقلاب"، "مجبوریاں"، "اندھیری رات کا مسافر"، "آوارہ"، "سرمایہ داری"، "خواب سحر" قابل ذکر ہیں۔

مجاز کی ذہنی و فکری ارتقاء کا سلسلہ جو علی گڑھ سے شروع ہوا اور اس کی فضا میں جس منزل تک پہنچا تقریباً وہیں رک گیا جن خیالات اور نظریات کو انھوں نے علی گڑھ میں اپنایا تھا وہ آخر وقت تک قائم رہے شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ملک میں ایسی کوئی نمایاں نشاط آفریں تبدیلی نہیں آئی جس کا اثر مجاز قبول کرتے یا بقول

؎ دیباچہ آہنگ از فیض۔ ص ۱۱

فیض" مجاز میں جو ایک لاابالی پن تھا اور سہل بگماری کا جذبہ تھا اس نے ان کے فن کو مزید نکھرنے کا موقعہ نہ دیا۔

"ابھی تک شمشیر کم ہے۔ ساز و جام زیادہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شمشیر زنی کے لیے ایک خاص قسم کے دماغی زہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مجاز کی طبیعت میں زہد کم ہے۔ لذتیت زیادہ۔ شمشیر زنی کو میں انقلابی شاعری کے معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ دماغی زہد سے مری مراد ہے ایک مخصوص انقلابی مقصد کے نشر و اظہار میں کلی ذہنی اور جذباتی یکسوئی تمام غیر متعلق جذباتی ترغیبات سے پرہیز۔ جو کٹھن اور محنت طلب عمل ہے۔ مجاز ہم سب کی طرح لاابالی اور سہل بگمار انسان ہیں چنانچہ جب بھی انھیں ذوق پنہاں کی کامرانی کا موقع ملے باز نہیں رہ سکتے۔"[1]

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مجاز کی سہل پسندی نے انھیں عظمت کی رفعت تک نہ پہنچنے دیا جو کسی عظیم شاعر کے شایان شان ہوتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ مجاز علی گڑھ کے قیام کے دوران شہرت و مقبولیت کے اُس اسٹیج پر پہنچ گئے تھے جس کو انھوں نے اپنے لیے کافی سمجھ لیا اور شاعری کے لیے جس دماغی زہد اور اکتساب علم کی ضرورت ہوتی ہے اس کی طرف یکسر دھیان نہ دیا۔

مجاز کا کتابی مطالعہ ضرور محدود تھا لیکن زندگی کو انھوں نے جتنے قریب سے دیکھا اور پرکھا شاید ہی کسی دوسرے ہم عصر شاعر نے دیکھا اور پرکھا ہو۔ وہ زندگی کے شاعر ہیں تصورات اور نظریات کے نہیں انھوں نے کبھی بھی کسی نظریہ کو اپنے اوپر لادا نہیں بلکہ جس نے ان کے ذہن سے مطابقت کی اسے قبول کر لیا۔ وہ ظالم اور جابر قوتوں کے اس بنا پر خلاف تھے کہ یہ دردمندی و انسانی ہمدردی کی ضد ہیں۔ اشتراکیت کے نظریات کو بھی محض اس لیے اور اس حد تک اپنایا کہ اس کی بنیاد کمزوروں کی حمایت اور جابر و ظالم قوتوں کی مخالفت پر تھی جو انسانیت کا عین جوہر ہے۔ انقلاب ۱۹۳۳ء کی تخلیق ہے۔ اس وقت ترقی پسند تحریک کا چرچا بھی نہیں تھا۔ لیکن مجاز برملا دہل سرمایہ داری کے خلاف مزدوروں کے دردکا دم بھرتے نظر آتے ہیں۔

---

[1] مطرب انقلاب۔ از فیض احمد فیض۔ دیباچہ آہنگ۔ ص ۶

زندگی سے مجاز کا تعلق بہت گہرا ہے۔ دہلی کی اونچی سوسائٹی سے لے کر بمبئی کانپور اور کلکتہ کی کھولیوں میں رہنے والے مزدور اور خانہ بدوشوں کی صحرانوردی سب کے بڑے قریب سے مشاہدے اور تجربے کیے ہیں اس لیے کہیں کہیں خالدہ ادیب خانم کا استقبالیہ کہیں مزدور کا گیت لکھتے ہوئے اور کہیں نرم صوفے گود میں فردوس برنائی لیے اور کبھی انھیں نرم صوفوں کے خلاف سرمایہ داری جیسی نظم میں احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ ؎

یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے　　مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے
یہ انسانی بلا خود خونِ انسانی کی گاہک ہے　　وبا سے بڑھ کے مہلک موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

مجاز کی شاعری میں یہ فطری تضاد جگہ بہ جگہ نظر آتا ہے: "ملک کے بڑے بڑے شہروں کے بازاروں اور شاندار میخانوں سے لے کر غلیظ اور نیم تاریک تاڑی خانوں تک۔ اعلیٰ سرکاری افسروں کے کرّوفر اور غرور و شہریاری سے لے کر پھٹی چپلیں پہنے سڑکوں پر بے مقصد منڈلاتے ہوئے بے روزگار نوجوانوں کے احساسِ شکست اور جھنجھلاہٹ تک کافی ہاؤس اور ڈرائنگ روموں کے ادبی و سیاسی مباحثوں سے لے کر علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے محنت کشوں کے بڑے بڑے جلوسوں تک زندگی کو مجاز نے انگنت روپ میں دیکھا، برتا، اور تاثر قبول کیا۔" [۱]

مجاز کے ذہنی و فکری ارتقا میں اس زمانے کے ادبی و سیاسی بیداری کے ساتھ نئی تہذیبی زندگی کا اثر بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے اس زمانے میں ہندوستانی معاشرہ کچھ اس قسم کا تھا:۔

ہندوستان کی تہذیبی زندگی کا یہ نیا دور جس شان سے طلوع ہوا مجاز اسی شان سے اس کے نقیب بن کر آگے بڑھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ، پٹنہ، الہ آباد، لکھنؤ اور علی گڑھ کی یونیورسٹیاں ملک کی علمی ادبی اور کلچرل زندگی کے مرکز بنی ہوئی تھیں۔ جب قاضی نذرالاسلام اور ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے اور کرشن چندر اور امرتا شیر گل کے ناموں میں عجیب طرح کی مقناطیسیت معلوم ہوتی تھی۔ جب ملک میں ہر روز ہر طرف نت نئے چراغ جلتے جا رہے تھے۔ اودے شنکر نے رقص و تجدید تمدن کے لیے المورہ میں کلچر سینٹر قائم کیا تھا۔ گروپ تھیٹر مود منٹ

---

[۱] مجاز حیات و شاعری: از منظر سلیم۔ ص ۱۱۴-۱۱۵

شروع کیا گیا تھا۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نئی نئی کتابیں شائع کر رہی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اور دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ادب پر ٹھوس کام کیا جارہا تھا۔ الہ آباد۔ لکھنؤ کی یونیورسٹیوں کے طالب علم اپنے گردوں کے قدموں میں بیٹھ کر علم حاصل کرنا اپنی زندگی کا واحد مقصد گردانتے تھے۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور آل انڈیا ویمنز کانفرنس کے پلیٹ فارم سے دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں۔"[۱]

یوں تو جسمانی طور پر مجاز کو ۱۹۵۵ء میں موت ہوئی۔ لیکن شاعری کی دنیا میں وہ اس سے چند برس پیشتر ہی ختم ہو چکے تھے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد ان کی کوئی اہم شعری تخلیق منظر عام پر نہیں آئی۔

"شاعر کی جسمانی موت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مجاز کی موت کی آخری ہچکی وہ نظم ہے جس کو اس نے اعتراف کا نام دیا ہے۔" لیکن میرے خیال میں اس ہچکی کے باوجود مجاز میں کچھ دم ضرور باقی تھا ورنہ فکر جیسی نظم تخلیق نہ ہوتی۔ ۱۹۵۰ء کے بعد واقعتاً مجاز پر ذہنی، فکری جمود طاری ہو گیا تھا۔ جس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ آزادی کے بعد جو ادبی حلقہ لکھنؤ میں جمع تھا وہ بکھر تا گیا کچھ لوگ پاکستان چلے گئے کچھ ملازمتوں کے سلسلہ سے دور دراز شہروں کو سدھارے اور مجاز کو شدید تنہائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت ان کا ایک ایسے گروہ سے سابقہ پڑا جو صرف شرابی تھا اور لطیفوں و فقروں کا شائق۔ جسے نہ مجاز سے دلچسپی تھی نہ ان کے کلام و فن سے محبت، لہٰذا مجاز اپنے کو بے دست و پا محسوس کرنے لگے مزید برآں کثرت شراب نوشی، تنہائی ان غیر شاعرانہ دوستوں کی صحبت کی بنا پر اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ سب نے مل کر مجاز کے اندر کے شاعر کو ختم کر دیا۔ دوسرے مجاز نے جو حسین خواب دیکھے تھے آزادی کے بعد اس کی تعبیر بڑی بھیانک نکلی۔ خواب پریشاں اور حالات نو سے ان کا نشاط پرور ذہن ہم آہنگ نہ ہو سکا نہ ہی سمجھوتہ کر سکا۔ نتیجے میں خاموشی طاری ہو گئی۔

مجاز کے کلام کو سامنے رکھ کر ان کے ذہنی اور فکری ارتقا کی راہیں متعین

---

[۱] اندھیری رات کا مسافر۔ از قرۃ العین حیدر۔ مجاز ایک آہنگ۔ ص ۲۹۲

کرنا کوئی خاص مشکل کام نہیں۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۵ء تک ان کے ذہنی ارتقا میں خاص تسلسل پایا جاتا ہے۔ ابتدا میں انھوں نے زیادہ تر لکھنوی انداز کی غزلیں کہیں لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ مجازؔ کے انداز میں بھی فرق آیا اور انھوں نے نظمیں لکھنی شروع کیں۔ اور وہ اس میدان میں مقبول بھی ہوئے۔ شروع کی دو چار نظمیں رومانی انداز کی ہیں اس کے بعد پہلی انقلابی نظم "انقلاب" ہے۔

"میں نے مجازؔ کی پہلی نظم جو اس کی زبان سے سنی "انقلاب" تھی یہ غالباً ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا اور ہندوستان کے نوجوانوں میں ایک عام بے چینی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ اور فضا میں سوشلزم کے نعرے بلند ہو رہے تھے جو کانگریس کے ایوان تک پہنچ گئے اور ۱۹۳۶ء میں کانگریس کے اجلاس لکھنؤ کے صدارتی خطبے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے ادا ہوئے۔"[1]

انقلاب کے علاوہ اور بھی نظمیں ہیں جن پر اس کا یہ رنگ چھایا ہوا ہے۔ جن میں "شوقِ گریزاں"، "خانہ بدوش"، "رات اور ریل"، "تعارف"، "نذرِ علی گڑھ" "مسافر"، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ذہنی و فکری ارتقا کی ایک منزل وہ آتی جب خواب حقیقت کے روپ میں نظر آنے لگتے ہیں تو شدتِ احساس بڑھنے لگتی ہے۔ اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے اس میں شدید قسم کی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے جو اپنی راہ میں کسی بھی رکاوٹ کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتی اور اس میں ایک ناقابلِ شکست اعتماد و عزم کو جنم دینے لگتی ہے پھر وہ خواب خواب نہیں رہ جاتے۔ مجازؔ میں بھی اس خواب کی بہتر تعبیر کے لیے ایک دفورِ شوق پیدا ہو جاتا ہے جسے وہ ایک عزم کے ساتھ شرمندہ تعبیر کرنے کے دعوے کرنے لگتے ہیں:-

تلاطم خیز دریا آگ کے میدان حائل ہیں
گرجتی آندھیاں بپھرے ہوئے طوفاں حائل ہیں
تباہی کے فرشتے جبر کے شیطان حائل ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

---

[1] کفن بردوش۔ از سردار جعفری۔ مجاز ایک آہنگ۔ ص ۱۱۸

اس فکری دور کی نظمیں اندھیری رات کا مسافر۔ طفلی کے خواب۔ نوجوانوں سے۔ نوجوان خاتون سے۔ مزدور کا گیت۔ پردہ اور عصمت۔ ادھر بھی آ۔ سرمایہ داری۔ آوارہ۔ خواب سحر ہیں۔

مجازؔ کے فکری ارتقاء کے اس دور کی سب سے اہم نظم "آوارہ" ہے جو ان کی ہی نہیں بلکہ اس دور کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس زمانے کے سماجی و سیاسی حالات جن کے زیر اثر اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہنے کا عزم رکھنے کے باوجود شاعر کو ایک ایسے ہی ذہنی کشمکش اور تضادات کا شکار ہونا پڑتا ہے کہ ؎

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

یہ عزم باوجود محرومیوں اور ناکامیوں کے برقرار رہتا ہے اور تعمیر نو کے لیے جب راستے مسدود پاتا ہے تو جھنجھلاہٹ میں اس کے ذہن میں بار بار یہ بات آتی ہے ؏

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

آوارہ کے بعد مجازؔ کے فکری ارتقا کی اگلی منزل کی نشان دہی کرنے والی نظم خواب سحر ہے یہ نظم انقلاب روس کی سالگرہ کے موقعہ پر لکھی گئی تھی لہٰذا اس نظم سے مجازؔ کے اشتراکی میلانات کا اظہار ہوتا ہے انھوں نے اس نظم میں واضح طور پر اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انسان کو اس کے دکھ درد اور غموں سے نجات دلانے کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ اشتراکیت کا خوش آئند تصور ہے کوئی مذہب و ملت انسان کے دکھوں کا مداوا نہ کر سکی اور

آدمی منت کش ارباب عرفاں ہی رہا
درد انسانی مگر محروم درماں ہی رہا

مجازؔ کے اس فکری سفر کی آخری منزل "فکر" ہے جس میں تیغ و تفنگ اور آگ و خون کی باتیں کرنے والے شاعر کو اپنے مٹ جانے و برباد جہاں ہو جانے کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی فکر کی بلندی ہے کہ زیاں کا احساس اس کے دل میں جاگزیں نہیں ہونے پاتا۔ بلکہ زندگی کے اس پیچیدہ موڑ پر بھی جنون تعمیر کار فرما نظر آتا ہے اور اپنے خون دل کے آخری قطرہ کو بھی

نذرِ چمن بندیِ دوراں کر دینا چاہتا ہے۔

"فکر" کے بعد مجاز کی کوئی قابلِ ذکر نظم نہیں ہے۔ مجاز کے ذہنی و فکری ارتقا کے سلسلہ سے ان کے ۱۷۔۱۸ سال بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ جس میں اُن کی عشقیہ شاعری اور انقلابی شاعری دونوں کے رنگ بھرپور انداز میں نظر آتے ہیں۔ اکثر نظموں میں رومانیت اور انقلابیت کا حسین امتزاج ملتا ہے:

"مجاز کی ابتدائی شاعری کی رومانیت آہستہ آہستہ انقلابی رومانیت میں تبدیل ہوتی رہی۔ وہ اکثر و بیشتر صحت مند اور زندگی بخش رہی۔ اس نے مجاز کو گرفتار نہیں رکھا بلکہ اُن کے جوش اور ولولے کو مہمیز کرتی رہی ۔ ۔ ۔ ۔ اس رومانیت نے شعور کی مختلف منزلوں میں مجاز کی شاعرانہ حِس اور سماجی بصیرت کا ساتھ دیا۔ ارتقاءِ شعور کی یہ رفتار عام ہے چونکہ شاعرانہ حُسن اور فنکارانہ رنگینی کے ساتھ پیش ہوئی ہے اس لیے نوجوان نسل کی امنگوں اور خواہشوں کامیابیوں اور ناکامیوں، ہزیمتوں اور فتحمندیوں کی آئینہ دار بن گئی۔"[1]

مجاز کے ذہنی و فکری ارتقا میں ان کا رومانی انداز اہمیت رکھتا ہے۔ اُن کے ذہن پر جوانی کے خواب اور آرزومندی کے نقوش بہت گہرے تھے۔ لیکن اس آرزومندی کے ساتھ ساتھ ان کا بیدار ذہن زندگی کی حقیقتوں کو بھی اپنی شاعری میں اسیر کرنا چاہتا تھا لہٰذا مجاز کے بربط سے جو نغمے نکلے اس میں اپنے دور کا کرب، ماضی کی یادیں اور نقوش، حال کا انتشار مستقبل کے خواب اور نئے دور کی تمنائیں شروع سے آخر تک کروٹیں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجاز کے جمالیاتی شعور نے اُن کی شاعری کو ایک ایسا آہنگ عطا کیا جس سے ان کا نغمہ کبھی بے اثر نہیں ہونے پایا:-

"مجاز سے حقیقت اور رومان سے انقلاب تک جو فاصلہ ہے اسے مجاز نے چند ہی قدموں میں طے کر لیا۔ ان کی

---

[1] عکس اور آئینے۔ از سید احتشام حسین۔ ص ۱۹۷

شاعری میں ذہنی ارتقا کے نقوش ضرور ملتے ہیں۔ لیکن شروع ہی سے اس میں فنی اعتبار سے کافی پختگی پائی جاتی ہے۔ مجاز کی شاعری میں دو ملتے ہوئے جگوں کی پرچھائیاں ایک دوسرے کو کاٹتی نظر آتی ہیں۔ ایک نسل اپنی رومانی سرشاری کو دوسری نسل کی انقلابی آگہی کے حوالے کر دیتی ہے۔ لیکن ان ملے ہوئے رنگوں سے جو تصویر بنتی ہے وہ مجاز کی شاعری ہے۔ اس لیے اس میں نغموں کے آہنگ اور تخیل کی شب تابی کا امتزاج پایا جاتا ہے۔" [1]

---

[1] مجاز کی انقلابی رومانیت۔ حنیف فوق، مجاز ایک آہنگ۔ ص ۱۹

مجازؔ شباب اور انقلاب کا شاعر

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ

مجازؔ

"اس کے کلام میں خطیب کے نطق کی کڑک نہیں ـــ باغی کے دل کی آگ نہیں ـــ نغمۂ سنج کے گلے کا دھوکہ ہے...."

فیضؔ

تصورِ عشق

عورت کا تصور

تصورِ انقلاب

تصورِ عشق ۔ جذبۂ عشق و محبّت عین فطری کا ہے جو تقریباً ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ اس جذبہ نے اس دنیا میں کیا کچھ نہیں کیا، کبھی مجنوں بن کر صحرانوردی کی کبھی فرہاد بن کر جوئے شیر کے لیے تیشہ زنی کی اور کبھی منصور بن کر دار پر چڑھ گیا۔ اکثر یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات اسی جذبے کے گرد گھوم رہا ہے۔ کہیں انسان سے انسان کی محبت۔ کہیں دوست یاروں کی محبت۔ کہیں ماں باپ، بھائی بہنوں کی محبت۔ اِن سب کے علاوہ عشق و محبّت کی ایک اور حسین دنیا ہے جہاں محبوب کی محبت پروان چڑھتی ہے۔ جہاں ہجر و وصال کے لطف، جہاں عشق کی سختیاں جھیلنے کے حوصلے اور وصال کی لذتیں ہیں۔ شاعر جس کی محسوسات کی دنیا عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اس جذبہ کو کچھ زیادہ ہی شدّت سے محسوس کرتا ہے اور شعور و وجدان کی کارفرمائی سے اس کے محسوسات شعری تخلیق کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ان میں دونوں کا توازن و تناسب ہی یہ طے کرتا ہے کہ اس کے جذبے میں کتنی شدّتِ احساس اور صداقت ہے۔ اور خارجی عناصر کا درک و شعور کس حد تک شامل ہے۔ وجدان کی کمی سے اشعار غنائیت سرمستی و کیف و انبساط سے محروم رہ جاتے ہیں جو شعر کی اوّلین خصوصیات میں سے ہیں۔ شاعر کے اندر یہ جذبہ خارجی حسین پیکروں کے تاثرات کی پیداوار ہوتا ہے۔ شاعر کے ذہن کے ان تاروں کو چھیڑتا ہے جن کی جھنکاریں اور ارتعاش الفاظ کے غنائی لباس پہن کر شعری پیکر کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ مجاز چونکہ فطرتاً زود احساس واقع ہوئے تھے ساتھ ہی اودھ کا وہ حسن پرور ماحول اس پر مستزاد شاعری کی حسین فضا سب نے اُن کی افتادِ طبع کے لیے مہمیز کا کام کیا اور شروع میں روایتی طور پر شاید تخیلی محبوب کے زیرِ اثر غزل کہنی شروع کی۔ ے

حُسن کو بے حجاب ہونا تھا ۔۔۔ شوق کو کامیاب ہونا تھا

یہ اُن کی کم عمری کی بے پروا اور بے فکرانہ اور خواب نما محبت ہے جس کا اظہار روایتی طور پر غزل کے ڈھرے پر ہوا ہے۔ اس میں ایک طرف تو حسن کے بے حجاب ہونے کی تمنا۔ ہجر میں کیف اضطراب خود کے عشق میں خراب ہونے پر فخر۔ نالوں کا نارسا ہونا۔ آہوں کا بے اثر ہونا۔ لیکن ان سب کے باوجود جذبہ خلوص ہے اور

لہجے سے نشاط و سرشاری ٹپکتی ہے۔ ہر پیکرِ حسین و جمال اسے شاہکار فطرت نظر آتا ہے اور وہ دردِ دل سے بے خبر ہو کر حسن کی رعنائیوں میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔

علی گڑھ کی آزاد فضا۔ میرس روڈ کا حسن پر ورنظارہ۔ عصری ادب و سیاست کے اثرات۔ مختلف الخیال اساتذہ وطالب علموں سے آزادانہ تبادلۂ خیال ساتھ ہی خوداعتمادی و خودداری کی فضا۔ سب نے ان میں شعوری بالیدگی عطا کرنی شروع کی اور اُن کے عشق میں والہانہ انداز کے ساتھ ہی ایک بانکپن کا اضافہ ہونے لگا۔ ؎

ہاں ذرا جراُت دکھا اے جذب دل
حُسن کو پردے میں اپنے ناز ہے
حُسن کو ناحق پشیماں کر دیا
اے جنوں! یہ بھی کوئی انداز ہے

اے نگاہ لطف مت اُٹھ۔ خوگر آلام رہنے دے
ہمیں ناکام رہنا ہے ہمیں ناکام رہنے دے
کسی معصوم پر بیداد کا الزام کیا معنی
یہ وحشت خیز باتیں عشق بدانجام رہنے دے

ان کی حُسن پرستی اس حد تک تھی کہ ایکبار بقول رضا انصاری، فرحت اللہ انصاری کے ساتھ ایک مردانہ حُسن و جمال پر فریفتہ ہو کر دلی تک گئے۔ جس نے راستے میں جذبات کے مارِدل کو اس طرح چھیڑ دیا کہ ایک پوری غزل ٹرین میں ہی کہہ ڈالی۔ ؎

تسکین دل محزوں نہ ہوئی وہ سعئ کرم فرما بھی گئے
اس سعئ کرم کو کیا کہیئے، بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

اُن کو اپنے عشق کی رسوائی کسی صورت گوارہ نہیں۔ یہاں تک دفورِ شوق میں ان بیکراں حُسن و جمال کی شان میں کوئی گستاخی کی تو مجال کیا ان کی عزت و توقیر میں خفیف سی ٹھیس یا کمی نہ ہونے پائی۔ یہ دوسری بات ہے کہ داد حُسن حاصل

شاعر کے ذوقِ جمال کا فطری تقاضا ہے اور مجاز نے اِن عذرا و وامق اور سلمائے اختر کے حُسن خداداد کی داد دی اور خوب دی ہے

کوئی آئینہ دارِ حُسنِ فارس کسی میں حُسنِ یونانی کے جوہر

کسی میں عکسِ معصومِ کلیسا کسی میں پرتوِ اصنامِ آذر

یہ شیریں ہے وہ نوشابہ ہے شاید نہیں یا فرقِ فرہاد و سکندر

یہ اپنے حسن میں عذرائے وامق وہ اپنے ناز میں سلمائے اختر

یہ تابانی میں خورشیدِ درخشاں وہ رعنائی میں اس سے بھی فزوں تر

ہنسی اس کی طلوعِ صبحِ خنداں نوا اس کی سرودِ کیفِ آذر

یہ شعلہ آفریں وہ برقِ افگن یہ آئینہ جبیں وہ ماہ پیکر

ادھر ہم نے اک آہِ سرد کھینچی

ہنسی پھر آ گئی اپنے کیے پر

۱۹۳۳ء میں ایک نظم "آج کی رات" سامنے آئی ہے جس میں ایک سچے رومانوی نوجوان کی روح کی سرشاری سرمستی و رنگینی و مسرت، زندگی کی حرارت اور اس کی اٹھان ملتی ہے۔ دلِ مجروح کو ایک بانکپن سے تسلی و تشفی دیتا ہے کہ اس نے دیکھا تو یہ انداز دگر آج کی رات۔ محبت کے تجربے سنگریزوں کو گہر اور ہر راہ گزر کو کہکشاں کا روپ دے دیتے ہیں جو اسے یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ع

کم ہے پہلے سے بہت دردِ جگر آج کی رات

اس کے عشق کی حرارت اور کیف ہے کہ در و دیوار سے سیلابِ نشاط امڈا آتا ہے جو اس کی نظر میں حُسن و جمال کی خیرگی و چمک پیدا کر دیتا ہے اور اس کی تصورّاتی دنیا روشن تر ہو جاتی ہے ؎

پھوٹ نکلا ہے در و دیوار سے سیلابِ نشاط

اللہ اللہ مرا کیفِ نظر آج کی رات

شبستانِ تجلی کا فسوں کیا کہیے

چاند نے پھینک دیا رختِ سفر آج کی رات

نور ہی نور ہے کس سمت اٹھاؤں آنکھیں

حُسن ہی حُسن ہے تا حد نظر آج کی رات

وہ تبسم ہی تبسم کا جمال پیہم

وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات

مجاز کی عشقیہ شاعری میں ماضی کا تسلسل، حال کا شعور اور مستقبل کے خواب ملتے ہیں جو روح عصر کے ترجمان ہیں اور ان کے اندر وہ آدمی جنم لیتا ہے جس کی تگ و دو سے کارخانۂ حیات کے ہر لمحہ کو حرارت نصیب ہوتی ہے۔ یہیں سے ان کی رومانی شاعری میں انقلاب کے عناصر شامل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے تخیل کی پرواز اور جذبے کی شدت میں اور تیزی آجاتی ہے اور بقول قاضی عبدالستار مجاز عشق کے شیشے میں کھینچ کر تلوار ہو جاتا ہے [۱]

اور اب مجاز کا تصور عرصہ دراز سے پلی ہوئی "ذاتی انا" کو ابھار کر "اجتماعی انا" میں تبدیل کر دیتا ہے اور اس کو زندگی کی بلندی عطا کرتا ہے۔ اس کی سوچ اجتماعی ہو جاتی ہے۔ دشت ظلمات اسے پیارے ہو جاتے ہیں اور دیر و کعبہ کا وہ قائل نہیں رہ جاتا ہے ؎

دیر و کعبہ کا میں نہیں قائل — دیر و کعبہ کو آستاں نہ بنا

مجھ میں روح سرمدی مت پھونک — رونق بزم عارفاں نہ بنا

دشت ظلمات میں بھٹکنے دے — میری راہوں کو کہکشاں نہ بنا

میری خودداریوں کا خون نہ کر — اس زمیں کو تو آسماں نہ بنا

پھر شورش دوراں میں وہ کیا کیا اور کیسی کیسی متاع حیات بھول جاتا ہے اور اپنے کو شدید ذہنی کوفت میں مبتلا پاتا ہے ؎

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے

وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدہ گریاں بھول گئے

اے شوق نظارہ کیا کہیے! نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں

اے ذوق تصور کیا کہیے ہم صورت جاناں بھول گئے

---

[۱] مجاز اور عشق از قاضی عبدالستار۔ مجاز ایک آہنگ۔ ص ۷۰۔

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

اس کا عشق عقل فتنہ انگیز سے شدید نفرت کرتا ہے کیوں کہ وہ اہل خرد کو زمانے کے بگڑتے حالات، سیاسی انتشار میں جوڑ توڑ کرتے دیکھتا ہے۔ وہ انھیں ہر انسانیت سے بیگانہ دیکھ رہا تھا۔ وہ صرف خواب عشرت کے مزے لینا چاہتے تھے اور حساس شاعر کو یہ حالات ایک کرب میں مبتلا کر رہے تھے اور اس کا عشق سرمستی کا رنگ اختیار کر لیتا ہے ؎

عشق ہی عشق ہے دنیا میری	فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
خواب عشرت میں ہیں ارباب خرد	اور اک شاعر بیدار ہوں میں

۱۹۳۵ء میں دہلی والے معاشقے میں چوٹ کھا کر اس کا سرکش عشق اپنے محبوب کے لیے نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے اور اس کی خاطر ممکن و ناممکن سب حاصل کر کے اس کے قدموں میں لا ڈالنے کے عزم کا اظہار کرتا ہے ؎

میں قسم کھاتا ہوں اپنے نطق کی اعجاز کی	تم کو بزم ماہ و انجم میں بٹھا سکتا ہوں میں
سر پہ رکھ سکتا ہوں تاج کشور نورانیاں	محفلِ خورشید کو نیچا دکھا سکتا ہوں میں
میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمھارے واسطے	دل بجھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں
تم اگر روٹھو تو اک تم کو منانے کے لیے	گیت گا سکتا ہوں میں آنسو بہا سکتا ہوں میں
جذب ہے دل میں مرے دونوں جہاں کا سوز و ساز	بربطِ فطرت کا ہر نغمہ سنا سکتا ہوں میں

ساتھ ہی وہ اپنے محبوب سے جرات مندانہ اقدام کا متمنی بھی ہے اور وہ اس سے خارزاروں میں ساتھ دینے کی توقع کرتا ہے اور تمام قید و بند اور آئین کہن کی ضابطہ بندیاں جو اس کی راہ میں حائل ہیں کو یک لخت توڑ دینا چاہتا ہے ؎

کون تم سے چھین سکتا ہے مجھے، کیا وہم ہے
خود زلیخا سے بھی تو دامن بچا سکتا ہوں میں

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں

دفن کر سکتا ہوں سینے میں تمھارے راز کو
اور تم چاہو تو افسانہ بنا سکتا ہوں میں

وہ اس بات کا متمنی ہے کہ دونوں مل کر ایک سماجی انقلاب تازہ تر پیدا کریں جس میں دو دلوں کی دھڑکنوں پر فرسودہ نظام کی بندشیں بے جا نہ ہو اور وہ دونوں آنے والے دور کے لیے چراغ راہ بن جائیں۔ ؎

تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوس نظر
مجھ کو دعویٰ کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

"نذر دل" کی اس جرأت رندانہ و مردانہ اور دہر پہ چھا جانے کے عزم رکھنے کے باوجود شاعر کو سماجی کشمکش اور بے جا پابندیوں کا مسلسل سامنا رہتا ہے اور اس کا بس ان پر چلتا نظر نہیں آتا۔ اس صورت میں اس کے اندر ایک مجبوری کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ اس کی ساری آہیں اور نغمے اس کے لیے باعث سکون نہیں بن سکتے۔ اور اس کے بربط سے وہ نغمہ نہیں نکل سکتا جو اس کے دل کی آواز ہے۔ ؎

میں آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا
سکوں لیکن مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا
کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے
جو گانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا
متاع سوز و ساز زندگی، پیمانہ و بربط
میں خود کو ان کھلونوں سے بھی اب بہلا نہیں سکتا

یہ عاشق اردو شاعری کا روایتی عاشق نہیں ہے کہ آہ و زاری میں مبتلا ہے اور محبوب کسی مجبوری کی بنا پر یا از خود التفات کی ایک نظر سے گریزاں ہے اور عاشق جاں باز دل کی دوکان سجائے کسی تیر نیم کش کا خواہاں ہے۔ اس کے برخلاف مجاز نے جس عاشق کا ذکر کیا ہے اس کو یہ یقین کامل ہے کہ اس کا محبوب اس سے

سچی محبت کرتا ہے جو ہزار دل میں عاشق کا ساتھ دینے کو تیار ہے لیکن عشق و محبت کی راہ میں حائل سماجی بندشیں اتنی شدید تر ہیں کہ اُن کے آگے طوفان و آندھی کی شدت بے معنی نظر آنے لگتی ہے اور باوجود عزم مصمم اور عشق کے جذبۂ صادق کے محبوب کے قصرِ حسین تک پہنچنا دشوار و محال ہو جاتا ہے۔ اور عاشق کی ان مجبوریوں کا مجازؔ نے بڑے دل گداز انداز میں اظہار کیا ہے۔ ؎

نہ طوفاں روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا
وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا
یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری
کہ اس کے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا
زباں پر بے خودی میں نام اس کا آہی جاتا ہے
اگر پوچھے کوئی یہ کون ہے بتلا نہیں سکتا
کہاں تک قصۂ آلامِ فرقت مختصر یہ ہے
یہاں وہ آ نہیں سکتی وہاں میں جا نہیں سکتا
حدیں کچھ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ مجرم بے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

مجازؔ نے جس عشق کا تصور پیش کیا ہے وہ ارضی ہے۔ اس کا عاشق اپنے محبوب سے شاکی نہیں ہے بلکہ اس کو معشوق کی مجبوریوں کا احساس ہے۔ اس لیے اسے اگر شکوہ ہے تو اُس وقت کی سماجی و معاشرتی بندشوں سے جہاں معصوم عشق و محبت کو گناہ سمجھا جاتا ہے اور دل کی دھڑکنوں پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ عاشق کی تمام تمناؤں اور آرزوؤں کا ان حالات میں خون ہونا فطری ہے:۔

واقف رائے بریلوی کی زبان میں ؎

یہ مذہب کی فرقہ بندی سودے بازی آنہ پائی
معصوم محبت پر قیدیں دل کی دھڑکن پر پابندی

انجام پھر اس کا کیا ہوگا میں کیا جانے کس سوچ میں تھا

یہ مارے باندھے کی شادی جلاد نما باپ اور بھائی
گھونگھٹ میں سسکتی آشائیں آنگن میں سریلی شہنائی

انجام پھر اس کا کیا ہوگا میں کیا جانے کس سوچ میں تھا

اسی کرب و بے چینی کے ردّ عمل میں نسل و ملت کے فرق کو مٹا کر اس عاشق کے دل میں "نورا" کی محبت جنم لیتی ہے۔ لمحاتی طور پر ہی سہی مداوائے درد جگر بنتی ہے ؎

وہ نوخیز نورا وہ بنت مریم!!!	وہ مخمور آنکھیں وہ گیسوئے پُرخم
وہ ارضی کلیسا کی اک ماہ پارہ!!!	وہ دیر و حرم کے لیے اک شرارہ
وہ فردوس مریم کا اک غنچۂ تر!!!	وہ تثلیث کی دختر نیک اختر
وہ اک نرس تھی چارہ گر جس کو کہیے	مداوائے درد جگر جس کو کہیے

لیکن وقت کی گردش اور زمانے کی ستم رانیاں عاشق کو چین نہیں لینے دیتیں اور اسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنی حسن و مسرت کی دنیا کو خیر باد کہہ کر کہیں اور اپنی منزل کی تلاش کرے۔ عاشق اپنے حسن کی جولان گاہ کی مدح سرائی کرتے ہوئے اک انجانے رستہ کی طرف چل پڑتا ہے ؎

معبد حسن و محبت بارگاہ سوز و ساز
تیرے بت خانے حسیں تیرے کلیسا دلنواز

ذکر یوسف کا تو کیا کیجے تری سرکار میں
خود زلیخا آکے بکتی ہے مرے بازار میں

جنتیں آباد ہیں تیرے در و دیوار میں
اور تو آباد خود شاعر کے قلب زار میں

اس محفل حسن کے چھوٹ جانے کے بعد بھی وہ برگشتہ خاطر نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہے اور کسی صورت بھی یہ کبھی دمایوسی کا شکار نہیں بلکہ

اس میں ایک تیاگی کا سا ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے ؎

محفلِ ساقی سلامت بزمِ انجم برقرار

نازنینانِ حرم پر رحمتِ پروردگار

یاد آئے گی مجھے بے طرح یاد آئے گی تو

عین وقتِ مے کشی آنکھوں میں بھر جائیگی تو

کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں

چھوڑ کر خلدِ علی گڑھ کی ہزاروں محفلیں

کتنے رنگیں عہد و پیماں توڑ کر آیا تھا میں

دلنوازانِ چمن کو چھوڑ کر آیا تھا میں

اک نشیمن میں نے چھوڑا اک نشیمن چھٹ گیا

ساز بس چھیڑا ہی تھا میں نے کہ گلشن چھٹ گیا

دل میں اک سوزِ غم کی دنیا لیے جاتا ہوں میں

آہ تیرے میکدے سے بن پیے جاتا ہوں میں

ساتھ ہی عاشق کے دل میں یہ خواہش بھی ہے کہ اس محفل میں ایک بار پھر باندازِ دگر لوٹ کر آئے اور وہ گردشِ ایام سے شکستہ خاطر نہیں ہے بلکہ اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس کے اندر ان پر ضربِ شدید لگانے کا عزم جاگ اٹھتا ہے اور اسے اپنے اندر برق و شعلے کی تپش محسوس ہوتی ہے اور یہ شرارے آگ میں تبدیل ہو جانے کے لیے بیتاب نظر آنے لگتے ہیں ؎

آہ وہ چکر دیے ہیں گردشِ ایام نے

کھول کر رکھ دی ہیں آنکھیں تلخیٔ ایام نے

فطرتِ دل دشمنِ نغمہ ہوئی جاتی ہے اب

زندگی اک برق اک شعلہ ہوئی جاتی ہے اب

سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤں گا

لالہ زارِ رنگ و بو میں آگ بن کر آؤں گا

اس آگ کی تپش خود عاشق کے دل کے شکستہ کر دیتی ہے حسن کے تیور

اب بھی اسے عزیز ہیں۔ وہ اپنے محبوب کے حکم اور تقاضوں کو ٹھکرا نہیں سکتا۔ اور جب وہ معشوق کے اصرار پر دل کے ساز کو چھیڑتا ہے تو اس میں سے نغمۂ وفا کے بجائے ؎

یاس کا دھواں اٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی بربط شکستہ سے

یہ تار ابھی ٹوٹ کر پوری طرح بکھرے نہیں تھے اور نہ ہی یہ بربط پوری طرح شکستہ ہو گیا تھا۔ بلکہ ان ٹوٹے ہوئے تاروں سے بھی ایک نغمہ پھوٹ نکلا تھا جو ایک ٹوٹے ہوئے اور ٹھکرائے ہوئے دل کی صدا تھی جو غم عشق و غم حیات کے کرب میں ڈوب کر نکلی تھی یہ آواز اپنے عہد کے اُس آوارہ مزاج عاشق کی ہے جو اپنے جانے پہچانے شہر جہاں اس کے دل کی دنیا آباد تھی غیر کی بستی محسوس کر رہا تھا۔ جاگتی جگمگاتی سڑکیں اسے ویران نظر آ رہی تھیں اور رسوائیوں کا خوف اسے سراسیمہ کیے ہوئے تھا لیکن وہ عشق کی منزل کا ایسا راہی تھا جو راستے میں رک کے دم لینے کا عادی نہ تھا۔ ساتھ ہی اسے اپنی تنہائی کا بھی شدید احساس تھا اور پاس وفا اسے کسی اور در کی طرف لے جانے میں مانع تھی۔ ؎

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفان بلا میرے لیے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے

پر مصیبت ہے مرا عہد وفا میرے لیے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اسی کے ردِّ عمل میں ایک مرتبہ جھنجھلا کر عہد وفا کو توڑ دینے کی بات بھی اسکے ذہن میں آتی ہے۔ لیکن معاً اسے اپنے عہد کے اُن حالات کا خیال آتا ہے جس کی وجہ سے اس کی یہ ...... نوبت ہوئی ہے اور ان کو لعنت ملامت کرنے لگتا ہے اور عہد وفا توڑنے کا خیال پس پشت چلا جاتا ہے اور باغی و سرکش عاشق سامنے آجاتا ہے ؎

جی میں آتا ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

تمام ناکامیوں، محرومیوں اور مجبوریوں کے باوجود جب عاشق کو اپنی محبوبہ کا خیال آتا ہے تو وہ اس سے شکوہ و شکایت کرنے کے بجائے زمانہ کی مجبوریوں سے جو سدّ راہ بنی رہیں شکوہ کرتا ہے۔ نظام زنگ آلودہ اور آئین فرسودہ کو نشانہ ملامت بناتا ہے اور اپنے لہجے سے اپنی محبوبہ کے لیے کہیں بھی تلخی کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ ؎

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی ان زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوقِ رسوا کی پذیرائی
مجھے شکوہ نہیں ان پاک باطن نکتہ چینوں سے
لبِ معجز نمانے جن کے مجھ پر آگ برسائی

مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے ان پاسبانوں سے
نہ لینے دی جنھوں نے فطرتِ شاعر کو انگڑائی
مجھے شکوہ نہیں ان صاحبانِ جاہ و ثروت سے
نہیں آئی مرے حصہ میں جنکی ایک بھی پائی

زمانہ کے نظام زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانین کہن آئین فرسودہ سے شکوہ ہے

غم عشق میں اسی نظام زنگ آلودہ کے قوانین کہن اور آئین فرسودہ کے ہاتھوں وہ اذیتیں اور ہزیمتیں اٹھانی پڑیں وہ ٹھوکریں کھانی پڑیں کہ اس میں عشق کے اظہار کی بھی تاب نہ رہ گئی اور وہ عشق سے گریزاں نظر آنے لگا اور اسنے عشق میں عمومی و اجتماعی رنگ بھرنا شروع کر دیا۔ اس کی سرکشی اور بانکپن ایک باغی عاشق کے روپ میں سامنے آیا ہے

جوانی بھی سرکش محبت بھی سرکش
وہ زندانیٔ زلف پیچاں نہیں میں
تڑپ میری فطرت تڑپتا ہوں لیکن
وہ زخمیٔ پیکان مژگاں نہیں میں
دھڑکتا ہے دل اب بھی راتوں کو لیکن
وہ نوحہ گرِ دردِ ہجراں نہیں میں

ایک وقفہ کے بعد جب وہ اپنی محبوبہ کو بدلے ہوئے حالات میں اپنی طرف ملتفت پاتا ہے تو اپنے پاس اُن گنج ہائے گراں مایہ کی کمی محسوس کرتا ہے جن کو نذر محبوب کر سکے یا اس پر نچھاور کر سکے۔ وہ اپنی زندگی کا حسن، معصومیت اور بانکپن کچھ بھی تو اپنے پاس محسوس نہیں کرتا اور نظم "اعتراف" اس کا اعتراف شکست بن کر سامنے آئی ہے۔ وہ اپنے محبوب کو بے وفا ستم شعار نہیں بتاتا بلکہ از خود تسلیم کرتا ہے ع

میں وفادار نہیں ہاں میں وفادار نہیں

وہ اپنی زندگی کا صحیح مفہوم کھو چکا ہوتا ہے اور گداز دل مرحوم اور جذبۂ معصوم کی کمی کا معترف ہے سے

وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں

میں وفادار نہیں ہاں میں وفادار نہیں

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

مٹ کے برباد جہاں ہو کر بھی عاشق میں احساس شکست نہیں ہونے پایا اور تازہ مضمون تعمیر کی کارفرمائی نے اس کے دل کو آماجگہ یاس نہیں ہونے دیا۔ اور ساتھ ہی یہ خواہش دل میں جاگزیں رہی کہ ہاتھ رکھ دے مرے ماتھے پہ کوئی زہرہ جبیں۔ لیکن عاشق کا یہ خواب بار آور نہ ہو سکا اور اس کی اس دشوار گذار منزل کے لیے ایک حسین بازوئے سیمیں کے سہارے کی تمنا اور اس کی تلاش عاشق کی قسمت بن گئی اور وہ عاشق جس نے زندگی کے آخری لمحوں تک زہرہ جبینوں سے شکوہ کرنا اپنی شان کے خلاف جانا تھا ایک لطیف انداز میں شکایت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا

جل بجھے کتنے خلیل آگ گلستاں نہ بنی

ٹوٹ جانا درِ زنداں کا تو دشوار نہ تھا

خود زلیخا ہی رفیق مہِ کنعاں نہ بنی

زلیخا کی بے وفائی بھی اس کے جنون شوق کو کم نہ کر سکی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ؎

اُدھر مشکوک ہے میری صداقت اِدھر بھی بدگمانی کم نہیں ہے

مجموعی طور پر مجاز کا عاشق بیدار باشعور و سرکش نوجوان کے روپ میں ابھرتا ہے جس کی نظر میں رہ گذار عشق کہکشاں اور خار زارِ غم خلد بریں ہیں۔ اور یہی تیور آخر تک باقی رہتا ہے کیوں کہ یہ رجائی عناصر اس کے سیاسی و سماجی شعور کی دین ہیں جو اسے شاعر محفل وفا بنا دیتے ہیں ؎

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں

شاعرِ محفلِ وفا مطرب بزم دلبراں

اس عاشق کی محبوبہ نہ اردو شاعری کی بیچ کی صنف ہے اور نہ اختر شیرانی کی محبوبہ کی طرح سماوی ہے بلکہ ارضی ہے اور اسی دنیا کی جیتی جاگتی عورت ہے جو زمانے کے حالات اور ماضی کی روایات سے مربوط ہے۔ وہ نہ تو اردو کی روایتی شاعری کے جبر وظلم ڈھانے والے محبوب کے روپ میں ابھرتی ہے نہ ہی شاہد بازاری کی طرح عشوہ وغمزہ سے عاشق کا دل جلاتی ہے بلکہ اس کی نکتہ دانیاں اسے حیران کر دیتی ہیں۔ وہ باشعور تعلیم یافتہ ہے۔ عصری آگہی کی کمی بھی نہیں ہے اور نہ وہ روایتی انداز میں عاشق کو دیکھ کر بے اعتنائی و بے التفاتی برتتی ہے۔ اس کے برخلاف حقیقی انداز میں اس کا خیر مقدم کرتی ہے اگر عاشق بیمار ہے تو اس کی عیادت کو آتی ہے اس کے دم واپسیں کا انتظار روایتی محبوب کی طرح نہیں کرتی ہے

بتاؤں کیا تجھے اے ہمنشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے پیکر حسن و لطافت ہے
بہشت گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اس کی

زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اس دنیا سے اکثر اس قدر آگے
مری تخئیل کے بازو بھی اس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اس کی

عورت کا تصور

اردو کی مروجہ شاعری میں لب و رخسار کا ذکر تو ضرور تھا لیکن محبوب کا واضح تصور شاذ تھا۔ رومانی لب و لہجہ اس حد تک شعر و ادب پر حاوی تھا کہ اقبال کو شاعری میں عورت کے ذکر سے ہی جیسے بغض رہا ہو کیونکہ جب انھوں نے پلٹ کر ماضی کے ادبی اثاثہ پر نظر ڈالی تو تمام شاعر و افسانہ نویس کے سر پر انھیں عورت سوار نظر آئی ہے

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اس لیے انھوں نے اس موضوع سے جیسے شعوری طور پر احتراز کیا ہو۔ اور نہ حقیقی عورت اور اس کے صحیح مقام کے لیے خامہ فرسائی نہیں کی۔ اس کے برعکس علی گڑھ میں جب تعلیم نسواں کا باقاعدہ انتظام کیا گیا تو اس کی خوبیوں کا ذکر کجا اکبر نے انداز میں طنز کے طور پر فرمایا ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی

قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین

پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

جوش کا اعلان کہ "کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب" بھی شباب کے اس رنگ کو نہ پیش کر سکا جو ایک حقیقی اور جیتی جاگتی تصویر کو ابھارتا ہے ہاں ان کا شباب طبقاتی سطح سے بلند ہو کر حسن کا متلاشی ضرور رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں "مہترانی" "جامن والیاں" اور "کوہستان دکن کی عورتیں" سامنے آتی ہیں لیکن یہاں بھی شاعر ان کے ظاہری حسن و شباب میں گم ہو گیا ہے۔ اپنے تمام تر انقلابی رجحانات کے باوجود وہ عورت کا مقام سیج کی زینت سے آگے نہ بڑھا سکے اُسے صرف عیش و عشرت کا سامان اور اس کے حسن کو سامان لطف و انبساط سمجھتے رہے اس کو مردوں کے دوش بہ دوش لا کر نہ کھڑا سکے اور نہ اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کر سکے۔ جوش کا تصور اس سمت میں ایک "انکور" کی حیثیت سے زیادہ نہیں ہے جو اس دور میں ایک جدت تنوع اور روایت سے بغاوت کی نشاندہی کرتا ہے۔

اختر شیرانی نے عورت کی عظمت کو پہچانا لیکن اس کی محبوبہ بھی حقیقی دنیا سے پرے آسمانی خواب ہو کر رہ گئی جس کے حسن کو سراہا جا سکتا ہے پرستش کی جا سکتی ہے اس سے عشق کرنے کا جرم کیا جا سکتا ہے لیکن صرف تخیل کی دنیا تک، حقیقت کی دنیا میں تو صرف اس کی پیکر تراشی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اختر

شیرانی اس دنیا سے الگ ایک خیالی دنیا میں عورت کو صرف اذن بیداری، محرکِ شعر و شباب اور سرشاریٔ دل و دماغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں ؎

تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
شبستانِ جوانی کا تو ایک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارہ ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ
پری و حور کی تصویرِ نازنین عذرا
شہیدِ جلوۂ دیدار کر دیا تو نے
نظر کو محشرِ انوار کر دیا تو نے
بہار و خواب کی تنویرِ مرمریں عذرا
شراب و شعر کی تفسیرِ دلنشیں عذرا
دل و دماغ کو سرشار کر دیا تو نے
شباب و عشق کو بیدار کر دیا تو نے
مری حسیں مری نازآفریں عذرا

جنسی محبت اور اس کے جذبے کا اظہار کوئی مجرمانہ فعل نہیں لیکن یہی تو سب کچھ نہیں۔ عورت کو صرف سرشارِ محبت رکھنے، سر آنکھوں پر بٹھائے رکھنے اور زینتِ خانہ بنائے رکھنے سے تو اسے اس کا مقام نہیں ملتا وہ تو زندگی کے ہر مرحلے میں مرد کے ساتھ کاندھا ملا کر آدھا بوجھ اٹھانے کے لیے بیتاب نظر آتی ہے۔ وہ ہر شعبۂ حیات میں برابر کی حقدار ہے۔ یہی اس کا مقام ہے جس کو مجازؔ نے پہچانا تھا۔ اس میں اُن کے اپنے خاندان کی روشن خیالی اور جدید تعلیم سے آراستگی کا ہاتھ تھا۔ مجازؔ کے والد نے زمیندارانہ ماحول میں اس وقت کے لحاظ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنے بچوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوائی جن میں مجازؔ کی بہنیں بھی شامل تھیں جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ تعلیمِ نسواں کا تصورِ مجازؔ

کے ذہن میں کس قدر صاف اور روشن رہا ہوگا۔ پھر علی گڑھ میں تعلیم نسواں کے لیے گرلس کالج کا قیام۔ پردے کی بے جا قیود و بند سے آزادی کا رجحان اور اس کی سماجی کشمکش۔ ترکی کا انقلاب اور اس میں عورتوں کی دلیرانہ مردوں کے دوش بدوش شمولیت (کیوں کہ ترکی اس وقت مسلمانان ہند کے نزدیک ایک مثالی حیثیت رکھتا تھا) اسی زمانے میں یونین کی طرف سے ترکی مجاہدہ خالدہ خانم کو استقبالی دعوت دیا جانا۔ یہ سارے عناصر مجاز کے عورت کے تصور کو واضح شکل دینے میں معاون ثابت ہوئے۔

مجاز کے عورت کے تصور کو واضح کرنے میں ایک عنصر اور خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مجاز نے اپنے دور میں بیشتر ایسی خواتین کو کارزار حیات میں عملی طور پر حصہ لیتے بہت قریب سے دیکھا تھا جن کی نسائیت بھی قائم تھی اور سماجی مرتبہ بھی برقرار تھا۔ ان میں عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، ڈاکٹر رشید جہاں، سروجنی نائیڈو اور پنڈت وجے لکشمی وغیرہ قابل ذکر ہستیاں ہیں اور عورت کے تصور کو مکمل ترین روپ میں انھوں نے دلی میں زہرہ جبیں کی صورت میں دیکھا جو ان کے اس ضمن کے کلام کا نچوڑ ہے:

"عام یقین ہے کہ اگر عورت گھر سے نکل کر کام کاج شروع کر دے تو اس کی نسائیت اور حسن مارا جاتا ہے وہ بالکل کاروباری اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہے اس میں نسوانیت اور لطافت نہیں رہتی۔ مجاز کی رائے میں حسین شے خواہ باہر رکھو چاہے اندر حسین ہی رہے گی ــــ بات یہ ہے کہ مجاز نے ایسی مثال بھی دیکھی ہے جہاں عورتیں تعلیم یافتہ بھی ہیں دنیا کے کاموں میں حصہ بھی لے رہی ہیں اور نسائیت سے بھی محروم نہیں ہوئیں ... باوجود کہنہ خیال لوگوں کی چیخ پکار کے مجاز کے تخیل کی عورت نے دنیا میں قدم رکھ دیا ہے اور قدم بڑھائے چل رہی ہے اور مجاز کی اس سے التجا کہ ؎

سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا

یہی واضح تصور ان کی ارضی دنیا کی عورت کی پیکر تراشی اور حقیقی تصویر کشی میں معاون ہوا حالانکہ ابتدا میں ان کی شاعری میں بھی اختر شیرانی کی پیکر تراشی کا پرتو نظر آتا ہے۔ مثال کے لیے ان کی نظم "نمائش"، "نورا"، "بتان حرم" وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

مجاز کی نظم "نمائش" عاشق کے عنفوان شباب کی نشاندہی کرتی ہے جہاں ایک الہڑ نوجوان دارفتہ حسن ہوکر حسین شے کے پیچھے دوڑتا ہے۔ لیکن ابھی وہ عشق کی اس خلش درد سے آشنا نہیں ہے جو عاشق کو جینے سے زندگی بسر کرنا مشکل کر دیتا ہے لیکن رفتہ رفتہ شاعر کے دل میں معشوق کی محبت کی آرزو سر ابھارتی ہے اور وہ خراب محبت ہونا چاہتا ہے جو اسے ایسی خطائیں سرزد کرائے تاکہ وہ سزا سے لطف اندوز ہو سکے، نتیجہ میں خراب محبت ہونے کی خواہش اور بڑھ جاتی ہے۔ اور وہ ہر لمحہ اس انتظار میں رہنے لگتا ہے کہ کب پیغام محبت سنائی دے۔ ؎

خطاؤں پہ جو مجھ کو مائل کرے پھر
سزا اور ایسی سزا چاہتا ہوں
وہ مخمور نظریں وہ مدہوش آنکھیں
خراب محبت ہوا چاہتا ہوں
وہ آنکھیں جھکیں وہ کوئی مسکرایا
پیام محبت سنا چاہتا ہوں

جلد ہی مجاز کی اس عورت کا تصور سامنے آتا ہے جو دوشیزگی کی بے پروا منزل سے گزر کر ایک ایسے موڑ پر آجاتی ہے جہاں اس کے جذبات کے طوفان اس کی خلش اس کے حسین خواب آنکھوں سے چھلکنے لگتے ہیں اور اس پیکر حسن خداداد کو دیکھ کر شاعر بے اختیار اس کے شباب کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگتا ہے۔ ؎

ہر سانس میں احساس فراواں کی کہانی

خاموشیٔ محجوب ہیں اک سیلِ معانی
جذبات کے طوفان میں ہے دوشیزہ جوانی

فطرت نئے جذبات کے در کھول رہی ہے
میزانِ جوانی میں اسے تول رہی ہے
لب ساکت و صامت ہیں نظر بول رہی ہے

اے تو کہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی
ہو تجھ کو مبارک یہ تری نو جوانی
آزار سے محفوظ رہے تیری جوانی

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

اتنا ہی نہیں کہ شاعر اس کے زورِ شباب کی افزونی کی دعائیں دیتا ہے بلکہ اس کی وفائیں اس دلکشی و سحر آفریں حسن کے قدم چومنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ ؎

سرشار نگاہوں میں حیا جھوم رہی ہے
ہیں رقص میں افلاک زمیں گھوم رہی ہے
شاعر کی وفا بڑھ کے قدم چوم رہی ہے

اس شاعرِ وفا کو اپنی محبوبہ کی محبت کا اتنا پاس ہے کہ اس کے لیے سب کچھ کر گذرنے کے لیے عہد و پیمان باندھتا ہے اور اپنی ساری سرکشی کے باوجود اس کی راہوں میں اپنا دل اور اپنی آنکھیں بچھانے کو تیار ہے۔ اگر اس کی محبوبہ روٹھ جائے تو جانتا ہے کہ وہ اسے گیت گا کر آنسو بہا کر یا بربط فطرت کا ہر نغمہ سنا کر منا سکتا ہے اور منا لینا چاہتا ہے ؎

اپنے دل کو دونوں عالم سے اٹھا سکتا ہوں میں
کیا سمجھتی ہو کہ تم کو بھی بھلا سکتا ہوں میں
دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں

اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں

میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے

دل بچھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں

مجاز کا یہ خیال کہ عورت صرف چراغ خانہ ہی نہیں بلکہ وہ اپنے حسن کی تابانی سے شمع محفل بھی بن سکتی ہے "نذر دل" میں کھل کر سامنے آیا ہے۔ شاعر کا خیال غالب ہے کہ محبوبہ کے حسن کی گرمی شاعر کے جذبے کی صداقت اور محفل پہ چھا جانے کا عزم یک جا ہو کر کوئی بھی کار گراں انجام دے سکتے ہیں اور دعوت عام دیتا ہے ؎

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں

دہر پہ اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مجبوریوں میں اس کا عزم اپنی محبوبہ کی بے بسی کی بنا پر ماند پڑتا نظر آنے لگتا ہے سماجی بندشیں ساتھ ہی دولت کی اونچ نیچ اسے کھلنے لگتی ہے۔ لیکن وہ ان تمام حدود کے باوجود جو ان حرم کے پاسبانوں نے کھینچ رکھی تھیں۔ نسل و ملت کا فرق کیے بغیر تثلیث کی دختر نیک اختر کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی عورت کا وہ پاکیزہ اور پر رعب تصور منتشر نہیں ہوتا اور اسکے حسن کی حکمرانی پوری دنیا پہ نظر آنے لگتی ہے ؎

وہ پر رعب تیور وہ شاداب چہرہ

متاع جوانی پہ فطرت کا پہرہ

سفید اور شفاف کپڑے پہن کر

مرے پاس آتی تھی وہ حور بن کر

وہ اک آسمانی فرشتہ تھی گویا

کہ انداز تھا اس میں جبریل کا سا

مجاز نے اپنی محبوبہ کو کبھی جنسی آسودگی کا سبب نہیں بنایا اس کی وجہ شاید ان کے اپنے کردار کی شرافت تھی جس نے ہمیشہ انھیں لذت پرستی اور سستی جنسیت سے باز رکھا۔ عورت کو تمام تر آزادی دلانے کے ساتھ ساتھ شرم و حیا کو عورت کا زیور سمجھتے

تھے اسی لیے جب وہ "نورا" کے لبوں سے ایک شے چرا لیتے ہیں تو شاید ان کے دل میں ساتھ ہی یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس کی اس حرکت سے ناراض ہوگی شرمائے گی لیکن جب وہ اس کے برعکس کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے تو انھیں شمع حیا بجھتی معلوم ہونے لگتی ہے۔ "نورا" کا حقیقت پسندانہ رد یہ مجاز کو ناگوار یا بار خاطر تو نہیں گزرا لیکن ان کی اپنی توقع سے ہم آہنگ ہوتا نظر نہ آیا جس کی وجہ سے انھیں شمع حیا بجھتی نظر آتی ہے ے

مہک گیسوؤں سے چلی آرہی تھی | مرے ہر نفس میں بسی جا رہی تھی
مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سوجھی | جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکا لی | لب لعل افشاں سے اک شے چرا لی
وہ شے جس کو اب کیا کہوں کیا سمجھیے | بہشت جوانی کا تحفہ سمجھیے
شراب محبت کا اک جام رنگیں | سبو زار فطرت کا اک جام رنگیں
میں سمجھا تھا شاید بگڑ جائے گی وہ | ہواؤں سے لڑتی ہے لڑ جائے گی وہ
میں دیکھوں گا اس کے بکھرنے کا عالم | جوانی کا غصہ بکھرنے کا عالم
ادھر دل میں اک شور محشر بپا تھا | مگر اس طرف رنگ ہی دوسرا تھا
ہنسی اور ہنسی اس طرح کھلکھلا کر | کہ شمع حیا رہ گئی جھلملا کر

اس واقعہ کے سلسلہ میں عصمت چغتائی نے مجاز سے وضاحت چاہی:-

"میں نے کہا۔ "نرس کی چارہ گری" میں آپ نے اس (قدامت پرستی) کا ثبوت دیا ہے کہ جب آپ "نورا" کے لبوں سے وہ لطیف شے چرا لیتے ہیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ زمانۂ قدیم کی معشوقاؤں کی طرح وہ شرما کر کچھ نخرہ کرے گی بگڑ جائے گی پر جب وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تو آپ کو وہ بے حیا معلوم دی کیوں کہ شمع حیا جسے آپ کی قدامت پرستی نے روشن رہنے دیا ہے وہ جھلملا کر رہ گئی"۔

بولے ۔ "شاید ایسا ہو۔ مگر شرمانے میں لازم نہیں کہ قدامت پسندی کا خلرشہ ہو۔"

میں نے کہا ۔ "شرمانے میں کوئی نقصان نہیں پر جب اسے قدرتی طور پر شرم نہیں آئی تھی اور صرف آپ کی خاطر سے وہ شرما دیتی تو ...... یہ تو ـ" "لاحول ولاقوۃ"

یکدر رہو کر بولے "یہ تو میں کبھی نہیں چاہتا تھا" [1]

جس الہڑ عورت کو وہ اپنے ہم دوش دیکھنا چاہتے تھے اس کی بھرپور تصویر خالدہ ادیب خانم میں انہیں نظر آتی ہے وہ جن تمام صفات و اوصاف کا تمنائی ہے خالدہ ان کا مجسمہ نظر آتی ہے ؎

خالدہ تو ہے بہشت تر کمانی کی بہار
تیری پیشانی پہ نورِ حریت آئینہ کار
تیرے رخ سے پرتوِ معصوم مریم آشکار
تیرے جلووں کی صباحت سے فرشتے شرمسار
گل پشیماں قلبِ بلبل رشک سے دو نیم
تیری باتوں میں خمار کوثر و تسنیم

مجاز نے سماج کی کشمکش، محبت کی راہ میں حائل دشواریوں کو دیکھ کر "نوجوان خاتون سے" (۱۹۳۷ء) میں اپنی تصوراتی عورت کو شعور کی روشنی بخشتے ہیں اور سارے مسائل زمانہ سے پیکار کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کی دنیا کی وسعت کو قصر و محل سے بڑھا کر ارض و سما تک پہنچا دیتے ہیں۔ سردار جعفری کا بھی خواتین کے نام ایک پیغام ہے جس میں مواد و خیالات یکساں ضرور ہیں لیکن اثرات کا فرق بہت واضح ہے ؎

اس نظامِ زندگی میں جس سے رسوا ہے حیات
تیری ہستی رقصِ عشرت کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنے ہونٹوں کے حسیں گلنار محرابوں سے پوچھ
ان میں بوسوں کی حلاوت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ تیرے ماتھے کا ٹیکہ یہ تیری زلفوں کا خم
کاروانِ رنگ نکہت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ ترے چہرہ کا غازہ یہ تیرے ہونٹوں کا رنگ
عشق کی نظروں کی دعوت کے سوا کچھ بھی نہیں

---

[1] عشقِ مجازی از عصمت چغتائی مجاز ایک آہنگ۔ ص ۲۵۵ - ۲۵۶

تیرے اعضا کی نزاکت تیرے پہلو کا گداز
مرد کے بستر کی زینت کے سوا کچھ بھی نہیں
جب تلک تو خود نہ توڑے گی طلسم رنگ و بو
تیری قسمت ایک عورت کے سوا کچھ بھی نہیں
(علی سردار جعفری)

اور مجاز کے یہاں درد داشتم کی تصویر بڑے لطیف انداز میں پیش ہوئی ہے :-

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
تری چین جبیں خود اک سزا قانون فطرت ہے
اسی شمشیر سے کار سزا لیتی تو اچھا تھا
ترے زیر نگیں گھر ہو محل ہو قصر ہو کچھ ہو
میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے کا ٹیکہ مرد کی قسمت کا تارا ہے
اگر تو ساز بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اس آنچل کو پرچم بنانے کی خواہش رکھنے کے باوجود وہ جس عورت سے محبت کرتا ہے وہ سرکش ہونے کے ساتھ ساتھ بے باک نہیں ہے بلکہ اس کی نسوانیت اس کا حسن اور دل کشی برقرار ہے اس میں مریم کا سا تقدس ہے حیا اور پاکیزگی اس کی شان ہے جس کے لب پر نہ لاکھا ہے نہ اس کے رخساروں پر غازہ ہے۔ نہ ہی وہ غیر ضروری دنیاوی زیبائشوں سے آراستہ ہے بلکہ اس کا حسن حقیقی اس کی جوانی اور تبسم ہی اس کا سنگھار ہے۔ مجاز کی تمثالی عورت کا مکمل پیکر اس کی نظم "کس سے محبت ہے" میں نظر آتا ہے :-

جبیں پر سایہ گستر ہے تو قندیل رہبانی

عذارِ نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی
قدم پر لوٹتی ہے عظمتِ تاجِ سلیمانی
ازل سے منتقد ہے محفلِ نورانیاں اس کی

مجاؔز اس کی عظمت و تقدیس کے نغمے گاتے ہیں اور اکثر وہ ان کی نظر میں اتنی عظیم تر ہو جاتی ہے کہ شاعر کا تخیل بھی اس کا احاطہ نہیں کر پاتا ہے

زباں پہ ہیں ابھی تک عظمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اس دنیا سے اکثر اتقدر آگے
مری تخئیل کے بازو بھی اس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں حکمت دانیاں اس کی

لیکن مجاز کی عورت اتنی مقدس باعصمت شریف النفس اور اکثر اس کے اطلسم شاعر کے تخیل کی دنیا سے پُر ہونے کے باوجود اس کا دل محبت کے فطری جذبہ سے ہم آہنگ ہے کبھی وہ خود وفا شعار نظر آتی ہے کبھی عاشق کی وفاؤں کا امتحان لیتی ہے اور جب کبھی عاشق کو فکر مند پایا ہے اسے تسلیاں دی ہیں۔ اس کے اندیشے مٹائے ہیں جو مخصوص سماجی حالات کے تحت ایک متنوع اور سائنٹفک رویہ ہے:

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے مجھ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا ہے
میرا ہر شعر تنہائی میں اس نے گنگنایا ہے
سنی ہیں میں نے اکثر چھپ کے نغمہ خوانیاں اسکی

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں
مرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں
مری دنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اس کی

کوئی میرے سوا اس کا نشاں تک پا نہیں سکتا
کوئی اس بارگاہِ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا

جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اسکی

مجاز نے جس عورت کی محبت میں والہانہ سرشاری کے گیت گائے ہیں اور جسے آنچل سے پرچم بنا لینے کا مشورہ دیا تھا وہ عورت تمام تر سرکشی و تفاوت کے نظام فرسودہ سے برسر پیکار رہ کر بھی معاشرتی حدبندیوں کو نہ توڑ سکی۔ اس دور کی معاشرتی زندگی میں عصمت و پاکیزگی پردہ کی رسم سے جڑی ہوئی تھی۔ بے پردگی عورتوں کے لیے باعث شرم و ننگ سمجھی جاتی تھی اس خیال خام کی مجاز نے نفی کی ہے ؎

سر رہ گذر چھپ چھپا کر گذرنا
خود اپنے ہی جذبات کا خون کرنا
حجابوں میں جینا حجابوں میں مرنا
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

خیالات پیہم میں ہر وقت گم سم
دل نرم و نازک پہ ابر تو ہسم
بجھا سا تبسم گھٹا سا تکلم
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

نگاہوں کی دعوت کو پامال کرنا
مذاق لطافت کو پامال کرنا
تقاضائے فطرت کو پامال کرنا
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

قسم شوخیِ عشق ستجو گتا کی
قسم جنوں کے عزم صبر آزما کی
قسم طاہرہ کی قسم خالدہ کی
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

لہٰذا ان قوانین کہن سے لڑ کر حسن کے پیروں سے جبر حنابندی کو ہٹا دینا چاہتا ہے خواہ اس کار خیر کی خاطر اسے اس بزم ناز سے ہجرت ہی کیوں نہ

کرنی پڑے وہ پرانے رسم و رواج اور بوسیدہ آئین و شرع کے خلاف سینہ سپر رہے گا۔ ؎

ابھی تو حسن کے پیروں پہ ہے جبرِ حنا بندی
ابھی ہے عشق پر آئینِ فرسودہ کی پابندی
ابھی حاوی ہے عقل و روح پہ جھوٹی خداوندی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

مجاز کی وہ عورت جو انھیں حقیقی دنیا میں تو نصیب نہ ہو سکی لیکن اس کی حقیقی تصویر سے ان کی اپنی تخیل کی دنیا ہمیشہ آباد رہی وہ ان کو بے حد عزیز تھی۔ اور وہ اپنی اس متاعِ حیات کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ ؎

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فرازِ آسماں پر کہکشاں حسرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اٹھتی تھی اس کی چشمِ خنداں میں
خمستانِ فلک سے نور کی صہبا چھلکتی تھی
وہ جب ہنگامِ رخصت دیکھتی مجھ کو مڑ مڑ کر
تو خود فطرت کے دل میں محشرِ جذبات ہوتا تھا
وہ محوِ خواب جب ہوتی تھی اپنے نرم بستر پر
تو اس کے سر پہ مریم کا مقدس ہاتھ ہوتا تھا

یہی عورت جو ان کی محبوبہ بھی ہے عاشق کی اچانک آمد پر روایتی محبوبہ کی طرح ناز و نخرہ نہیں دکھاتی بلکہ مسرت و شادمانی کے ساتھ اُسے خوش آمدید کہتی ہے، خیر مقدم کرتی ہے اور وارفتگیٔ شوق میں سرشارِ محبت ہو کر فطری انداز میں پیش قدمی کرتی ہے۔ ایک واقعہ اس سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ نیا ادب کے حلقے کے ایک رکن جن کے سردار جعفری، مجاز اور سبطِ حسن وغیرہ سے دوستانہ مراسم تھے راوی ہیں کہ ایک بار مجاز لکھنؤ سے علی الصباح دہلی پہنچے تھے اور جہاں قیام کرتا تھا وہاں پہنچ کر دروازے پر دستک دی تو وہی خاتون دروازہ کھولنے آئیں

جس سے ان کا عشق چل رہا تھا یہ نظم اسی واقعہ کی یادگار ہے۔ ؎

خیر مقدم کو میرے کوئی بہ ہنگام سحر   اپنی آنکھوں میں لیے شب کا خمار آہی گیا

عورت کو یہ حقیقی مقام دلانے کی لگن مجاز کو نہ جانے کن کن خارزاروں میں لے گئی لیکن باوجود اپنے تمام آلام ومصائب، درد وکرب اور جنوں خیزی کے انھوں نے کہیں بھی اور کبھی بھی سپر نہیں ڈالی۔ اپنی ناکام محبت کی یادوں کو اپنے دماغ سے نہ نکال سکے، وہی عورت ان کے حسن وعشق اور جذباتی محبت کا محور بنی رہی ہے جس کو پانے کی کوشش میں مجاز نے اپنے آپ کو اپنی ہستی کو برباد کر ڈالا اور حسن نے عنایت کی نظر ڈالی اور جذبۂ محبت کی صداقت کا اظہار کیا تو پانی سر سے گذر چکا تھا موت کی آواز پر سازِ زندگی چھیڑنے والا، حسن سے محبت کرنے والا شاعر بغیر اپنا ذہنی توازن کھوئے اعتراف شکست کرنے پر مجبور ہو گیا ؎

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو
میں نے مانا کہ تم اک پیکر رعنائی ہو
چمن دہر میں روح چمن آرائی ہو
طلعت مہر ہو فردوس کی برنائی ہو
بنت مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو

مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے

جرم وفا کا احساس اور جذبۂ معصوم کی کمی شاعر کو شدید کرب میں مبتلا کر دیتی ہے اور وہ اب خود کو الطاف وعنایات کا سزاوار نہیں سمجھتا، اور خود کہہ اٹھتا ہے ؎

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
مری فریاد جگر دوز مرا نالۂ زار
شدت کرب میں ڈوبی ہوئی مری گفتار

ؔ مجاز حیات وشاعری از منظر سلیم۔ ص ۱۴۸

میں کہ خود اپنے مذاق طرب آگیں کا شکار

وہ گداز دل مرحوم کہاں سے لاؤں

اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

میرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو

اپنی جرأت کی قسم اب مری جراءت سے ڈرو

تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو

میرے وعدوں سے ڈرو میری محبت سے ڈرو

اب میں الطاف عنایت کا سزاوار نہیں

میں وفادار نہیں ہاں میں وفادار نہیں

ان متذکرہ بالا نظموں کے علاوہ بعض دوسری نظمیں بھی ہیں جن میں ان کی عورت کی شخصیت و کردار کے بہت سے دلفریب و دلنواز پہلو نظر آتے ہیں۔ ان میں "ننھی پجارن"، "عیادت" اور "نادام" قابل ذکر ہیں۔ نظم عیادت میں ان کی وہ محبوبہ جو گلستاں میں ان کے دوش بہ دوش چلتی تھی عاشق کے سرہانے عیادت کو آتی ہے:-

پیشانی جمیل پہ انوار تمکنت — تابندگی صبح درخشاں لیے ہوئے

زلفوں کے پیچ و خم میں بہاریں چھپی ہوئی — اک کاروان نکہت بستاں لیے ہوئے

آہی گیا وہ میرا نگار نظر نواز — ظلمت کدہ میں شمع فروزاں لیے ہوئے

اک اک ادا میں سیکڑوں پہلوئے دلدہی — اک اک نظر میں پرسش پنہاں لیے ہوئے

"نادام" میں یہی عورت اپنی تمام تر رعنائی کے ساتھ شاعر کے سامنے آتی ہے:-

زلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لیے

لب پہ افسوں لیے آنکھوں میں مئے ناب لیے

ہر نفس رو میں لیے شورش طغیان نہاں

ہر نظر شوق کا افسانۂ بے تاب لیے

سحر و اعجاز لیے جنبش مژگان دراز

خندۂ شوخ جمال دُرِ خوش آب لیے

ضو فگن روئے حسین پر شب مہتاب شباب
چشم مخمور نشاطِ شبِ مہتاب لیے
نشۂ ناز جوانی میں شرابور ادا
جسم ذوق گہر اطلس و کمخواب لیے
زلف شبرنگ لیے صندل و عود و عنبر
خم ابروئے حسیں دیر کی محراب لیے
لب گل رنگ و حسین جسم گداز و سیمیں
شوخی برق لیے لرزشِ سیماب لیے
ایک صیادِ خوش اندام سواد مشرق
زلف بنگال لیے طلعت پنجاب لیے
نزہت و ناز کا ایک پیکرِ شاداب حسیں
نکہت و نور کا امڈا ہوا سیلاب لیے

مجاز نے اردو شاعری کو عورت کا وہ تصور دیا جو اس کے پہلے تو در کنار اس کے اپنے عہد میں کوئی ہم عصر اتنے واضح طور پر نہ دے سکا۔ آج جب کہ ترقی پسندی کے سارے خواب پورے ہوتے نظر آتے ہیں پھر بھی عورت کو اپنا حقیقی مقام عملی طور پر نہیں مل سکا ہے اور ابھی مجاز کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے ہیں۔ جوش جیسے عظیم انقلابی شاعر بھی عورت کے ساتھ جاگیردارانہ سلوک روا رکھتے ہیں وہ اسے خاتون مشرق اور چراغ خانہ بنے رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور دوسری طرف طبقاتی طلسم کو توڑ کر خالص شباب و عشق کی تسکین کی خاطر "مہترانیاں" اور "جامن والیاں" جیسی نظمیں لکھتے ہیں۔ وہ ان مہترانیوں اور جامن والیوں کو وہ مقام کبھی نہیں دیتے جو مجاز نے اپنی مثالی اور تصوراتی عورت کو دیا ہے جو کہیں عاشق کا خیر مقدم کرتی ہے کہیں اس کی عیادت کو آتی ہے۔ کبھی   اس کے دوش بر دوش انقلاب تازہ تر پیدا کرنے کے عزم کا اظہار کرتی ہے اور کہیں اس کی نکتہ دانیاں شاعر کو حیران کر دیتی ہیں۔ مجاز کی عورت ارضی ہے سماوی نہیں۔ اس جیتی جاگتی دنیا کا پیکر ہے جس میں سارے مساواتی درجے کے حصول کی تگ و تاز اور بغاوت کا عزم

رکھنے کے باوجود نسوانیت، معصومیت، حیا و رفاقت، دلداری اور تقدس کے زیور سے آراستہ ہے وہ اس کارزار ہستی میں اپنے عاشق کے قدم سے قدم ملا کر برسرپیکار رہے اور اپنے تمام تر حُسن رعنائیوں کے ساتھ اگر ضرورت پڑتی ہے تو مسائلِ زمانہ سے آئے ہوئے زخموں کا مرہم بھی بنتی ہے۔ تفکرات اور اندیشوں سے نجات بھی دلاتی ہے۔

مجازؔ کی شاعری کا محور یہی عورت ہے جو اس کی سب سے بڑی محرومی و تشنگی بھی رہی ہے لیکن اس کے ردِ عمل میں کہیں بھی اس کی عشقیہ شاعری میں جنسی لذت پرستی، گھٹن یا انتقام کا جذبہ کارفرما نظر نہیں آتا۔ یہ اس کی بلند کرداری اور اعلیٰ ظرفی تھی کہ اپنی تمام تر جنسی محرومیوں اور تشنگیوں کے باوجود شاعری کو سطحی جنسیت سے پاک رکھا اور عورت کو اس کے مثالی مقام سے گرنے نہ دیا۔ اور اس بات کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ مجازؔ نے عورت کی آزادی اور سماجی مساوات کا وہ تصور پیش کیا جو آج بھی دنیا کی اتنی ترقیوں کے باوجود عورت کو حاصل نہ ہو سکا۔ خاص طور سے اس کے اپنے معاشرے میں عورت اب بھی پسماندہ ہے لیکن مجموعی طور پر وہی تصور اس کے اپنے دور کے سب سے زیادہ آزاد اور بیباک شعور کی نشاندہی کرتا ہے اور ساتھ ہی آج عورتوں کے لیے کامل مساوات کے حصول میں سرگرم کارفرما ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجازؔ کا یہ خواب جلد ہی شرمندہ تعبیر ہو جائے گا۔ تاریخی و تہذیبی عوامل کی بنا پر اسی تصور نے اب عورت کے عالمی تصور کی شکل اختیار کر لی ہے۔

تصورِ انقلاب

یہاں کے شہریاروں کو خبر دو
کہ مردِ انقلابی آ گیا ہے

مجازؔ کے عاشق کے پیچھے ایک بیدار باشعور اور سرکش نوجوان تھا جسے ہر وقت یہ احساس رہتا ہے

خوابِ عشرت میں ہیں اربابِ خرد
اور اک شاعر بیدار ہوں میں

اس کی بیدار فطرت کو اس بات کا احساس تھا کہ حسن و عشق کی دنیا کے علاوہ ایک انسانوں کی بستی ہے، اور انسانیت جس کی متاع گراں ہے جہاں نوعِ انسان کی

پرستاری عظیم تر شے ہے:

حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں

مجاز کے انسانیت کا دم بھرنے کی وجہ غالباً اس زمانے کے عمومی حالات تھے۔ جس میں بین الاقوامی و بین الملکی سطح پر انسانیت کا خون بہہ رہا تھا۔ ایسے متضاد نظریات و تصورات جنم لے رہے تھے جس میں انسانیت ایک کشاکش میں مبتلا تھی۔ سیاسی، سماجی بحران، ذہنی کشمکش اور جد و جہد کے اس دور میں جہاں تہذیب معاشرہ اور انسان دوستی کو نقصان پہنچانے کے لیے کچھ طاقتیں درپے تھیں۔ وہیں صاحبانِ علم و ادب محافظ و معاون کی حیثیت سے جہاد پر آمادہ تھے۔ اردو ادب جو ہمیشہ زندگی اور ماحول کے دوش بدوش رہا ہے اور وقت کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھا ہے، اردو شاعری مسائلِ زمانہ کا احاطہ کرتی ہوئی بلند پروازی کی طرف مائل تھی لیکن قدم قدم پر نظریاتی اختلافات اور ان کا تصادم تھا۔ یہ متضاد کیفیت ہر سطح پر رجعت اور انقلاب کی جنگ تھی۔ نوح، اصغر اور جگر کی شاعری اپنے تمام تر حسن کے باوجود جاں بر ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی اس کے برعکس انقلاب کا جو سلسلہ اقبال، چکبست، حسرت اور جوش سے شروع ہوتا تھا جس میں جوش کو سب سے نمایاں حیثیت حاصل تھی وہ قوم کے دل میں سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت اور بغاوت پیدا کرتے اور انقلاب کی دعوت دیتے تھے اور ان میں یہ حوصلہ پیدا کرتے تھے کہ: ؎

گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب آنسو بہاتا تھا

ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی

مجاز بھی اس انقلابی فضا میں سارے قید و بند توڑ کر وطن کے آفتابِ حریت کے جگمگانے کے خواب دیکھنے لگے اور اس خواب کی تعبیر کے لیے تمام رکاوٹوں اور دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ اسکے دل کی تڑپ غلامی کی زنجیریں توڑنے اور نظامِ پارینہ کو ایک نظامِ نو سے تبدیل کرنے کے جذبے سے سرشار ہے وہ سماج کے مظالم فریب دریا اور طبقاتی کشاکش کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں انقلاب کا ایسا تصور ابھرنے لگتا ہے جہاں عدل و انصاف، محبت و اخوت، سماجی مساوات اور انسان دوستی کا دور دورہ ہو خواہ اسکے

لیے پوری قوم کو اپنے خون کا ایک قطرہ ہر محاذ پر کیوں نہ بہانا پڑے۔ اسے ان طاقت ور اور مہیب سماجی دشمنوں سے بغیر جنگی تصادم کے نوع انسان کی فلاح و آزادی ممکن نظر نہیں آتی جس کے لیے وہ اپنے اور اپنے ہم وطنوں کے ذہن کو تیار کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر ان سے "ثمر" لینے کے لیے ہر قطرۂ خونِ دل کو نذرِ چمن بندی دوراں کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی دوررس نگاہوں نے آنے والے دور کی تصویر دیکھ لی تھی۔ کیوں کہ اس جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام میں کسی بھی ذی حس کا زندہ رہنا دشوار تھا اور اہل علم و فن کی زندگی تو اور بھی زیادہ دو بھر تھی اور مجاز خود بھی ان کا شکار تھے۔ بقول سجاد ظہیر:-

"آج زندہ احساس اور حساس ادیب کے لیے کوئی چارہ سوا اس کے نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے آپ کو ترقی و انقلاب کی نئی قوتوں کے ساتھ پیوست کر دیں۔ ایک طرف تو دولت والوں کی عظیم اور ہولناک تخریبی قوت دوسری طرف محنت کش غریبوں کی مٹی اور خون میں لتھڑی ہوئی نئی زندگی موجودہ حالات کی دردناکی کے ساتھ آسمان کی نورِ سحر سے آئینہ پوشی دیکھنا فنا کے آہنی دخت اثر قدموں کی آہٹ کے ہمراہ قبیلۂ انقلاب کا اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہی جانا اور سرمایہ داری کی گرج اور گونج میں اس کی بدمستی کا نقشہ بھی دیکھ لینا ہے وہ اجرت جس کے بغیر عہدِ حاضر میں شاعری اور ادب میں حیات و نمو پیدا ہوں گے۔" [1]

ان حالات میں حقائق پر مبنی شاعری جس میں ذاتی مسرتوں اور رنج و غم کا خوش گوار امتزاج بھی ہوا چھی شاعری سمجھی جاتی ہے۔

علی گڑھ کی روشن فضا اور ترکی مجاہدہ خالدہ خانم کی آمد اشتراکیت اور سوشلزم کے خیالات نے انقلاب کا ایسا تصور دیا تھا جس میں نوجوانوں کے اس طبقے کی سوچ کی وہ روشنی تھی جس کے ذریعہ وہ عوام مزدور اور کسان سب کو اس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف متحد کر کے آمادۂ جنگ کر دینا چاہتے تھے۔ گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہا کر انقلاب لانا چاہتے تھے انھیں اس کی بھی فکر نہیں تھی کہ کھیت اور کھلیان

---

[1] آہنگ شبتاب۔ از سجاد ظہیر ص ۱۴۷

ناکامی ہوگا۔ شہر و بازاروں کے حشر کیا ہوں گے۔ انھیں تو ہر قیمت پر خواہ مسلح طور پر حاصل کیا ہوا ہو۔ انقلاب کی تمنا تھی ظاہر ہے کہ یہ ایک جذباتی انداز اور رویہ تھا لیکن یہی وقت کا تقاضا تھا۔ مختلف فکر و خیال کی تنظیمیں بھی حصول آزادی و انقلاب کے لیے کوئی واضح لائحہ عمل متعین نہیں کر پا رہی تھیں کہ اتنے بڑے اور جبر پکڑے ہوئے مضبوط نظام سے کس طرح گلو خلاصی حاصل کی جاسکے لیکن نوجوانوں کا کھولتا ہوا خون اسے برداشت کر لینے کو کسی قیمت پر تیار نہ تھا۔ مجاز نے بھی اسی تصور کے تحت سرمایہ دار کے اسلحوں سے جنگ کر کے انقلاب تازہ تر پیدا کرنے کا اظہار اپنی نظم انقلاب میں کیا ہے۔

شاعر کو دنیا کے بدلتے ہوئے رنگ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ نقارہ جنگ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگتی ہے جو اس کے سکون قلب کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ انقلاب کی آہٹ اسے قریب تر محسوس ہونے لگتی ہے اور اسے ایک عمومی اور عوامی جنگ کے آثار نظر آنے لگتے ہیں: ؎

بزم ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
ہر زباں پر اب صلائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
فرش گیتی سے سکوں اب مائل پرواز ہے
ابر کے پردوں میں ساز جنگ کی آواز ہے
پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب
کوہ و صحرا میں زمیں سے خون ابلے گا ابھی
رنگ کے بدلے گلوں سے خون ٹپکے گا ابھی
بڑھ رہے ہیں دیکھ دہ مزدور دراتے ہوئے
اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے

شاعر کو یقین ہو چلا ہے کہ مزدوروں کا جوش انتقام سرمایہ دارانہ نظام کی بیخ کنی جلد ہی کر دے گا۔ ؎

ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام — رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام

مزدوروں کے اس جوشِ انتقام کے نتیجہ میں اسے ہر طرف انقلاب کی مسلح جدوجہد کے دوران ہونے والا خون خرابہ نظر آنے لگتا ہے اور محل جھونپڑے، وادیوں، بیابانوں اور مسجد و کلیسا سب کو مزدور عوام کا خون لالہ گوں کرنے لگتا ہے اور اس تخریب کے پیچھے ایک شاندار اور عظیم تعمیر کے آثار نظر آنے لگتے ہیں :- ؎

گر پڑیں گے خون سے ایوان و عشرت کے ستون

خون بن جائے گی شیشوں میں شراب لالہ گوں

خون کی بوے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی

خون ہی خوں ہو گا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی

جھونپڑوں میں خوں محل میں خوں شبستانوں میں خوں

دشت میں خوں وادیوں میں خوں بیابانوں میں خوں

پرسکوں صحرا میں خوں بیتاب دریاؤں میں خوں

دیر میں خوں مسجدوں میں خوں کلیساؤں میں خوں

خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں

ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں

خون کی رنگینیوں میں ڈوب جائے گی بہار

ریگ صحرا پر نظر آئیں گے لاکھوں لالہ زار

خون سے رنگیں فضائے بوستاں ہو جائے گی

نرگسِ مخمور چشم خوں فشاں ہو جائے گی۔

اور ان خوں ریزیوں کے بعد سرخ آندھی یعنی اشتراکی نظام کو انقلاب کی مدکا پیش خیمہ سمجھتا ہے :- ؎

کوہساروں کی طرف سے سرخ آندھی آئے گی

جا بجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی

توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر

بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں کے فقیر

اس کشمکش اور جد و جہد کے بعد وطن کو آزادی نصیب ہو جائے گی۔

اور اس رنگ شفق میں باہزاراں آب وتاب

جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

ہندوستان یا پوری دنیا میں ابھی بھی اشتراکی انقلاب تو نہ آسکا لیکن مجازؔ کی پیشین گوئی ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کی شکل میں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی اور نظام سرمایہ داری دم توڑنے لگا۔ محکومی و غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں اور حریت کا آفتاب بصد آب و تاب طلوع ہونے لگا اور ۱۹۴۷ء میں سیاسی آزادی مل گئی۔

ناقدین کی رائے ہے کہ مجازؔ کی اس نظم "انقلاب" میں ان کا تصور انقلاب تخریبی ہے۔ لیکن جہاں تک حقائق و شواہد کا تعلق ہے مجازؔ نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو ان کے پیش نظر وہی سیاسی و سماجی حلقہ تھا جو مسلح بغاوت کا حامی تھا اور یہی نظریہ اس وقت سب سے زیادہ ترقی پسند بھی سمجھا جاتا تھا۔ مجازؔ بھی چونکہ ذہنی و عملی طور پر اسی حلقے سے وابستہ تھے۔ لہٰذا انھوں نے بھی ایک سرکش باغی نوجوان کے افکار و خیالات کی ترجمانی اس نظم میں کی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انقلاب اگر آسکتا ہے تو انھیں عوام کے ذریعے جو ظلم و ستم کے شکار تھے اس لیے ردِ عمل میں محلوں جھونپڑوں کھیت کھلیانوں میں بربادی کے ساتھ تعمیری تبدیلی لازمی و برحق تھی۔ مجازؔ کا تعلق چونکہ کمیونسٹ پارٹی سے تھا اس لیے ان کے "انقلاب" والے تصور کے پس منظر میں انقلاب روس کا بظاہر خون خرابہ تخریبی رجحان تو ضرور نظر آتا ہے مگر

خانہ جنگی غسل صحت ہے علیل اقوام کا

اس کے ساتھ ہی اس وقت کے غیر یقینی حالات و رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے حقیقت پسندانہ بھی ہے یہ دوسری بات ہے کہ یہ رجحان وقت کے ساتھ تبدیل ہو جاتا ہے اور حقیقت کا روپ نہ دھار سکا۔

"شوق گریزاں" میں مجازؔ نے اس مرد انقلابی کا تصور پیش کیا ہے۔ جو پرانی روایات کے برخلاف نئے نظام حیات کا متمنی ہے۔ ؎

دیر و کعبہ کا میں نہیں قائل
دیر و کعبہ کو آستاں نہ بنا
مجھ میں تو روحِ سرمدی نہ پھونک
رونقِ بزمِ عارفاں نہ بنا
بجلیوں سے جہاں نہ ہو چشمک
اس گلستاں میں آشیاں نہ بنا
میری خودداریوں کا خون نہ کر
مطربِ بزمِ دلبراں نہ بنا

تعارف میں وہ واضح طور پر نوعِ انسان کی پرستاری کا دعویٰ کرتے ہیں جو بغیر انقلاب اور تغیر خوش آئین کے ممکن نہیں: ؎

حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں

نظم اندھیری رات کا مسافر مجاز کے انقلابی عزم کے لیے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاعر سرمایہ دارانہ نظام کی زنجیروں کو توڑ کر اپنی منزل آزادی و انقلاب تک پہنچ جانے کے لیے بے تاب نظر آتا ہے۔ تلاطم خیز دریا، آگ کے میدان، گرجتی آندھیاں، بپھرے ہوئے طوفان، تباہی کے فرشتے، جبر کے شیطان، سیاست کی سنانیں، اہلِ زر کے خونچکاں تیور اس کے عزمِ مصمم کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں اور بے معنی معلوم ہونے لگتے ہیں: ؎

تلاطم خیز دریا آگ کے میدان حائل ہیں
گرجتی آندھیاں بپھرے ہوئے طوفان حائل ہیں
تباہی کے فرشتے جبر کے شیطان حائل ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
فضا میں شعلہ افشاں دیوِ استبداد کے خنجر
سیاست کی سنانیں اہلِ زر کے خونچکاں تیور
فریبِ بیخودی کا دیتے ہوئے بلور کے ساغر

مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

دوسری جنگ عظیم کے بادل سر پہ منڈلا رہے تھے اور فاشزم کا دیو استبداد اپنے خونی خنجر سے پوری دنیا کے امن و امان کو غارت کر دینے کے درپہ تھا۔ دنیا محشر بداماں نظر آ رہی تھی: ؎

حکومت کے مظاہر جنگ کے پُرہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل تازیانے بیڑیاں پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

اس نظم میں مجاز کا تصور انقلاب زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔ کیوں کہ یہ نظم جس زمانے میں لکھی گئی ملک اور سماج ایسے حالات سے دوچار تھے کہ اپنی راہیں متعین نہیں کر پا رہے تھے۔ منزل کا احساس و شعور تو تھا۔ لیکن جادہ منزل کا پتہ نہ تھا اور گرد و پیش محض دشواریاں، تحر و میاں ہی راہ میں حائل تھیں، کچھ بھی مجاز کی اس نظم میں ان کا وہ سرکشانہ جذبہ و عزم جھلکتا ہے جو تمام رکاوٹوں کو توڑ کر منزل کی طرف بڑھتے رہنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے خواہ وہ منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی بھی راستہ اختیار کرے۔

"نوجوان سے" نظم میں یہ حوصلہ اب انتظار کی تاب نہیں لاتا اور جلال آتشیں اور برق و سحاب پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہے:

تیرے خرام میں ہے زلزلوں کا راز نہاں
ہر ایک گام پہ اک انقلاب پیدا کر

آخر میں انقلاب کی خواہش تیز تر ہو جاتی ہے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے: ؎

انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

مجاز نے اپنی اس نظم "نوجوان سے" میں جو تصور انقلاب پیش کیا ہے وہ

انتہائی روانی اور تیکھی ہے۔ جہاں شاعر انقلاب کی خاطر بزم محبت کو بھی اٹھا دینا چاہتا ہے۔ وہ قصر تمدن کو ایک فریب سمجھنے لگتا ہے اور ان فرسودہ رسوم اور تمدن کہنہ جس میں انسان کا بذات خود دم گھٹتا نظر آتا ہو اس کو مٹانے کی خاطر۔ سرکش نوجوانوں سے عذاب بن جانے کو کہتا ہے اور آگے چل کر "نوجوان خاتون سے" مخاطب ہوتے ہیں تو ان کا انقلابی رنگ مزید ترقی پسند نظر آنے لگتا ہے۔ ان کو رسوم رواج کے فرسودہ قیود سے باہر آنے کی دعوت دیتا ہے اور حقیقی و مثالی زندگی گزار اور مردوں کے دوش بدوش مختلف کارہائے نمایاں انجام دیتے ہوئے انقلاب تازہ میں برابر کا شریک بنانا چاہتا ہے۔ یہ پیغام وقت کا اہم تقاضا تھا قوم کی دکھتی رگ تھی جس پر مجاز نے بڑے بے کانہ اور فن کارانہ انداز میں ہاتھ رکھا ہے: ؎

تِرے ماتھے کا ٹیکہ مرد کی قسمت کا تارہ ہے
اگر تو سازِ بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا
سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا

"آوارہ" اسی سرپھرے باغی کی ترجمان ہے جو مفلسی اور بے روزگاری سے تنگ آکر اپنے ہی شہر کی سڑکوں پر آوارہ سرگرداں گھومنے پر مجبور ہے۔ اس کے پس منظر میں مجاز کے دور کے معاشی و سماجی حالات ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے حربوں کا شکار ہو کر مجاز خود بھی بے کار و آوارہ پھرتے رہے انھیں کبھی معاشی آسودگی حاصل نہ ہو سکی۔ اسی لیے اس نظم میں شدت جذبات کی فراوانی ہے ایک سرکش باغی کی ساری سرکشی و آوارگی پورے شباب پر پہنچ جاتی ہے اور اس کے ذہن میں اس پورے نظام کو درہم برہم کرنے کا خیال موجزن ہوتا ہے۔ جس میں اس کی آرزوؤں اور خوشیوں کا خون ہوا ہے جہاں مفلسی، بے کاری، بے روزگاری اور ناکامی اس کا نصیب بن گئی۔ یہ نظم صرف مجاز ہی کی نہیں بلکہ اس دور کے تمام باغی حساس اور مضطرب نوجوانوں کے تصورات و

جذبات کی آئینہ دار ہے۔

شاعر ان حالات میں جھنجھلایا ہوا جیتی جاگتی سڑکوں پر آوارہ گھومتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس نظام کو جس کی بنیاد ظلم و ستم پر ہے کس طرح بدل دے۔ اس وحشت سامانی میں اپنے دل کو بہلانے کی بہت کوشش کرتا ہے ؏

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لیکن دل میں کچلی ہوئی خواہشات کا شعلہ بھڑک رہا ہے صبر کا پیمانہ چھلکنے کو ہے وہ زخم جو بظاہر دب گئے تھے مہک اٹھے ہیں اور شاعر کا جذبۂ انتقام جاگ اٹھتا ہے۔ اس کی اجتماعی سوچ ابھرنے لگتی ہے۔ اس کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ وہ کس طرح اپنے جیسے دوسرے لاکھوں کروڑوں نوجوانوں کے حالات کو بدل دے مفلسی کے مارے بھوکے ننگے عوام اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ اور کہیں چنگیز و نادر کی ستم رانیاں اس کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکنے لگتی ہیں۔ جس کے ردِ عمل میں اپنی ساری طاقت و ہمت مجتمع کرکے چنگیز کے ہاتھوں کا خنجر توڑنے اور اندر سبھا کے ساز و سامان پھونک دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے جن کی گردنوں پر کروڑوں غریب انسانوں کا خون ناحق ہے۔ ان خونیوں کا گلشن و شبستان کیا ان کے قصرِ گراں بھی پھونک دینا چاہتا ہے کیوں کہ ان قصروں کی تعمیر میں اور اندر سبھا کے ساز و سامان کے مہیا کرتے میں انھیں غریب محنت کش عوام کا خون شامل ہے۔ لہٰذا ان سب کے خلاف اس مردِ حساس کے دل میں نفرت ہے اور سخت نفرت — وہ اس ظلم و ستم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے بےچین ہے اس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان ہے اور کوئی واضح لائحہ عمل سامنے نہیں نظر آتا تو گھبرا کے کہہ دیتا ہے : ؎

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں

میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں

زخمِ سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں

اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں

ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے

سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے

سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں

تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں

کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں

اس کا گلشن پھونک دوں اُس کا شبستاں پھونک دوں

تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

سرمایہ دارانہ نظام جو انھیں چنگیز و نادر کا جنم دیا نظام ہے۔ جس کی لوٹ مار اور غارت گری تہذیب کے پردے میں بہیمیت و درندگی کو فروغ دیتی ہے عالمی امن و اماں پر عذاب بن کر نازل ہوئی ہے نوعِ انسان کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ اس کے اس رازِ نہاں کو شاعر سمجھتا ہے اور اس کے دل میں سخت ترین نفرت موجزن ہوتی ہے یہ خود کو تو تہذیب کا بانی کہتی ہے مگر انسانوں کے تن کا لہو تک کھینچ لیتی ہے اور ان کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیتی ہے: ؎

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے
یہ وہ آندھی ہے جس کی زد میں مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے
یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے
یہ انسانی بلا خود خون انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھ کے مہلک موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

اس نظام کی انتہا کو پہنچی ہوئی درندگی اور اس کی مخالف قوتوں کو زور شور سے ابھرتے دیکھ کر شاعر کو اس کی موت کا یقین ہونے لگتا ہے اور اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی سعی کرتا ہے وہ مفلس و نادار محکوم و غلام جن کے لیے یہ بلائے بے درماں تھی بیداری کی کروٹیں لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی ہلاکت خیزی شاعر کو بدمست نظر آنے لگتی ہے اور اس کے قصر استبداد کے ستون ڈگمگانے لگتے ہیں تو اس روح انقلاب کو جو عوام میں سرایت کر چکی ہے آندھی کی شکل دیدینے کو للکارتے ہیں اور اس میں شدت اور طاقت پیدا کرنے کے لیے خوشخبری بھی سناتے جاتے ہیں: ؎

مبارک دوستو لبریز ہے اب اس کا پیمانہ
اٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیاد کاشانہ

"سرمایہ داری" مجاز کے انقلابی رجحان کے سلسلہ کی اہم نظم ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام کے معاشی استحصال، دولت کی غلط تقسیم اور دوسرے غیر منصفانہ رجحانات کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جذباتی رنگ اس نظم میں حاوی رہا ہے۔

"ہمارا جھنڈا" میں انقلابی جد و جہد کرنے والوں کی ایسی تصویر پیش کی ہے جو باوجود مفلسی اور بھوک کے باحوصلہ اور باہمت نظر آتے ہیں۔

راہ میں حائل دشواریوں اور مصائب کے احساس سے ان کے عزم اور پختہ تر ہو جاتے ہیں: ؎

ہاں یہ سچ ہے بھوک سے حیران ہیں   پر یہ مت سمجھو کہ ہم بے جان ہیں
اس بری حالت میں بھی طوفان ہیں
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

جانتے ہیں ایک لشکر آئے گا   توپ دکھلا کر ہمیں دھمکائے گا
پر یہ جھنڈا ابھی یوں ہی لہرائے گا
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

کب بھلا دھمکی سے گھبراتے ہیں ہم   دل میں جو ہوتا ہے کہہ جاتے ہیں ہم
آسماں ہلتا ہے جب گاتے ہیں ہم
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

لاکھ لشکر آئیں کب ہٹتے ہیں ہم   آندھیوں میں جنگ کی کھلتے ہیں ہم
موت سے ہنس کر گلے ملتے ہیں ہم
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

مجاز نے "خواب سحر" سویت یونین کے جشن سالگرہ کے موقعہ پر کہی تھی۔ وہ اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ نوع انسان کے پرستار ہیں انھیں وجود نے اس کو مذہب کے غلط اثرات اور توہمات سے مقابلہ کرنے پر مائل کیا ہے اور درد انسانی کے درماں کی تلاش میں مذہب کے غلط رویوں اور اوہام باطل کی مذمت جی کھول کر کرتے ہیں وہ انسان کو اور انسانیت کو مذہب و ملت سے برتر اور عظیم سمجھتے ہیں۔ ان کو ان تمام انسانوں سے جو مجبور و مظلوم ہیں زیادہ ہمدردی ہے۔ خدمت خلق کو عین ایمان اور منصب انسانیت سمجھتے ہیں۔ ان کے تصور انقلاب میں روس کے انقلاب عظیم کا پرتو دکھائی دینا عین فطری تھا مارکس اور لینین کے سائنٹفک مساواتی معتقدات کو نظریاتی طور پر فوری قبول اس لیے کر لیتے ہیں کہ وہ انھیں انسانیت سے قریب تر نظر آتے ہیں اس کو ہی

پوری انسانیت کے گرد پھیلے ہوئے مہیب اندھیروں میں ایک چراغ رہ سمجھتے ہیں اور اس دورِ دراز کے انقلاب اور نجات انسانیت کے طریق کو اپنے ملک اور پورے ایشیا کے لیے خواب سحر کا درجہ دے دیتے ہیں :

اک نہ اک در پہ جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگ زرگری جاری رہی
اہلِ باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے
یہ مسلسل آفتیں یہ یورشیں یہ قتلِ عام
آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام
ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

"آزادی کی تڑپ۔ انسان دوستی، عزمِ مصمم کا اظہار، "دلّی سے واپسی" "مسافر"، "ایک جلاوطن کی واپسی" "طفل کے خواب" جیسی نظموں میں پورے شباب پر ہے جذبۂ جرات وہمت کے تحت سازو جام کی موجودگی میں بھی شمشیر کی ضرورت کا احساس ہی نہیں بلکہ تخریبی قوتوں سے ٹکرا جانے کی دعوت دیتے ہیں سر فروشانِ بلاکش کو ہم رکاب دیکھنا چاہتے ہیں۔

۱۹۳۹ء میں جنگی ادبار کی بدلیاں جب ساری دنیا پر چھانے لگتی ہیں تو اس کا احساس شدید "ادھر بھی آ" میں ابھرتا۔ زندگی توپ و تفنگ تیغ و سناں کے نذر ہونے والی ہے۔ لیکن عالمی سطح پر ان سامراجی طاقتوں کے آپسی تصادم سے ایک سکون یہ نصیب ہوتا ہے کہ یہ طاقتیں لامحالہ ضرور کمزور پڑیں گی تو بیکسوں کا نالہ اندوہگیں اور باغیوں کا زمزمہ آتشیں گوش گذار ہونے لگے گا اور مرد

انقلابی کی نظر میں کاوش تدبیر کی اہمیت اور تخریب کے پردے میں تعمیر کے پہلو ظلمات کے پردے میں شمع فروزاں بن کر جھلملانے لگیں گے اور "عشرت فردا" حقیقی انقلاب کی شکل میں سامنے ہوگی۔

تبدیل ہوتے ہوئے حالات کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں دیرینہ خواب آزادی جب شرمندہ تعبیر ہوتا ہے تو اس کے اثرات کو دیکھ کر مجاز اس سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ کیوں کہ رنگ و نسل مذہب و ملت کا ایک پیچیدہ تعصب جڑ پکڑنے لگتا ہے جو انسانیت کے منافی ہے اور یہ آزادی اس کے اپنے تصور آزادی سے میل نہیں کھاتی اور ملک اس کے برعکس حالات دگرگوں سے دوچار ہو جاتا ہے اور شاعر ذی حس کو ایک کرب و بے چینی کا شکار کر دیتا ہے۔ ۵

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں
یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں
ابھی وہ سعی جنوں خیز کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں آغاز کار مرداں ہے

اور یہ آزادی اس کی نظر میں اس کی اپنی مثالی و آدرش آزادی کا پہلا قدم ہے جس کے لیے وہ مستقبل میں پر امید ہے۔

تمام نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجاز کی نظر میں انقلاب کا تصور واضح اور وسیع تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ مجاز کے ذہن میں انقلاب کے اولین نقوش روسی انقلاب کی دین تھے جس کا پرتو خواب سحر میں صاف و صریح ظاہر ہے اور اس انقلاب کو حقیقت کے روپ میں دیکھنے کے لیے وہ مسلح جدوجہد کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور بغاوت پر جوانوں کو آمادہ کرتے ہیں خواہ وہ نوجوان خاتون ہی کیوں نہ ہوں وہ انقلابی جوانوں کی رگوں میں دوڑتے خون کو سرد ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ اس نظریہ کا اظہار ان کی نظم انقلاب، اندھیری رات کا مسافر، نوجوانوں سے، نوجوان خاتون سے، آوارہ، سرمایہ داری وغیرہ میں صریح ملتا ہے۔

مجاز نے بائیس سال کی عمر میں جو انقلاب کا تصور پیش کیا تھا وہ سیکڑوں میل دور واقع عوامی انقلاب کا پرتو تھا اپنی محکومی و غلامی سے نجات کا ایک ہی خوش آیند تصور جو اس عمر اور عہد کا نوجوان کر سکتا تھا وہ یہی تھا کہ سارے عوام جن میں مزدوروں، کسانوں، مرد و عورت، بوڑھے بچے، کمزور و نادار سبھی دوش بہ دوش بیرونی سامراج کے خلاف باقاعدہ مورچہ بندی کر لیں اور اس میں انھیں مسلح جدوجہد کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نظر آتا تھا۔ ہندوستان کی فضا ایسی نہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد پھر کبھی فوجی بغاوت سر ابھار سکتی اور نہ اشتراکیت یا اشتراکی خیالات دوسری سیاسی پارٹیوں پر اس حد تک اثر انداز ہو سکے تھے کہ اگر وہ اقتدار میں آدیں تو یہ عناصر غالب حصہ بن سکیں۔ بڑے بڑے رہنمایان وقت مفکر اور اشتراکیت و سوشلزم کے حامی کوئی واضح اور روشن راہ متعین نہیں کر پا رہے تھے تو ایک نوخیز شاعر سے کیا امید کی جا سکتی تھی۔ ایک طرف سبھاش چندر بوس مسلح جدوجہد کی طرف مائل تھے۔ حسرت نے قزاقانہ جنگ کا اعلان کیا ایسے میں نوجوان طبقہ مسلح جدوجہد کے ذریعہ حصول آزادی و انقلاب کے خواب دیکھتا ہے تو کیا اس کا یہ رویہ غیر حقیقت پسندانہ ہے؟

مجاز ہر قیمت پر انسانیت دشمن عناصر کے دشمن تھے خواہ وہ جاگیردارانہ نظام ہو یا آزادی ہند کے بعد کی خونریزیاں یا درمیان میں دوسری جنگ عظیم کے دوران فاشزم کی قہرمانیاں۔ چونکہ یہ سب نادار کمزور طبقے کے معاشرتی و معاشی استحصال کے باعث تھے۔ مزدوروں کو خیرات کی طرح ان کی مزدوری کا ملنا۔ کسانوں کے خود کے پیدا کردہ دانہ گندم پر حق نہ ہونا، عورتوں کو اس کے حقیقی مقام سے پرے ڈھکیل کر صرف عیش و عشرت کا سامان اور سیج کی زینت سمجھا جانا۔ علم و معرفت کے دروازے عام کمزور طبقے کے لیے بند ہونا۔ مجاز کا انقلاب ان سب کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔

مذہب چونکہ انسان کے سینے کو علم سے روشن کرنے اور سماجی مساوات و اخوت کا درس دیتے آیا تھا جس نے ہمیشہ کمزوروں اور ناداروں کی حمایت دا مانت

کی تھی سینہ فگاروں کا مرہم سمجھا جاتا تھا اس میں بقول مولانا ابوالکلام آزاد زندگی کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا ایسے میں مذہب اور زندگی کے درمیان ہوئی تجارت سے بچنے کے لیے صرف ایک سہارا نظر آتا تھا وہ اشتراکی نظریات تھے جو بغیر تفریق مذہب، نسل و قوم زندگی کے ہر شعبے میں ہر فرد کو برابر کے مواقع فراہم کرتا نظر آتا تھا۔ خواہ وہ تعلیم ہو یا معاش کا معاملہ۔ ظاہر ہے یہ دونوں ہی چیزیں اس وقت کا تقاضا اور بنیادی ضرورت تسلیم کی جا چکی تھیں۔ مجاز نے ان عناصر کو بھگتا ہے اور اس کی ضرورت کو سمجھا تو ان کا درد مند دل تڑپ اٹھا اور وہ انقلاب کے گیت مختلف سروں میں گانے پر مجبور ہو گیا۔ آزادیٔ ہند سے بہت سے ہمارے ادیب و شاعر مطمئن بھی ہو گئے ہوں مجاز کو چوں کہ اس کے بعد بھی انسانیت اسی قسم کی ظلم کی چکی میں پستی نظر آئی اس لیے وہ اس انقلاب کو صرف مژدہ انقلاب کا نام دے سکے اور انقلاب حقیقی کی جد و جہد اور حصول کی خاطر سعی جنوں خیز کو مزید کامیابی و کامرانی کے لیے اکساتے رہے لیکن وہ اسے نعرے بازی سے بچائے رکھتے ہیں اور اپنے مدھم سروں میں اور رومانوی لب و لہجہ میں انقلاب کے مدھر گیت گاتے گذرتے ہیں اگر وہ غزلخواں بھی ہوتے ہیں تو وہاں بھی انقلاب کے نغمہ کی سرگشتی شامل کر دیتے ہیں بقول فیض:

"مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں ہے انقلاب کا مطرب ہے اس کے نغمہ میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی ہے اور بہار کی رات کی سی گرم جوشی تاثر آفرینی"۔ [۱]

مجاز کی انقلابی شاعری پر بعض تنقید نگار غیر واضح تصور انقلاب کا اعتراض کرتے ہیں یا اس میں فکر کی پختگی کی کمی کا احساس کرتے ہیں۔ میں کلی طور پر ان کی رائے سے اتفاق نہیں کرتی ان کا انقلاب کا تصور کسی مطالعہ اور فکر و خیال کی دین نہیں ہے بلکہ اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات کے اثرات ج

---

[۱] دیباچہ، آہنگ از فیض احمد فیض۔

ان کے جذبات کی تحریک کا باعث بنے۔ انھیں سے متاثر ہو کر ان کی اپنی انقلابی شاعری نے جنم لیا۔ جس میں نہ کوئی پروپیگنڈہ تھا نہ نعرہ بازی بلکہ اس میں ایک مکمل تاریخیت کا گہرا شعور ملتا ہے۔ وہ اپنے طرز طریقہ اور ذہن سے تاریخی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے جہاں مورخ نہیں پہنچ پاتا۔ کیوں کہ شاعری مزاج سے ہوتی ہے۔ اور شاعر اپنی بصیرت و احساس سے حقیقت کو محسوس کر لیتا ہے۔ مجموعی طور پر اس کی پوری انقلابی شاعری اس کے دردمند دل کی آواز ہے یہ اور بات ہے کہ چونکہ وہ خود بے حد حساس تھے اس لیے جذبات کی شدت نے کہیں کہیں غیر فطری رنگ اختیار کر لیا ہے۔ ان کی پوری شاعری کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو ان کا تصور انقلاب حرکی ہے جس کا محور نوع انسان اور اس کی زبوں حالی سے خوش حالی کی طرف اذن خرام ہے۔

مجاز کا اسلوب فکر

۱۔ مجاز غزل کا مزاج داں
۲۔ مجاز بحیثیت نظم نگار
۳۔ مجاز کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ
۴۔ مجاز کی شاعری کا فنی تجزیہ
۵۔ مجاز کا ادبی مرتبہ

مجاز غزل کا مزاج داں

ساری محفل جس پہ جھوم اٹھی مجاز
وہ تو آوازِ شکستِ ساز ہے

مجاز

مجاز غزل کا مزاج داں

بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان کی تاریخ کا اہم موڑ ہے جہاں زندگی کی اقدار سیاست اور دوسرے شعبۂ حیات میں ایک نمایاں تبدیلی آرہی تھی وہیں شعروادب کے میدان فکر کشادہ اور وسیع ہوتے جارہے تھے۔ ان کے موضوعات اور مواد وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر انھیں پورا کر رہے تھے اور "تنگنائے غزل" بھی اپنے اندر لامحدود وسعتیں پیدا کر رہی تھی

مولانا حالی نے جس غزل کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اس میں لب و رخسار، آنچل و محرم، وصال و فراق کی گھسی پٹی باتوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ فطری اور حقیقی غزل گوئی کی طرف چند شعرا کو چھوڑ کر کسی کی بھی نظر نہ جاتی تھی۔ لیکن جلد ہی غزل گوئی کے میدان میں حیرت انگیز انقلابات آئے اور اب اردو غزل گوئی بقول فراق گورکھپوری:

"اس کے بعد وہ دور آیا جس میں اردو غزل گوئی لکھنؤ دلی کی تاریک گلیوں سے نکل کر دوسرے شہروں صحراؤں اور قید خانوں میں نئی آوازوں سے نغمہ سرا ہوتی ہے۔ چنانچہ بجائے لکھنوی اور دہلوی کہلانے کے لیے چوٹی کے غزل گو حسرت موہانی، اصغر گونڈوی جگر مرادآبادی اور فانی بدایونی کہلائے لکھنؤ میں رہ کر لکھنؤ کے جذباتی اسکول پر جس شخص نے دھاوا بول دیا وہ یگانہ چنگیزی تھے۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے[1]

وہ اردو غزل جسے فرسودہ اور پامال صنف سخن سمجھا جانے لگا تھا وہ بے شک ناسخی دور میں سطحی خارجیت کا ضرور شکار رہی لیکن اس صدی میں وہ پھر اپنی آن بان کی طرف لوٹتی نظر آتی ہے اور ان میں ٹھیٹھ دور حاضر کے عناصر کی جھلک ملنے لگتی ہے۔[2]

---

[1] اردو غزل گوئی۔ از فراق۔ ص ۳۳

[2] اردو غزل گوئی: از فراق۔ ص ۵۸

ان کی فرسودگی یک لخت ختم ہونے لگتی ہے۔ موجودہ زندگی کی کشمکش اور تیز رفتاری نے ہم سے فرصت کے رات دن، عیش و فراغت اور بے فکری کے لمحات چھین کر کشاکش حیات میں مبتلا کر دیا۔ جس نے عاشقانہ غزل میں انقلاب پیدا کر دیا وہ حسن و عشق کی ماہیت اور اس کے شعور و لاشعور کے اثرات کو اپنے اندر داخل کرنے لگی اور حسن و عشق کا تخیلی، تصور ابھرنے لگا۔ جلد ہی حسن و عشق کی معنویت اس کی حسرت و ناکامی اور کامیابی اور کامرانی اور اس کے اثرات و محسوسات غزل کی جولانگاہ بن گئے اور حسن و عشق نے مجرد مفہوم لے لیا اور ساتھ میں اپنے دور کے جدید علوم فلسفے جدید سائنس اور سیاست کو بھی شامل کر لیا۔ یہ بدلتا ہوا زمانہ تذبذب اور تشکیک کا زمانہ تھا۔ شعور انسانی میں انسان کی تنہائی کا احساس جاگزیں ہو رہا تھا جس سے ہماری جدید غزل متاثر ہو رہی تھی پرانے الفاظ کو نئی معنویت کی ضرورت پیش آنے لگی۔ نتیجہ میں ہوش و عقل۔ صحرا و زنداں، بہار و خزاں، ساقی و میخانہ جدید احساسات کے علائم بن گئے اور غزل فطری و حقیقی تقاضوں کو پورا کرنے لگی۔

ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگر
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

غزل میں چونکہ ہیت کے اعتبار سے تبدیلیاں بہت کم ہوئیں۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ دور جدید کی غزل کی شکل میں کوئی خاص فرق نہیں آیا لیکن مواد اور موضوعات کے لحاظ سے یہ محبت کی دنیا سے باہر نکل کر باہر کی دنیا سے بھی باخبر رہنے لگی۔ مجاز چونکہ فطرتاً رومانی شاعر ہیں۔ اس لیے انھوں نے بھی اپنے شاعرانہ جذبات کے اظہار کے لیے غزل کا پیرایہ اپنایا جو رومانی موضوعات کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ مجاز نے مشق سخن اسی لیے غزلوں سے شروع کی اور اس مشق سخن کا سراغ آگرہ کے قیام کے زمانہ سے ملتا ہے۔ ابتداء میں دو ایک غزلیں فانی بدایونی اور حامد علی خاں کو دکھائیں۔ لیکن مجاز میں شروع ہی سے بلا کی موزونیت موجود تھی اور لہجہ نشاطیہ تھا۔ اس لیے انھوں نے بعد میں اپنے وجدان کو ہی اپنا راہبر بنایا کیوں کہ ان کو خود اور

فانی کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ کہیں فانی کی قنوطیت ان کے جذبے کی سرشاری و سرمستی پر یاس کا پرتو نہ ڈال دے۔

مجاز چونکہ فطرتاً رومان پرور دل کے مالک تھے۔ زندگی اور اس کے حُسن سے محبت کرتے تھے۔ رُدَولی، لکھنؤ، علی گڑھ اور دہلی کی جن رومان انگیز فضاؤں میں انھوں نے اپنی طفلی اور جوانی کے دن گزارے تھے ان کے رومانی عناصر ان کی فطرت میں گھل گئے تھے اور وہی ان کے فکر و فن کے مرکز اور محور بن گئے تھے۔

"مجاز کا ذہنی ارتقا، افتادِ مزاج، کردار کی نشو و نما غزل کی شاہ راہ پر ہو رہی تھی۔ اُن کی حیات شعوری طور پر رنگین فضا میں آگے بڑھ رہی تھی واردات و حادثات کے نقوش جو ان کے احساسات پر ثبت ہوئے اور جو مرتے دم تک نہ مٹ سکے وہ غزل کا مواد شاعر کو دے گئے گویا شعر کہنے سے پہلے ہی دل گداختہ پیدا کر چکے تھے"۔[1]

یہی وجہ ہے کہ مجاز کی نظموں پر بھی غزلوں کے مرکزی رومانی عنصر کا پرتو حاوی ہے۔ نظموں کا لہجہ۔ موضوع طرز تخیل طرز ادا سب گویا غزل کے گرد گھوم رہے ہیں اور اکثر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا مجاز کی شاعری ایک ایسا ساز ہے جس کی ہر صدا غزل بن کر نکلتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جو موضوع کے اعتبار سے اس حسن و عشق کی دنیا سے الگ ہیں لیکن ان کا بھی لب و لہجہ شدت جذبات کی فراوانی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس پر بھی وہی رومانی جذبات کا رنگ حاوی ہے یہ اور بات ہے کہ حسن و عشق کی دنیا سے نکل کر کچھ اور بھی ہونے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے۔

مجاز محبت کو زندگی کا جزوِ اعظم سمجھتے تھے۔ اسی لیے جب انھوں نے اپنے جذبات کو آرزوؤں اور واردات قلبی کو الفاظ کے حسین پیکر دیئے تو ان کے لب و لہجہ میں بلا کی نرمی اور سادگی کے ساتھ ساتھ سرمستی بھی آگئی ہے جذبات و

---

[1] مجاز اور غزل۔ از اعجاز حسین (ادب اور ادیب)

محسوسات کے اظہار اور بیان میں انھوں نے درد اور سوز و گداز پیدا کر دیا ہے۔ ان کی غزلوں کا ہر شعر نغمگی، غنائیت اور آہنگ خاص سے پر ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں کا لہجہ ہمیشہ نشاطیہ رہا اس پر یاسیت اور قنوطیت کا عکس نہیں پڑنے پایا اگر دکھ درد کی باتیں کہیں بھی تو ایسے سیدھے سادے اور با اثر پیرائے میں کہ پڑھنے والا ان کے درد و کرب کو پوری طرح محسوس کر لے۔

مجھے سنے نہ کوئی مستِ بادہ عشرت
مجازؔ ٹوٹے ہوئے دل کی اک صداہوں میں

ساری محفل جس پہ جھوم اٹھی مجازؔ
وہ تو آوازِ شکستہ ساز ہے

ہنستے ہوؤں کو دیکھ کر کیوں رو نہ دیں مجاز
آخر کسی کے ہم بھی ستائے ہوئے تو ہیں

عشق اور رسوائی کون سی نئی شے ہے
عشق تو ازل سے تھا رسوائے جہاں اپنا

میری بربادیوں کا ہمنشینو!
تمھیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

میرے ہر لفظ میں بے تاب میرا سوزِ دروں
میری ہر سانس محبت کا دھواں ہے ساقی

ان اشعار کی تاثیر، ان کے لہجے کی نرمی، الفاظ کی سادگی اور جذبات کی اثر انگیزی سے کون منکر ہو سکتا ہے۔ اشعار پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا شاعر کا غم اپنا ہی غم ہے۔ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا اسی درد و کرب میں مبتلا ہے۔ ان کے غزلوں کے اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ گویا مجازؔ نے غزل کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اور اس بات کو بھی جانتے اور سمجھتے تھے کہ ہلکے پھلکے اور خوبصورت الفاظ کا ہی بوجھ غزل کا نرم و نازک جسم برداشت کر سکتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے میرؔ کی طرح سیدھے سادے اور غنائی الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ جس سے وہ اپنے احساسات کو بہ آسانی خوبصورتی کے ساتھ برت

سکے ہیں۔ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین:

"ان کی غزلیں سراپا ترنم ہیں۔ ان میں بلا کی غنائیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے مصرعے نغمے بن کر آئے اور قوت سامعہ کو بیدار کر کے فضا میں تحلیل ہو گئے۔ زیر لب ہی سہی مگر ان کی غزلیں بغیر گنگنائے ہوئے پڑھنا مشکل ہے"[1]

ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے تاکہ آپ بھی اس کے لہجے کی نغمگی اور ترنم سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ؎

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے
ان کی اُن مخمور آنکھوں کی قسم
میری میخواری ابھی تک راز ہے
چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

حُسن پھر فتنہ گر ہے کیا کہیے
دل کی جانب نظر ہے کیا کہیے

آہ کیا دل میں اب لہو بھی نہیں
آج اشکوں کا رنگ پھیکا ہے

بارہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی
بارہا مستی میں لب پر ان کا نام آ ہی گیا

پھر مری آنکھ ہو گئی نمناک
پھر کسی نے مزاج پوچھا ہے

ہائے انجام اس سفینے کا
ناخدا نے جسے ڈبویا ہے

مجاز کی غزلوں کی کامیابی کی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ ان کی غزلوں کے

---

[1] ملک ادب کے شہزادے۔ از ڈاکٹر اعجاز حسین

اشعار میں شاعر کے ذاتی تجربات۔ مشاہدات، احساسات و خیالات کی جھلک نظر آتی ہے جس سے ان غزلوں میں بیداری، تازگی اور تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ روایتی غزلوں کی طرح ان کی غزلیں کبھی بھی مادی دنیا سے ہٹ کر تصوف کا سہارا نہیں لیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں کبھی بھی ذہنی اور فکری جمود کا شکار نہیں نظر آتیں بلکہ بظاہر یہ محدود وسعت کی دنیا ایک ہمہ گیر شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جہاں انسان کے ذاتی غم و کرب ہی سب کچھ نہیں ہوتے بلکہ شاعر یہ سوچنے لگتا ہے ؎

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

بات تو جب ہے کہ مر جا عرصہ گاہ رزم میں
اس پہ دم دینے سے کیا اور اس پہ دم دینے سے کیا

دہاں کتنوں کو تخت و تاج کا ارماں ہے کیا کہئے
جہاں سائل کو اکثر کاسۂ سائل نہیں ملتا

واعظِ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں
اس دنیا میں کیا رکھا ہے۔ اُس دنیا میں کیا ہوگا

غمِ دوراں میں گذری جسقدر گذری جہاں گذری
پھر اس پر لطف یہ ہے زندگی کو مختصر جانا

مجاز نے بھی میر کی طرح روزمرہ کی زبان استعمال کی ہے جس کی وجہ سے ان کے خیالات کی ترسیل میں کچھ الجھاؤ نہیں پیدا ہوتے پاتا اور قاری اس کے حسین تصورات کی دنیا تک پہنچ جاتا ہے۔ مجاز کا یہ سیدھا سادا انداز حالی کی نئی غزل گوئی کی دین تھا۔ حالی سیدھی سادی زبان میں سنجیدہ متین باتیں بڑی خوبی سے کہہ جاتے ہیں جس سے پڑھنے والا بغیر کسی دماغ سوزی کے پورا پورا لطف اٹھاتا ہے اور زندگی کے رموز و حقائق کی تفہیم بغیر کسی غور و فکر کے کر لیتا ہے۔ یہ اوصاف بھی کہیں کہیں مجاز کی غزلوں میں ملتے ہیں اور جانِ غزل معلوم ہوتے ہیں:۔ ؎

رات تاروں کا ٹوٹنا بھی مجازؔ

باعث اضطراب ہونا تھا

فلک کی سمت کس حسرت سے تکتے ہیں معاذ اللہ

یہ نالے نارسا ہو کر یہ آہیں بے اثر ہو کر

بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل

ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں

محو سفر ہوں گرم سفر ہوں

میری نظر میں رفعت نہ پستی

مجازؔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اس لیے شعوری طور پر اشتراکی اصولوں سے متاثر تھے، لیکن اپنی غزلوں میں حسرتؔ کی طرح سیاسی تحریکات و نظریات سے گریز کیا ہے اور اپنے ان خیالات کی ترجمانی کے لیے انھوں نے نظم کا پیرایہ اپنایا ہے۔ اگر کہیں ان کا دل ایسے جذبات کے اظہار کے لیے بے چین ہو گیا ہے اور انھوں نے اسے غزل اشعار میں بیان کرنا چاہا ہے تو اس کو ایک مخصوص انداز میں پیش کیا ہے کہ کہیں بھی حسن لطافت غنائیت اور ترنم میں کمی نہیں آنے پائی ہے ؎

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا

تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے

سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

روئیں نہ ابھی اہل نظر حال پہ میرے

ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

کیوں کر ہوا ہے فاش زمانے پہ کیا کہیں

وہ راز دل جو کہہ نہ سکے راز داں سے ہم

بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جرأتیں مجازؔ

ڈرتے نہیں سیاستِ اہل جہاں سے ہم

سینۂ شوق میں وہ زخم کہ لودے اٹھے
اور بھی تیز زمانے کی ہوا ہو ساقی

مجاز نے زیادہ تر سیاسی مواد سے اپنی غزلوں کو محفوظ رکھا۔ لیکن اگر کہیں اس کا ذکر کیا بھی تو لطیف اشاروں میں تاکہ اس کی لطافت اور حسن ختم نہ ہونے پائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر کوئی اس زمانے اور ماحول اور سیاسی و سماجی حالات سے واقف نہ ہو تو اس کو ان کے ان لطیف اشاروں کے سمجھنے میں دشواری کا سامنا ہوگا کیوں کہ ان کے ان حقائق کی دنیا پر بھی حسن و عشق کا رنگ بکھرا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز صاحب کی اس رائے سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ مجاز نے غزل کو ایک خاص قسم کے جذبات کا سرمایہ سمجھ کر اس کو دوسرے مواد سے رنگنا مناسب نہیں سمجھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل کا کتنا احترام کرتے تھے اور اس کی نازک مزاجی سے کتنا خائف تھے [۱]

مجاز کی غزلوں کی ایک سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار ہے اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ مجاز نے کبھی بھی غزلیں تجربوں اور قافیہ پیمائی کے لیے نہیں لکھیں بلکہ جب ان کے جذبات اور احساسات ان کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالنے کے لیے مجبور کر دیتے تھے تب ہی وہ کچھ لکھتے تھے۔ نظمیں تو کبھی کبھار انھوں نے حالات اور مواقع کے تقاضوں کے تحت ہی لکھیں لیکن غزلیں خالص اپنے داخلی تقاضوں کے تحت لکھی ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ جذبات کی فراوانی کے باوجود اگر ان کو مناسب الفاظ میسّر نہیں ہوئے تو وہ غزل یا اس کے اشعار نہ کہتے کیوں کہ الفاظ کی کمی کو وہ شعر میں ایک نقص سا محسوس کرتے۔ ان کے اس جذبے نے ان کی غزلوں میں کہیں بھی کیف و سرمستی اور گداز کی کمی پیدا نہیں ہونے دی اسی لیے اکثر و بیشتر غزلیں مختصر ہیں اور وہ بھرتی کے اشعار سے سخت ہنر کرتے تھے۔ بے معنی اشعار

---

[۱] مجاز اور غزل (ادب اور ادیب) از ڈاکٹر اعجاز حسین۔

سے بھی اپنی غزل کو بچائے رکھتے تھے۔ یہی ان کی غزل کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔

مجازؔ کی غزلوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ غالب کی طرح کچھ ایسی بندشیں یا ٹکڑے استعمال کرتے ہیں کہ ان سے بہت سے ایسے گوشے منور ہو جاتے جو اس شعر میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں جو اشعار کے لطف کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ بقول فیضؔ نے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے
(فیضؔ)

"وہ کبھی کبھی غالب کی طرح کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مصرعوں میں چند الفاظ ایسے رکھ دیتے ہیں جو تصور کو نفس مضمون تک پہنچانے میں معاون ہو جائیں اور مطلب آسانی سے سمجھ میں آجائے جس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مضمون کے ہر گوشہ کو واضح الفاظ میں سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ بندش ایسی ہوتی ہے کہ جو ٹکڑا بظاہر نہیں بیان ہوا وہ خود بخود ذہن میں آجائے۔ جن الفاظ میں خیال پیش کیا گیا ہے۔ ان کی ترتیب سے ہی ہر گوشہ منور ہو جائے۔ یہ فن بلاغت کا خاص کارنامہ ہے جو بہت کم نصیب ہوتا ہے۔"[1]

محو سفر ہوں گرم سفر ہوں
میری نظر میں رفعت نہ پستی
آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم
میری مے خواری ابھی تک راز ہے
وہ آ بھی جاتے وہ سو بھی جاتے

---

[1] مجاز اور غزل از ڈاکٹر اعجاز حسین (ادب اور ادیب) ص ۳۴

چشمِ تمنا پھر بھی ترستی!

حُسن خود پردہ در ہے کیا کہیے
یہ ہماری نظر ہے کیا کہیے
آہ تو بے اثر تھی برسوں سے
نغمہ بھی بے اثر ہے کیا کہیے

مجاز بعض اوقات اپنے خیالات میں اثر پیدا کرنے کے لیے الفاظ یا ٹکڑوں کے تکرار سے کام لیتے ہیں گو کہ تکرار غزل گوئی کا عیب سمجھا گیا ہے۔ لیکن مجازؔ نے اپنی فن کارانہ صلاحیتوں سے اس عیب کو بھی حسن بنا دیا ہے۔ وہ اپنے دلی جذبات اور شعر کی لذت کو الفاظ یا ٹکڑوں کو بار بار دہرا کر پیش کر دیتے ہیں:

"وہ لذت ایک شراب کی کیفیت رکھتی ہے اور الفاظ پیمانہ کا کام کرتے ہیں، پینے والے ایک جُرعہ سے آسودہ نہیں ہوتے۔ وہ بار بار پیمانے کو منھ سے لگا نا چاہتے ہیں۔ اس کا فعل دیکھنے والے کو بھی متاثر اور محظوظ کرتا ہے اور سامعہ کے لیے نغمہ اور دل کے لیے سراپا اور کیف بن جاتی ہے۔ اس انداز میں مجازؔ کو خاص ملکہ ہے وہ موقعہ اور محل پہچانتے ہیں خوب سمجھتے ہیں کہ تکرار کا مناسب موقع کب ہوگا عموماً یہ مصلحت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ شدت سے کسی بات کا مزہ محسوس کرتے ہیں اور سرشار ہو کر بے خودی میں بار بار اس سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ مجبور کر دیتا ہے۔ وہ اس حُسن سے تکرار اپنے اشعار میں لاتے ہیں کہ ثقالت کے بجائے نشتریت پیدا ہو جاتی ہے" [1]

نگاہِ لطف مت اٹھ خوگرِ آلام رہنے دے
ہمیں ناکام رہنا ہے ہمیں ناکام رہنے دے

---

[1] مجاز اور غزل۔ از ڈاکٹر اعجاز حسین (ادب اور ادیب)

تم نے تو حکم ترک تمنا سنا دیا
کس دل سے آہ ترک تمنا کرے کوئی

مجھے پینے دے، پینے دے کہ تیرے جام لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے کچھ اور ہے کچھ اور ہے ساقی

حسن کا غم بھی حسیں، فکر حسیں، درد حسیں
ان کو ہر رنگ میں ہر طور سنورجانا تھا

میری شب اب میری شب ہے میرا بادہ میرے جام
وہ مرا سرو رواں ماہ تمام آہی گیا

مجاز کے اکثر تنقید نگاروں کی رائے ہے کہ مجاز کی غزلوں میں فکر وفلسفہ بلند تخیل اور ادراک کی کمی کا احساس ہوتا ہے جو کسی بھی بڑے غزل گو شاعر کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ مجاز کی انفرادیت ہے کہ انھوں نے باوجود تمام سیاسی حالات کے اپنی غزلوں میں واعظانہ اور خطیبانہ اسلوب اختیار نہیں کیا نہ ایسا انداز بیان اپنایا اور نہ ہی فلسفیانہ تخیل کے اظہار کے لیے اپنی غزلوں کو گنجلک اور پھیکی ہونے دیا۔ اس کی اچھی غزل ان خصوصیات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنی غزلوں کو واردات قلبی کے اظہار کے لیے وقف رکھا ساتھ ہی واردات قلبی کا اظہار بھی اتنے سادہ اور پُرکارانہ انداز میں کیا ہے کہ یکسر یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ شاعر اپنے دوستوں کی انجمن میں بیٹھا ہوا بزم دوشینہ کے افسانے سنا رہا ہے۔ اس کی باتیں ناصحانہ اور فلسفیانہ نہیں بلکہ دل پر گزرے ہوئے واقعات ہیں جسے سنا کر وہ اپنے غم میں دوسروں کو بھی شریک کر لینا چاہتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس میں تفکر اور فلسفیانہ گہرائی کی کمی ہو لیکن پڑھنے والا اس کے انداز بیان کی اثر انگیزی اور سحر طرازی، اس کے واردات قلبی کی صداقت اور الفاظ کی سحر کاری وحسن میں چند لمحوں کے لیے ضرور کھو جائے گا۔ یہ بات اور

ہے کہ اس کا اثر دیر پا نہ ہو۔ لیکن کچھ اشعار ایسے بھی ملیں گے جن کی بازگشت
صدیوں تک گونجتی رہے گی۔ ؎

اس محفلِ کیف مستی میں، اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

عشق کا ذوق نظارہ مفت میں بدنام ہے
حسن خود بے تاب ہے جلوہ دکھانے کے لیے

ہائے انجام اس سفینے کا
ناخدا نے جسے ڈبویا ہے

ابھی بزم طرب سے کیا اٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پر نم نہیں ہے

ان اشعار کی اثر انگیزی اور جذبے کی صداقت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟ کسے یہ آواز دل پذیر اور اپنے دل کی دھڑکن نہیں محسوس ہوتی؟

مجازؔ کی غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت الفاظ کی نرمی، نغمگی، بیان کی سادگی، نشتریت اور لب و لہجہ کا آہنگ ہے۔ مجازؔ کو الفاظ کی دار و بست کا بھی بہت خیال تھا۔ انھوں نے کبھی ثقیل و دقیق الفاظ استعمال نہیں کیے۔ ان کی فارسی دانی مسلّم ہے ان کے یہاں فارسی الفاظ و تراکیب کا بہت ہنرمندانہ استعمال جا بجا ملتا ہے لیکن فارسیت اس حد تک حاوی نہیں تھی کہ غنائیت اور سادگی کو نقصان پہنچ جاتا اور کلام میں ثقالت پیدا ہو جاتی۔ اس کے برخلاف مجازؔ نے اپنی غزلوں میں سرشاری۔ مدہوشی سکون اور سہولت کی وہ فضا پیدا کر دی ہے جو بہت کم فن کاروں کو نصیب ہو پاتی ہے۔

مجازؔ کی غزل کی دنیا حسن و عشق کی دنیا ہے لیکن یہ عشق مجازی ہے

اس نے تصوف کا رنگ نہیں لیا لیکن اس مجازی عشق نے کبھی مریضانہ ذہنیت اور جنسیت اور لذت پرستی کی شکل نہیں اختیار کی ساتھ ہی اس پر یاسیت و قنوطیت کا رنگ بھی غالب نہ آسکا ہے

تمھیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں

بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گذر چکا ہوں میں

آشفتگیٔ وحشت کی قسم، حیرت کی قسم حیرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں، ہم راز تبسم پا بھی گئے

ہم عرض وفا بھی کر نہ سکے، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں کھولی ہی نہ تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

ابھی بزم طرب سے کیا اٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے

حُسن اک کیفِ جاودانی ہے
اور جو چیز ہے وہ فانی ہے

حُسن کے دن بھی کیف پرور ہیں
حُسن کی رات بھی سُہانی ہے

دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طراز شوق
لے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم

مٹا دیا ہے مجھے عشق نے مجاز مگر
ستانے والے ابھی تک ستائے جاتے ہیں

کیا ہوا میں نے اگر ہاتھ بڑھانا چاہا
آپ نے خود بھی تو دامن نہ بچانا چاہا

یوں تو افسانۂ الفت تھا ازل سے رنگین
ہم نے کچھ اور بھی رنگین بنانا چاہا

یوں تو مجاز کی غزل کی دنیا بہت مختصر ہے لیکن سوز و ساز درد و گداز، سپردگی و دارفتگی کو مجاز نے جس خوبی سے اشعار میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ ان کے لہجے کی نرمی، الفاظ کی شیرینی و سادگی و غزلیت ان کی غزلوں کا باکمال وصف ہے۔ ان کی تقریباً تمام غزلوں کا رنگ نشاطیہ ہے جس میں کہیں یاسیت اور قنوطیت کی پرچھائیں نہیں ملتی بلکہ جوش و بانکپن سرکشی و سرمستی کی فضا نظر آتی ہے۔ جوانی کی امنگیں، شوق کی بے باکی جنوں کی بلند حوصلگی، جذبات کی مصوری نے ان کی غزلوں کو وہ رنگ و آہنگ بخشا ہے جو کبھی بھی ختم نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر دور اور ہر زمانے میں تازہ و شاداب رہے گا۔

دل دھڑک اٹھتا ہے خود اپنی ہی آہٹ پہ مجاز
اب قدم منزل جاناں سے بہت دور نہیں

مجاز کی غزلوں میں غالب کی سی طراری اور بانکپن بھی ملتا ہے۔ جو ان کی افتاد طبع کی سرکشی اور اٹھان کی ضامن ہے اور اردو کی جدید غزل میں جو انقلابی بانکپن آیا ہے بقول ممتاز حسین "اس کی بنیاد مجاز ہی نے رکھی تھی"[1] کیونکہ داخلیت اور موسیقیت کے ساتھ خارجی حالات کے اثرات نے مجاز کی شاعری میں سرکشی و سرشاری کے امتزاج سے ایک بانکپن پیدا کر دیا ہے: ؎

برائیں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے
اڑتے خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم

---

[1] حریف جبریل از ممتاز حسین۔ مجاز ایک آہنگ۔ ص ۴۱۵

ہٹ کر چلے ہیں رہ گذر کارواں سے ہم

کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھیے

الجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم

دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طرازِ شوق

لے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم

حسن اور عشق کو دے طعنۂ بیداد مجاز

تم کو تو صرف اسی بات پہ مرجانا تھا

آج بھی ہے لکھی ہوئی سرخ حروف میں مجاز

دفترِ شہریار میں میرے جنوں کی داستاں

مجاز بحیثیت نظم نگار

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
زندگی بدلے گی سب ساز بدل جائیں گے
گانے والوں کے بھی انداز بدل جائیں گے

(اقبال)

زندگی اور اس کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کا انداز بھی بدلا۔ اردو ادب کی تاریخ میں ایسی عہد آفریں نسلوں کا فقدان نہیں جنھوں نے اپنے ادبی ورثے کو نئی دنیا کی آرائشوں سے آراستہ و پیراستہ نہ کیا ہو۔ آزاد و حالی اور اس نسل کے بیشتر شعرا نے اپنے محسوسات اور متنوع موضوعات کی ترجمانی کے لیے نظم کو ہی اپنایا اور اس کے بعد اقبال، جوش اور چکبست وغیرہ نے بھی عصری تقاضے سیاسی تحریکات اور حصول آزادی کے لیے نظم کے پیرایہ کو ہی بہتر اور موزوں سمجھا کیونکہ گوناگوں موضوعات اور متضاد نظریات کا اظہار و بیان بغیر نظم کے پیرایہ کے ممکن نہ تھا۔ مجاز کی نسل بھی ایسی خلاقانہ صلاحیتوں کی حامل تھی اس کے تئے اپنے ماضی کی روایاتی دنیا سے نکل کر جہانِ نو کو خوش آمدید کہا اور دنیا کی نئی تفسیر لکھنے پر رضامند ہوا:

"ایلیٹ اور ڈاردن کا آوارہ تفکر اور فرائڈ کی مجہول حیوانیت اور جنسیت اور مغربی رومان نگاروں کی فکری کجروی کے ہاتھوں یہ کارواں اَن دیکھی دنیاؤں میں بھٹک رہا اور

آخر کار مارکس کی رہنمائی میں انسانی کردار کے ہاتھوں دنیا کی نئی تفسیر لکھنے پر رضامند ہوا۔" ؎۱

اس نئی تفسیر حیات کے لیے نظم کا پیرایہ اختیار کرنا لازم ہو گیا۔ مجاز نے اپنی شاعری کی ابتدا ہلکی پھلکی رومانی غزلوں سے کی تھی لیکن فوراً ہی جب ان کا انداز فکر بدلا تو غزل کے پیرایہ کو تنگ دامانی جان کر نظم کا پیرایہ اظہار اختیار کیا۔

نظموں کی ابتدا بھی رومانوی انداز سے کی جس میں خالص غنائی و جذباتی اور نشاطیہ رنگ غالب ہے۔ اس ضمن میں "مجبوریاں"، "کس سے محبت ہے"، "نورا"، "آج کی رات"، "بتان حرم"، "نمائش"، "ایک غمگین یاد" جیسی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں بعض لوگوں کو گہرائی اور وزن کی کمی محسوس ہو سکتی ہے۔ لیکن جذبے کی صداقت اور خلوص جو رومانی شاعر کے خاصے ہیں جا بجا نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی ان نظموں میں واردات قلبی اور عصری شعور کا پرتو بھی ہے لیکن ان کے اظہار میں کہیں بھی مرلفیانہ جذباتیت، سستی جنسیت و جذبہ پرستی شامل نہیں ہونے پائی بلکہ ایک پسندیدہ حسن کا پرتو ہے۔

"جشن سالگرہ" میں ایک نوخیز دوشیزہ کی فطری پیکر تراشی بے الفاظ کی تراش خراش ایسی ہے کہ معصومیت کا مجسمہ ابھرتا ہے ؎

اک مجمع رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی
بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

فطرت نئے جذبات کے در کھول رہی ہے
میزان جوانی میں اسے تول رہی ہے
لب ساکت و صامت ہیں نظر بول رہی ہے

۱؎ مجاز اور عشق۔ از قاضی عبدالستار۔ مجاز ایک آہنگ۔ ص ۵۲،

سرشار نگاہوں میں حیا جھوم رہی ہے
ہیں رقص میں افلاک زمیں گھوم رہی ہے
شاعر کی دعا بڑھ کے قدم چوم رہی ہے

اور نظم کے آخر میں الفاظ اتنے شدید ہیں کہ شاعر کے جذبہ کی صداقت کا اظہار ہوتا ہے: ؎

جھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

مجازؔ کی نظم "نذرِ خالدہ" بھی پیکر تراشی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے اس میں پختگی اور رچاؤ تکمیل کی حدوں کو چھو رہے ہیں: ؎

نرم صوفے گود میں فردوس رعنائی لیے
زلف کے خم مرمریں شانوں کی برنائی لیے
وہ حسیں پیشانیاں آئینہ تمکین ناز
وہ رسیلی مدھ بھری آنکھیں وہ مژگان دراز
وہ سُبک چاندی سے پیکر وہ جوانی کا نکھار
آذرِ فطرت کی صناعی کے زندہ شاہکار
رخ پہ شادابی لبوں میں رس تبسم ہر تی پاش
چُست پیراہن نمایاں جسم سیمیں کی تراش
آنچلوں کی سرسراہٹ زمزمے گاتی ہوئی
پیرہن سے نکہتِ خلد بریں آتی ہوئی

"آج کی رات" میں اس کی سرشاری و خرد شِ جذبات عروج پر نظر آتے ہیں ساتھ ہی فنی و ذہنی پختگی کا بھی پتہ ملتا ہے: ؎

دیکھنا ہے جذبِ محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات
نور ہی نور ہے کس سمت اٹھاؤں آنکھیں

حسن ہی حسن ہے تا حدِ نظر آج کی رات

نغمہ و مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہیے

گھر میں مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات

اپنی رفعت پہ جو نازاں ہیں تو نازاں ہی رہیں

کہہ دو انجم سے کہ دیکھیں نہ ادھر آج کی رات

ان نظموں میں صرف مزاج کی رومانیت اور خیال پرستی ہی نہیں بلکہ شاعر کے جمالیاتی مرقع خانوں سے نکلے ہوئے شاہکار ہیں جو اس کے حسین تجربات کے ترجمان نظر آتے ہیں جس کی بنا پر اس کی صحت مندی و توانائی ملتی ہے۔ مادی دنیا کی حقیقتوں اور خارجی دنیا کے محسوسات کی پرورش شاعر کے تہہ خانوں میں ہوئی ہے جس کا عکس ان نظموں میں جھلکتا ہے:

زباں پہ بے خودی میں نام اس کا آہی جاتا ہے

اگر پوچھے کوئی یہ کون ہے بتلا نہیں سکتا

کہاں تک قصۂ آلامِ فرقت مختصر یہ ہے

یہاں وہ آ نہیں سکتی وہاں میں جا نہیں سکتا

حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے

کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

اوپر بیان کی ہوئی نظموں میں بیان و اظہار کی پختگی، رنگینی و رنگ آمیزی کی خصوصیات ملتی ہیں۔ شروع سے آخر تک فارسیت کا رچاؤ ملتا ہے مصرعوں میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ بندشوں کی چستی اور خوب صورت ترکیب کے استعمال کی بنا پر کہیں بھی ناپختگی اور کھردرے پن کا احساس نہیں ہوتا ایک روانی سی پہلے مصرع سے لے کر نظم کے آخری مصرعے تک ملتی ہے۔

اس کے بعد مجاز کی شعری و فکری صلاحیتیں ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہیں اور محض رومانیت سے انقلابی رومانیت کی طرف مائل نظر آتی ہیں لیکن ان انقلابی نظموں میں بھی وہی رومان کی سرشاری اور طرب انگیزی ہے

اور ساتھ ہی سوچ و فکر کی شمولیت نے اس دور کی بہترین نظموں کی صف میں لاکر کھڑا کیا ہے۔ خواب سحر۔ آوارہ۔ اندھیری رات کا مسافر۔ سرمایہ داری۔ پردہ اور عصمت۔ نوجوان خاتون سے۔ ترقی پسند شاعری کی کامیاب نمائندہ نظمیں ہیں جنہیں اردو شاعری کے بہترین سرمایہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ نظم "آوارہ" تو مجاز ہی کی نہیں بلکہ اردو شاعری کی شاہکار نظم ہے۔ مجاز نے پہلی بار لفظ "آوارہ" کو اس کے عام مفہوم سے ہٹ کر ایک سرکش اور باغی کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور اس خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے کہ لفظ آوارہ آتے ہی ایک باغی پریشان و مضطرب، سرپھرے نوجوان کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ یہ نظم انقلاب اور رومان کا حسین امتزاج ہے اور اپنے دور کے ہر اس نوجوان کے ذہن کی آئینہ دار ہے جو نظام بادنیہ کی ستم رانیوں کو مٹاکر نئے نظام کے خواب دیکھ رہا ہے۔

مجاز کا ہاتھ حالات کے دھڑکتے سینے پر تھا اس کا مزاج نیا تھا۔ اسکا شعور و ذہن نیا تھا اس کی سوچ نئی تھی اس لیے وہ تمام حالات کی حقیقتوں کی تصویر بھی نئی دیکھ رہا تھا۔ اور یہی نوجوان شاعر جب اپنی محسوسات کی دنیا میں اتنے سارے کرب اتنی ساری ناکامیاں و محرومیاں لیے اپنے شہر کی جلتی جاگتی سڑکوں پر عالم وحشت میں نکل پڑتا ہے تو اس کی نظر متضاد اور مختلف تصویریں دیکھتی ہے۔ وہ حالات کے ہاتھوں تنگ ہوتا ہے۔ نظام کہنہ اور آئین فرسودہ اس کی فطری آزادی کو سلب کر کے اس کی انا کو تازیانے لگاتے ہیں تو اپنا خود کا شہر اور اس کی شاہراہیں جن پر دربدر آوارہ پھرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے، غیر کی بستی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ تمام خوش آیند خواب کے تانے بانے لوٹنے لگتے ہیں اس کی سینہ فگاری جھلملاتے قمقموں کے درمیان زنجیر دیکھتی ہے۔ اس کے قلب و جگر کے زخم اندھیری رات میں اسے دن کی سی روشنی سے لطف اندوز ہونے نہیں دیتے۔ ایسے ہیجانی ذہن کی کیفیت کی ترجمانی اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔ ع

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

نوجوان شاعر کی اشکیں حرماں نصیبی اور غم و اندوہ کا شکار ہیں تمام عیش و عشرت کسی کے لیے ہوں وہ ان سے محروم ہے اور اس کا احساس اسے چوٹ پر چوٹ دیا جاتا ہے اب اس حرماں نصیب نوجوان کے سامنے چارہ کار ہی کیا رہ جاتا ہے ؟ سکون کی تلاش میں اس کا مضطرب دل کبھی میخانہ کبھی کاشانۂ شہناز کا سہارا ڈھونڈنے پر اور کبھی گھبرا کر مجنوں کی پیروی کرنے پر مجبور نظر آتا ہے ۔

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اسی نوجوان کو عشق کی ذاتی ناکامی و نامرادی کا بھی سامنا ہے اس کی وجہ بھی وہی اہل ثروت اور اس کا نظام ہے ۔ دولت کی پروردہ اونچ نیچ کی دیوار حائل ہونے کی بنا پر اپنے کو عشق میں ناکام پاتا ہے ۔ رسوائیوں کا سامنا ہے،

بقول قاضی عبدالستار صاحب :۔

"یہ حریری خواب تعبیر کی خار دار وادیوں میں آتش زیر پا ہونے سے پہلے ہی پُرسوز فکر کے ہاتھوں جھلس جاتا ہے کیوں کہ اس کے خیالوں کی شہنانہ غیر مساویانہ طبقاتی تقسیم کے آہنی قلعہ میں اسیر ہے۔ دولت کا مہیب دیو اپنی پشت پر مجہول روایات اور بوسیدہ اقدار کا لشکر لیے دربانی پر کھڑا ہے۔ گرمیٔ خیال کے آبگینوں اور بے خواب آنکھوں کے جھوٹے موتیوں کے سوا اس کے دامن میں کچھ بھی نہیں ہے۔[1]

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پہ عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پوری نسل ایک دوراہے پر کھڑی تھی اور اس کا نوجوان اپنی فطرت تیز رفتاری سے مجبور سرکشی اور وفاداری کا پتلا اپنے کو نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی حالت میں پاتا ہے اور کرب سے اس کے اندر شدتِ احساس جاگ اٹھتا ہے۔

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں میری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لیے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لیے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

---

[1] مجاز اور عشق (از قاضی عبدالستار۔ مجاز ایک آہنگ۔ ص ۷۰۔۵۸)

یہ نوجوان عاشق ایک مرتبہ محبوبہ کو پانے کا احساس ترک کردینے اور عہدِ وفا توڑ دینے پر اپنے کو آمادہ پاتا ہے لیکن اس سے کیا ہوگا؟ حالات تو نہیں تبدیل ہوں گے؟ ان سوالات کی وجہ سے اس کے خیال کی رَو سماجی و سیاسی استحصال کی طرف چل پڑتی ہے اور اس کے اپنے زخم اجتماعی ہوجاتے ہیں۔ ؎

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ان میں انفرادیت بھی ہے اور شدتِ احساس بھی اور ہندوستان کی اس نوجوان نسل کی ترجمانی بھی۔ بلکہ مجاز نے اپنے طور پر سوچا ہے ایک نسل کے ترجمان کی حیثیت سے محسوس کیا ہے جو اس کو آفاقیت عطا کرتی ہے چاند کو کریہہ صورت بتانا اس کو مختلف دلخراش تشبیہوں سے یاد کرنا جو بذات خود استحصال کرنے والی قوتوں یا استحصال شدہ لوگوں اور مظلوموں کی علامتیں ہیں، ادبی روایات سے بغاوت ہے اب تک یہ ایک مسرور ہونے کی شے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن غم والم میں ایک عالم کو گرفتار دیکھ کر اسے اپنا ذاتی غم بنالیتا ہے اور روایتی باتیں اور انداز اس کی گرفت سے باہر ہوجاتے ہیں اور آسودگی جذبات کے لیے وہ بغاوت کو اپنانے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔

انسانیت کی اس عام زبوں حالی کا احساس کرکے اس کے سینہ کے زخم مہک اُٹھتے ہیں اور اس کا غصّہ و جھنجھلاہٹ تیز تر ہوجاتی ہے۔ اس کے عزائم خطرناک نظر آنے لگتے ہیں۔ چاند تاروں میں اسے کوئی کشش نظر نہیں آتی انھیں مردہ قرار دیتا ہے اور نوچ کر پھینک دینا چاہتا ہے۔ اس چڑچڑاہٹ میں کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے نوچ پھینکنے کی بات سوچتا اور غصّہ کی شدت میں سارے کے سارے نوچ کر پھینک دینا چاہتا ہے ؎

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اِس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں

ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

ان سامانِ عیش و عشرت کو نوچ پھینکنے کی بات سوچ ہی رہا تھا کہ معاً دوسری طرف پوری قوم کی مفلسی و ناداری کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں اور ان کے ذمہ دار جابر حکمرانوں کے خلاف اس کا جوش انتقام انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر اور اس کے تاج کا پتھر توڑنے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔ جبر و استبداد کے ایک ایک نشان مٹا دینے کا متمنی ہے۔ اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا ہے اس کی مردانگی عود کر آتی ہے اور خود ہی بڑھ کر اندر سبھا کے ساز و سامان، جابروں کے گلستاں و شبستاں پھونکنے کے ساتھ ہی اس کے بانیوں کو بھی نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پہ اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اس نظم میں ایک تاریخی شعور کے ساتھ ساتھ ایک دور کی پوری تاریخ سمٹ کر آ گئی ہے۔

مجاز نے متنوع اور نادر تشبیہات اور استعارے اور علامتیں استعمال

کی ہیں۔" رات کے ہاتھوں میں ان کی موہنی تصویر سی" قمقموں کی راہ میں زنجیر، دمکتی ہوئی شمشیر کے استعاروں میں کتنی وسعت ہے۔ کیفیت خاص میں واردات قلبی کا پتہ دے رہے ہیں۔ کچھ ٹکڑے شعری پیکر کے روپ میں تشبیہ کا کام کرتے ہیں جن سے خیالات کی جامع اور بھرپور ترسیل ہوتی ہے۔ جیسے روپہلی چھاؤں، آکاش پر تاروں کا جال۔ صوفی کا تصور۔ عاشق کا خیال۔ چھوٹی پھلجھڑی۔ موتی کی لڑی۔ شہانہ لالہ رخ کا کاشانہ۔ رنگینیاں رعنائیاں۔ گودپھیلائے ہوئے رسوائیاں۔ طوفان بلا۔ عہد وفا۔ زنجیر ہوا محل۔ پیلا ماہتاب۔ ملّا کا عمامہ۔ بنیئے کی کتاب۔ مفلس کی جوانی۔ بیوہ کا شباب۔ زخم سینے کا مہک اٹھا ہے۔ مردہ چاند تارے نوچ لوں۔ سلطان جابر۔ چنگیز و نادر۔ چنگیز کا خنجر۔ گلشن و شبستاں۔ قصر سلطاں۔ تخت سلطاں۔ غم دل۔ وحشت دل۔ یہ سب ایسے ٹکڑے ہیں جو اپنے اندر پوری پوری تصویر یا کہانی چھپائے ہوئے ہیں" کیا کروں" کے ٹکڑے سے جو حسرت و افسردگی ابھرتی ہے اس کا جواب نہیں۔ دوسرے "چاند تارے نوچ لوں" کی نئی بندش مجازؔ نے استعمال کی ہے۔ تارے توڑنا محاورہ ہے اور اچھے کام میں آتا ہے یہاں شاعر جو اضطراری عمل تخریبی رجحان کو دکھانا چاہتا ہے وہ الفاظ کی ان بندشوں کے علاوہ ممکن نظر نہیں آتا جو ایک آرٹ ہے۔ "جی" کا استعمال کر کے نفسیاتی پرکھ کا ثبوت دیا ہے۔ اس بند کے تینوں مصرعے خاص طور پر درجہ بہ درجہ بڑھتے ہوئے غصہ و اضطراب کے مظہر ہیں۔ اور تیسرے مصرعے میں یہ کیفیت اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے اور پھر حسرت بھرے ٹکڑے کی تکرار مزا دے جاتی ہے۔ ویسے تو اس نظم کا ہر بند اسی خصوصیت کا حامل ہے جس سے ایک موسیقی کا سماں بندھ جاتا ہے۔

اس پوری نظم میں کہیں بھی بناوٹ اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ آوارہ کی زندگی جیسے جیسے مطالبے اور تقاضے کرتی جاتی ہے شاعر ان کو پورا کرتا جاتا ہے۔ جس سے ان میں خیالات کا تسلسل قائم ہے اور نظم ایک اکائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی بندشوں، ترکیبوں اور لفظوں میں ایک ندرت ہے، اور آورد کی جگہ آمد کا احساس ہوتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب شاعر کے

نہاں خانوں سے کسی خاص کیمیاوی اثر کے تحت ڈھل کر نکل رہے ہوں۔

"اندھیری رات کا مسافر" بھی مجاز کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے حسرت وغم اور جوش وخروش سے پُر الفاظ مجاز کے دل سے اُبلے پڑتے ہیں گویا یہ از دل خیزد بر دل ریزد کے مترادف ہیں۔ تین تین مصرعوں کے بعد کورس کی طرح ایک مصرعے کی تکرار سے غم کے تاثرات کے ساز بج اٹھتے محسوس ہوتے ہیں۔ اور اندھیری رات کا مسافر اسی ساز پہ گاتا ہوا بڑے عزم وحوصلے کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہے ؎

فضا میں موت کے تاریک سائے تھرتھراتے ہیں
ہوا کے سرد جھونکے قلب پر خنجر چلاتے ہیں
گذشتہ عشرتوں کے خواب آئینہ دکھاتے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

اس نظم کا پس منظر بھی ذاتی حرماں نصیبی اداسی اور زبوں حالی کے ساتھ ساتھ اس وقت کی کشاکش تھی جس میں ہندوستان کی نئی نسل اٹھ رہی تھی، نیا ہندوستان جنم لے رہا تھا۔ منزل کو جانے والی تمام راہیں پر خطر تھیں۔ ان میں بے شمار نشیب وفراز اور اَن گنت دشواریاں حائل تھیں۔ لیٹرے تعاقب میں تھے اور چٹانیں راستہ روکے کھڑی تھیں لیکن سر پھرے باغی نوجوان منزل کی طرف گامزن تھے اُن کے عزائم اُن پرخطر فضاؤں اور مصائب کے گھٹاؤں کی پروا نہیں کرتے وہ تو ہر قربانی دے کر اپنی منزل پا جانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف دوسری جنگ عظیم کے بادل بھی اسے منڈلاتے نظر آنے لگے تھے۔ اس سے قبل کے یہ جنگ چھڑے اور اپنی تباہی پھیلائے وہ اپنی منزل کو پالینا چاہتا تھا یہ نظم مجاز کی شخصیت وآرٹ کی نمائندہ ہے۔

"رات اور ریل" میں شاعر نے حرکت دوام اور ارتقاء حیات کو اجاگر کر دکھایا ہے اس کی روانی جوش اور جدت طرازی نے رات میں چلتی ہوئی ریل کے مناظر ہو بہو آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ریل کی رفتار کے ساتھ الفاظ کے بدلتے ہوئے جوش اور رفتار کا احساس ہوتا ہے اس کے چلنے کے ڈھنگ کو اس

ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے کہ جس طرح ریل لہراتی بل کھاتی چلتی ہے اسی طرح کے الفاظ کا انتخاب بھی کیا ہے۔ ریل کی رفتار جہاں تیز یا دھیمی ہوتی ہے۔ الفاظ میں بھی تیزی آجاتی ہے یا مدھم ہو جاتے ہیں۔ حقیقی مشاہدوں کو بہت خوبی سے سمویا ہے جب ریل اسٹیشن سے چلتی ہے۔ پٹریاں بدلتی ہوئی آہستہ خرامی کا مظاہرہ کرتی ہے تو اس کی چال میں ایک مستانہ روی کا احساس ہونے لگتا ہے اور رات کے سناٹے میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کی تصویرکشی و عکاسی بھی خوب صورت الفاظ میں کی ہے۔ لفظوں سے متحرک تصویریں بنانا ایک آرٹ ہے جسے مجازؔ نے اس نظم میں بخوبی برتا ہے جس کے لیے ایسی نئی نئی تراکیب کا استعمال ہوا ہے جو صرف مجاز کی جدت آفریں خداداد طبیعت ہی اختراع کر سکتی تھی۔ جا بجا تشبیہ تو ادر استعاروں کی ندرت کا نور بکھرا پڑا ہے ؎

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خاموشی میں زیر لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی جھومتی سیٹی بجاتی کھیلتی
وادی کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرود دلنشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی

اس نظم میں استعمال کی گئیں ترکیبیں اور ٹکڑے کہیں خوب صورت جامد پیکر کہیں متحرک پیکر نظر آتے ہیں۔ آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا پورا متحرک منظر پیش کر دیتے ہیں۔ دلہن اپنی ادا سے آپ شرمائی ہوئی، ایک خوب صورت پیکر پیش نظر آجاتا ہے۔ ستارہ ٹوٹ کر رواں ہو عرش سے، رخش بے عناں کی برق رفتاری۔ پہاڑوں پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک، بیچ ندی میں چراغاں کا سماں۔ جستجو آمیز نظریں۔ سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے۔ یہ سب ایسے ٹکڑے ہیں جو پورے سیاق و سباق کے ساتھ رنگ بھری تصویریں آنکھوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں جو شاعرانہ تجربے کی جمالیاتی نوعیت کا پتہ دیتے ہیں۔ حنیف فوق کی رائے میں:" پھر پور کیفیت اور اتفاقی صورت اور صناعانہ تکمیلیت کو

کو پیش کرتی ہے" [1]

اس نظم میں شاعر نے بلند تخیل سے کام لے کر ریل کو ایک علامتی شکل دیدی ہے۔ کیوں کہ محض ایک ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی محو خرام ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ انسانی زندگی کا پرتو بنتی جاتی ہے اور اس کے ہاتھ میں علم بغاوت نظر آنے لگتا ہے۔ وہ زندگی، جدوجہد اور انقلاب کی علامت بن کر سامنے آجاتی ہے۔ ان تشبیہوں استعاروں اور ٹکڑوں سے ایسی جیتی جاگتی تصویر کشی کرنا مجاز کی خلاقانہ طبیعت اور فنانت کا پتہ دیتی ہے۔ حنیف فوق کی زبان میں "قوت اختراع اور تجسیم تخیل کی پرکاری" کا نام دے سکتے ہیں [2]

خواب سحر بھی فنی اعتبار سے اچھی نظم ہے۔ اس میں ٹھہراؤ ہے اس کا ترنم اور آہنگ برقرار ہے۔ اس کی دھن میں وہی سرشاری اور سرمستی باقی ہے جو اس کی رومانیت کی شان ہے۔ کہیں بھی اس کے سُر دلے میں دھیما پن واقع نہیں ہوا بتناسب الفاظ کا انتخاب اور سہولت اظہار ملتا ہے۔ محدود خیالی اور لفظوں کی بے جا بھرمار نظر نہیں آتی۔ اس نظم میں مجاز نے ایک تعمیری انقلاب کے اسباب و آثار کو انقلاب روس کی شکل میں دیکھا ہے اور اسی کا تجزیہ پیش کیا ہے کہ آدمیت بہ ہزاراں مصائب و آلام اس انقلاب خوش آیند کے قدموں کی آہٹ محسوس کر رہی ہے جس کے لیے وہ صدیوں سے منتظر اور بے چین تھی ہے

اِک نہ اِک در پہ جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگ زرگری جاری رہی
اہل باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے

---

[1] مجاز کی انقلابی رومانیت از حنیف فوق ص ۱۳۱ (مجاز ایک آہنگ) /

[2] ایضاً ایضاً ایضاً

یہ مسلسل آفتیں یہ یورشیں یہ قتلِ عام
آدمی کب تک رہے اوہام باطل کا غلام
ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک، اُدھر دیکھا تو ہے

"نذر خالدہ" کے ایک مصرعے سے خالدہ خانم کی جامع اور بھرپور تعریف کرکے دو ٹکڑوں کی مدد سے دو جامع افعال کو بھی اجاگر اور واضح کیا ہے۔ ع
روح عشرت گاہ ساحل، جان طوفانِ عظیم

یہی دونوں رخ مجاز کی شاعری کی جان بھی ہیں اور ان کی سمت بھی۔ اس میں عشرت پسندی سرفروشی دونوں موجود ہے۔ ایسے ٹکڑوں سے انتہائی سرکشی اور رقابیہ میں نہ آنے والے خیالات و تصورات کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں اس آگہی کا پتہ بھی ملتا ہے جس سے وہ جذبات کی رو اور اسکے اظہار پر قادر تھے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کو مسلم تہذیب و تعلیم کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ مجاز چونکہ خود اس ادارہ علمی سے وابستہ تھے اور انھیں اس سے ایک خاص انسیت اور لگاؤ تھا لہذا انھوں نے اس کی تہذیبی عظمت کا ترانہ بڑی شان سے گایا ہے اور ایسی تصویر کشی کی ہے کہ شروع سے آخر تک سماں بندھ جاتا ہے۔ اس ادارے کی تمام تر خصوصیات کو بڑے تمثیلی اور علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں قومی بین قومی سطح پر آتی ہوئی تبدیلیوں اور انقلاب کو محسوس کیا گیا۔ جدید نظریات و خیالات خوش آمدید کہے گئے۔ ساتھ ہی اسلامی تعلیم و تہذیب یہاں کی مجموعی تہذیب کا بنیادی جزو رہی ہے۔ ع

ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغر نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی ابلتی ہے

جو طاق حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں کبھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشہ گوشہ سے اک جوئے حیات ابلتی ہے

اس نظم میں پورے ماحول کے حیرت انگیز حسن اور سحر کاری کا نقشہ کھینچا ہے ؎

یاں حسن کی برق چمکتی ہے یاں نور کی بارش ہوتی ہے
ہر آہ یہاں اک نغمہ ہے ہر اشک یہاں اک موتی ہے
ہر شام ہے شامِ مصر یہاں ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں
یہ دشت جنوں دیوانوں کا یہ بزم وفا پروانوں کی
یہ شہر طرب رومانوں کا یہ خلد بریں ارمانوں کی
فطرت نے سکھائی ہے ہم کو افتاد یہاں پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں

مجاز نے اس نظم کے چند اشعار میں ان الزامات کا جواب دیا ہے جو اُن دنوں وہاں کے ارباب حل و عقد یونیورسٹی کے اولڈ بوائز پر لگاتے تھے کہ وہ خلافت کے زمانے کی طرح علی گڑھ کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ ؎

آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے
یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شب خوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اتارے ہیں

آخر کے چند اشعار جو بڑے جوش کے ساتھ ادارے کی فیض رساں خصوصیات کا پرتو دیتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ سرزمین ہمیشہ کی طرح تمام اپنوں اور غیروں کو فیضیاب کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی :۔ ؎

جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا ہر کوہ گراں پر برسے گا

ہر سر دشمن پہ برسے گا ہر دشت و دمن پہ برسے گا

خود اپنے چمن پہ برسے گا غیروں کے چمن پہ برسے گا

ہر شہر طرب پہ گرجے گا ہر قصر طرب پہ کڑکے گا

یہ ابر ہمیشہ برسا ہے یہ ابر ہمیشہ برسے گا

نظم اعتراف ان کی دوسری شاہکار نظم ہے جو صرف ان کے ذاتی غموں اور شکست کی ہی آواز نہیں ہے بلکہ اس ٹوٹے ہوئے ساز کی غمگین لَے ہے جس میں اس کے پورے دور اور نسل کا کرب پنہاں ہے یہ خوابوں کی آوازِ شکست ہے۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی :

"جشن سالگرہ سے لے کر ایک غمگین یادتک جو مکمل عورت مجاز کی محبت اور پرستش کا محور رہی ہے، وہ ایک بار پھر نمودار ہوتی ہے لیکن اس وقت جب پانی سر سے گزر چکا تھا اور زندگی کے نشے سے چور رہنے والا مجازؔ محض ایک خاک کا ڈھیر ہو کر رہ گیا تھا۔ جوشؔ کا یہ شعر ؎

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب

تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ممکن ہے محض تخیل کی پیداوار ہو۔ لیکن مجازؔ کی نظم اعتراف اس کیفیت کا ایسا کرب انگیز اظہار ہے جس کی شدت اور بے پناہ تاثر ہماری شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔"[۱]

بقول منظر سلیم یہ نظم ۱۹۴۵ء میں اس واقعہ کی یادگار ہے جب یہ خاتون دہلی سے لکھنؤ آئی تھیں[۲] اور اس وقت شاعر اپنی زندگی کی بازیافت کے لیے آواز بھی دینا گوارہ نہیں کرتا۔ کیونکہ جب وہ پلٹ کر اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی امنگیں سرد اور اس کے ارمان و حوصلے ٹوٹ چکے ہوتے ہیں۔ خوابوں کی دنیا حقیقت کے سنگ گراں سے ٹکرا کر چور ہو چکی ہوتی ہے اپنی کامیابیوں میں

---

[۱] مجاز کی شاعری میں عورت کا تصور از خلیل الرحمٰن اعظمی علی گڑھ میگزین۔ مجاز نمبر

[۲] مجاز۔ حیات و شاعری۔ از منظر سلیم۔ ص ۱۵۳

چھپی ہزیمتوں کو یاد کرتا ہے۔ اپنے ناکام عشق کی گم کردہ منزل اور راہوں پر نگاہ ڈالتا ہے جس نے اس کی متاعِ حیات یکسر چھین لی۔ اس میں جینے کا حوصلہ باقی نہ رہا اور خلوص دل سے اپنے محبوب کے سامنے اپنی کھوئی ہوئی زندگی، جوانی اور حسن کا اعتراف کرلیتا ہے یہ اس کی عالی دلی و ہمت مردانہ کا ثبوت ہے۔ اس کے اعتراف میں اس کی نسل کی خزاں رسیدگی کا پتہ ملتا ہے۔ زندگی اور اس کے تمام شعبوں میں خلوص کا فقدان ہو چلا تھا۔ سیاست مکر و فریب کا نام پا رہی تھی۔ زندگی کی معصومیت و دلکشی شرابِ تند بن گئی تھی۔ اس کی عمارت کی بنیادیں کھوکھلی قرار دی جانے لگی تھیں۔ جنتِ شوق آفات سموم میں گھری ہوئی تھی۔ شاعر شدت احساس سے بیتاب ہو کر کہہ اٹھتا ہے ؎

میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو

مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
مری فریادِ جگر دوز مرا نالۂ زار
شدتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار

وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

نظم "فکر" مجاز کی زندگی کے آخری ایام میں لکھی گئی جب کہ ان کا ولولہ اور جوش و خروش سرد پڑ چکا تھا۔ سچ پوچھیے تو وہ خود ایک خاکستر کا ڈھیر ہو کر رہ گئے تھے لیکن پھر بھی نہ جانے کہاں سے وہ دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور اس نظم میں بھی مجاز کا کھویا ہوا عزم اور حوصلہ ہے جس نے

انھیں مٹ کے برباد جہاں ہونے کے باوجود زیاں کا احساس نہ ہونے دیا اور یہ کسی تازہ جنونِ تعمیر ہی کی کارفرمائی تھی جس نے ان کے دل مضطر کو جس میں کچھ بھی باقی نہ تھا، آماجگہِ یاس نہ بننے دیا ے

نہیں ہر چند کسی گمشدہ جنّت کی تلاش
اک نہ اک خلدِ طرب ناک کا ارماں ہے ضرور
بزمِ دوشینہ کی حسرت تو نہیں ہے مجھ کو
میری نظروں میں کوئی اور شبستاں ہے ضرور

مٹ کے برباد جہاں ہو کے سبھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں
کارفرما ہے کوئی تازہ جنونِ تعمیر
دل مضطر ابھی آماجگہِ یاس نہیں

یہ نظم مجاز کے گہرے فکر و شعور کا پتہ دیتی ہے۔ اس میں شاعر کے ماضی کا کرب، حال کی ناآسودگی، مستقبل کے خوش آئند تصور کی جھلک ملتی ہے کہیں ماضی کا کرب اس کو یاسیت میں ڈال دیتا ہے اور کہیں مستقبل کا خوش آیند خیال اس کے دل میں امید عزم اور جذبۂ عمل پیدا کر دیتا ہے۔ بقول خود مجاز کے "اس نظم کے تانے بانے میں گمشدہ عشرتوں سے بے نیازی۔ ایک نئی جنّت کا خواب۔ اس کی تعمیر کا حوصلہ انفرادی و ذاتی امنگیں جذباتی کشمکش اور اس کے ساتھ ساتھ اجتماعی عشرت کے لیے انفرادی جذبہ کسی حد تک کار فرما ہے اس کی جھلک ملے گی"۔ اب آپ بھی شاعر کے ذہنی و فکری تانوں بانوں سے محظوظ ہوں۔ ے

تازہ دم بھی ہوں مگر پھر یہ تقاضا کیوں ہے
ہاتھ رکھ دے مرے ماتھے پہ کوئی زہرہ جبیں
ایک آغوشِ حسیں شوق کی معراج ہے کیا
کیا یہی ہے اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

میں نے سوچا تھا دشوار ہے منزل اپنی
اک حسیں بازو سیمیں کا سہارا بھی تو ہو
دشت ظلمات سے آخر کو گزرنا ہے مجھے
کوئی رخشندہ و تابندہ ستارہ بھی تو ہو

آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا
جل بجھے کتنے خلیل آگ گلستاں نہ بنی
ٹوٹ جانا در زنداں کا تو دشوار نہ تھا
خود زلیخا ہی رفیق مہ کنعاں نہ بنی

یہ ایں انجام وفا اُف یہ تقاضائے حیات
زندگی وقف غم خاک نشیناں کر دے
خون دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خون دل نذر چمن بندی دوراں کر دے

تکمیل اظہار فن کے اعتبار سے بڑی چیز ہے لیکن ترجمانی کی منزل اس سے کچھ سوا ہی ہے اور مجاز اس کا بھی حق پوری طرح ادا کرتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی نظم "بربط شکستہ" کو ہی لے لیجئے اس میں ایک خاص طرح کی تکمیل کا احساس ملتا ہے، ایسی تکمیل کہ اس کے بعد پھر کوئی کمی یا تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ ایک لفظ بھی بھرتی کا نہیں معلوم ہوتا، حشو در دایت سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے اس نظم کی صداقت، نوسیت اور تسلسل کے اوصاف جاذب توجہ ہیں ساتھ ہی اس کا لہجہ بھی عین فطری ہے جو اسے ایک مکمل اظہار کی حیثیت عطا کرتا ہے۔ بہ قول غالب:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس طرح اس نظم میں صرف مرکوزیت اور اظہار ہی نہیں بلکہ یہ کار سادگی کے ساتھ جذبات کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے کہ ترجمانی کا حق ادا ہو جاتا ہے ۔

بربطِ شکستہ

اُس نے جب کہا مجھ سے گیت اک سنا دو نا
سرد ہے فضا دل کی، آگ تم لگا دو نا
کیا حسین تیور تھے کیا لطیف لہجہ تھا
آرزو تھی، حسرت تھی حکم تھا تقاضا تھا
گنگنا کے مستی میں ساز لے لیا میں نے
چھیڑ ہی دیا آخر نغمۂ وفا میں نے
یاس کا دھواں اُٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی بربطِ شکستہ سے

اس میں ایک منظر ہے، ایک واقعہ ہے، ایک روداد ہے، روایت و حقیقت ہی نہیں سماجی و نجی حقیقت بھی ہے۔ دل کی دنیا کوئی سیدھی سادی دنیا نہیں بلکہ انتہائی پر پیچ دنیا ہوتی ہے اس لیے اس کی گہرائی تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ یہاں اسی دل کی دنیا کا اظہار اور ترجمانی ہے جو ایک وجدانی کیفیت اور والہانہ پن طاری کر دیتی ہے۔ اس نظم میں غزل کے فن کا رچاؤ بھی آگیا ہے۔

فن کا مقصود اگر صرف اظہار سمجھیے تو جوشؔ اپنے دور کے نظم کے سب سے بڑے شاعر ہیں لیکن جیسا بھرپور اور دلدوز اثر مجازؔ کے یہاں ہے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جوشؔ ہمیشہ ایسا اثر نہیں ڈال سکے جوشؔ نے غزلیں بھی کہیں۔ مسلسل اور غیر مسلسل دونوں ہی طرح کی، لیکن وہ ترجمانی کے وصف اور غزل کے فن کے رچاؤ کو نہیں پا سکے۔ مجازؔ کے یہاں فارسی ترکیبوں پر عبور ان کے فن پاروں کو ایجاز و اختصار کا وصف عطا کرتا ہے۔

مجازؔ کے یہاں نظم کا بیانیہ رنگ اور غزل کے چاؤ دل پر قبل ہو، اللہ رکھنے کے اوصاف یک جا ملتے ہیں ــــ ان دونوں متضاد عناصر

مختلف رنگ یا ایسی کیفیات جو ایک دوسرے کے برعکس یا متناقض ہوں مجاز نے ایسے ضدین کے جوڑوں کو ایک مزاج و یک آہنگ کر دیا ہے۔ انھیں حسین امتزاج کی بنا پر مجاز کی فنکاری کی داد دینی پڑتی ہے۔

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق

ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

مجاز نے اپنی فن کارانہ مہارت سے بعض مشکل مراحل بڑی آسانی سے عبور کر لئے ہیں مثال کے لیے کسی ایک حقیقت کا اظہار کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اس کے پس پردہ دوسری حقیقتوں کا انکشاف، جس سے انکے اضداد کی صفات دوہری حقیقت یا تکمیلیت کا احساس ہوتا ہے اگر آپ نظم "خانہ بدوش" کے آخری شعر کو لیجئے ؎

مایوسیوں کی تہہ میں جنوں خیزیاں بھی ہیں

افلاس کی سرشت میں خوں ریزیاں بھی ہیں

مایوسیوں اور افلاس کا اظہار اگر ایک اکہری حقیقت کے طور پر کیا جاتا ہے تو اس کے اثرات حضوری۔ کم مائگی شکستگی، ذبوں حالی اور پستی وغیرہ کے ہی صرف مرتب ہوتے لیکن ان حقیقتوں کے ردعمل میں پیدا شدہ کچھ ایسی حقیقتیں ہیں جو لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں اور بغیر ان کے اظہار کے مدعا اور ترجمانی کا حق پورا نہیں ہوتا اور حقیقتوں کی جامعیت کی ترسیل بھی نہیں ہوتی۔ یہاں مایوسیوں کے ساتھ جنوں خیزیوں اور افلاس کے ساتھ خوں ریزیوں کا ذکر کر کے ایک کھلی ہوئی حقیقت کے ساتھ ردعمل میں پیدا ہونے والی حقیقتوں کا اظہار کچھ ایسے فطری اثرات کے ساتھ کیا گیا ہے کہ دوہری حقیقت اپنی پوری جامعیت کے ساتھ اثر انداز ہوتی ہے جس سے ترسیل کا حق پوری طرح ادا ہو جاتا ہے اس طرح کی دہری حقیقت کی ترجمانی کے آرٹ کو انھوں نے بخوبی اور کامیابی کے ساتھ اپنایا ہے جس سے پورا پورا اثر اور IMPACT پڑتا ہے اور ایسا احساس ہوتا ہے کہ ایک لفظ بھی گویا بے مقصد یا فن برائے فن کی خاطر استعمال نہیں ہوا ہے۔ بقول برنارڈ شاہ:

FOR THE SAKE OF ART I WOULD

NOT LIKE TO WRITE EVEN ONE SENT-
-ENCE.

یا

اقبال کی زبان میں ؎

شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا؟

مجاز ان دوہری حقیقتوں کی ترجمانی سے الم نصیبوں کے دکھ درد کو اجاگر کر کے اس کی ترسیل قاری کے ذہنوں تک کرانا چاہتے ہیں۔

اس سلسلے میں ان کے یہاں فارسی تراکیب کا استعمال ثقل وگرانی نہ پیدا کر کے زبان کی سلاست اور روانی ان کو برقرار رکھتے ہوئے ایک عجیب سی معنویت اور مزہ پیدا کر دیتا ہے اور دوسری حقیقتیں اپنے تضادات کے ساتھ زیادہ واضح طور پر ابھر کر سامنے آجاتی ہیں جیسے "نذرِ خالدہ" کا یہ مصرعہ یا فارسی کے دو ٹکڑے ع

روحِ عشرت گاہِ ساحل، جانِ طوفانِ عظیم

یا

"خوابِ سحر" میں:

آدمی منت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا

عیادت کے دو شعر ؎

پیشانیٔ جمیل پہ انوارِ تمکنت
تابندگیٔ صبحِ درخشاں لیے ہوئے
بیمار کے قریب بصد شانِ احتیاط!
دلدارئ نسیمِ بہاراں لیے ہوئے

"آج بھی" کے چند مصرعے:

شاعرِ محفلِ وفا، مطربِ بزمِ دلبراں

آج بھی جنونِ مرا دیر و حرم پہ خنداں زن
آج بھی مجھ سے بدحواس دیر و حرم کے پاسباں

یا

نظم "لکھنؤ" میں ہے

صبر آزما ہے غمزۂ ترکانِ لکھنؤ
رشکِ زنانِ مصر کنیزانِ لکھنؤ

یا

"اعتراف" میں

جنتِ شوق تھی بیگانۂ آفاتِ سموم

یا

لیلیٰ ناز برافگندہ نقاب آتی تھی

یا

ع میری فریادِ جگر دوز مرا نالۂ زار
ع شدتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
ع میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار

یا

"فکر" کا یہ شعر سے

بہ ایں انجام وفا اُف یہ تقاضائے حیات
زندگی وقفِ غمِ خاک نشیناں کر دے
خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خونِ دل نذرِ چمن بندیِ دوراں کر دے

مجموعی طور پر یہاں بھی مجازؔ کی فن کارانہ عظمت کا لوہا ماننا پڑتا ہے کہ وہ آرٹ کی اس کڑی منزل سے کامیاب گزرے۔

مجاز کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ

شاعری شاعر کی شخصیت کردار و مزاج کی آئینہ دار ہے ساتھ ہی اس میں معاشرہ کی جھلک بھی ہوتی ہے جس میں شاعر کے اپنے فکر و فن کی نشو و نما ہوتی ہے۔ مجاز کی پوری شاعری کا نفسیاتی تجزیہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں ماحول کی عکاسی کے ساتھ ان کے دلی جذبات و کیفیات کا عکس، معاشرہ اور تہذیب کی قدروں کا پرتو شعور اور تحت الشعور پر پڑتا ہے مجاز کی ذہنی نشو و نما اودھ کی اس تعیش پسند تہذیب کی عام فضا میں ہوئی جہاں حسن و عشق کے چرچے اور عیش و عشرت کی فراوانی تھی انھیں عوامل اور ماں سے ملی ہوئی حسن پرستی، جذباتیت اور شوقین مزاجی، جس کا ذکر حمیدہ سالم نے بھی کیا ہے، ان سب نے مل کر ان کی فطرت میں جذبہ حسن پرستی کو جنم دیا اور ان کی شاعری میں جگہ جگہ جس کا اظہار ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان کی شاعری میں جو اس قدر رنگینی و سرکشی اور بانکپن ہے وہ اسی حسن پرست فطرت کی دین ہے۔ شروع ایام کی شاعری کا اگر مطالعہ کیا جائے تو جا بجا حسن و عشق کی سحر طرازیاں اور جلوے بکھرے نظر آئیں گے ؎

عشق ہی عشق ہے دنیا مری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

اور کہیں یوں بھی حسن کو سراہا ہے ؎

حسن اک کیف جاودانی ہے
اور جو چیز ہے وہ فانی ہے

حسن کے دن بھی کیف پرور ہیں
حسن کی رات بھی سہانی ہے

اس حسن کا جادو شاعر پر اس حد تک چلا کہ وہ کہنے پر مجبور ہو گیا ؎

حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈالی ہے

اس حُسن کی کارفرمائی ان کے شروع سے آخر تک کے کلام میں نظر آتی ہے۔ اسی نے "تماشا"، "آج کی رات"، "نذرِ دل"، "مجبوریاں"، "نورا"، "بربطِ شکستہ"، "حسن و عشق"، "ایک غمگین یاد"، "عیادت"، "بتانِ حرم"، "اعتراف" جیسی نظموں کو جنم دیا۔

ماں باپ کے بے حد لاڈ و پیار اور افرادِ خانہ کی بے پناہ محبت نے مجاز میں چاہے جانے کے جذبے کو شدید تر کر دیا تھا اور شاعر طفلی میں بھی یہ آرزو کرنے لگا:۔

طفلی میں یہ آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں

اک روز سوز و ساز کی محفل میں ہم بھی ہوں

دل ہو اسیر گیسوئے عنبر سرشت میں

الجھے انھیں حسین سلاسل میں ہم بھی ہوں

وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ "کسی دل میں ہم بھی ہوں" کی آرزو شدید ہوتی گئی جس نے ان کی شاعری کو پیکر تراشی سے رومان انگیزی کی طرف مائل کر دیا۔ یہ رومان پرور فضا ان کی شاعری اور شخصیت پر مرتے دم تک قائم رہی مجاز نے اپنی شاعری میں جس عشق کا تصور پیش کیا ہے وہ تصور ان کے اُس رومانی جذبے کی دین ہے جس میں عاشق کے دل میں خود کو چاہے جانے کا خیال پیدا ہوتا ہے ان کی شاعری میں انھیں آرزوؤں نے کہیں "نورا" اور کہیں مادام و زہرہ جبیں کی شکل اختیار کر لی ہے:۔

وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی

میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا

مرے بازو پہ جب وہ زلف شب گوں کھول دیتی تھی

زمانہ نکہتِ خلد بریں میں ڈوب جاتا تھا

مرے شانہ پہ جب سر رکھ کے ٹھنڈی سانس لیتی تھی

میری دنیا میں سوز و ساز کا طوفان آتا تھا۔

وہ میرا شعر جب میری ہی لَے میں گنگناتی تھی
مناظر جھومتے تھے بام و در کو وجد آتا تھا
مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جب مسکراتی تھی
مرے ظلمت کدے کا ذرّہ ذرّہ جگمگاتا تھا

"غمگیں یاد" میں شاعر کا تصوّر صاف اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ اگر اپنی محبوبہ سے محبت کا متمنی ہے تو اس کی محبوبہ بھی اس سے شدید محبت رکھتی ہے گویا محبت کی آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔ "نذرِ دل" میں شاعر کا یہ دعویٰ ہے

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں

اور "بربطِ شکستہ" میں ہے

اس نے جب کہا مجھ سے گیت اک سنا دو نا
سرد ہے فضا دل کی آگ تم لگا دو نا
کیا حسین تیور تھے کیا لطیف لہجہ تھا
آرزو تھی حسرت تھی حکم تھا تقاضا تھا
گنگنا کے مستی میں ساز لے لیا میں نے
چھیڑ ہی دیا آخر نغمۂ وفا میں نے
یاس کا دھواں اٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی بربطِ شکستہ سے

"کس سے محبت ہے" میں ہے

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے مجھ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا ہے
مرا ہر شعر تنہائی میں اس نے گنگنایا ہے
سنی ہیں میں نے اکثر چھپ کے نغمہ خوانیاں اکی

اور "شکوۂ مختصر" میں ہے

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی ان زہرہ جبینوں سے

ہوئی جن سے نہ میرے شوق رسوا کی پذیرائی

ان اشعار کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ مجازؔ کے اندر چاہے جانے کا جذبہ کتنا شدید ہے اور اسی جذبے کی تشنگی نے ایک نفسیاتی شکل اختیار کر لی ہے جس کا اظہار انھوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔

مجازؔ کے ذہن میں انسانیت کا تصور بہت واضح تھا۔ اُن کے مزاج اور دردمند دل نے بڑی حد تک جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پائی لیکن اس کے باوجود دردِ انسانی کا پاس و خیال ہمیشہ ان کے ذہن کو کرب میں مبتلا رکھتا تھا اور اشتراکیت سے قربت کی وجہ بھی شاید یہی تھی اور اس کے اثرات کے تحت ان کی رومانی شاعری پر انقلاب کا پرتو نظر آنے لگا اور وہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ؎

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

وہ ذاتی محبت کے غموں سے تو پیچھا نہ چھڑا سکے۔ لیکن اسے انھوں نے انسانیت کے بڑے اور عظیم درد میں مدغم کر دیا اور یہی غم عمر بھر غالب رہا۔ ؎

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا بھول گئے

سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

ان کی اس نفسیات کے تحت جو نظمیں وجود میں آئیں ان میں "اندھیری رات کا مسافر"، "نوجوان سے"، "نوجوان خاتون سے"، "آوارہ"، "سرمایہ داری"، "ہمارا جھنڈا"، "ایک جلاوطن کی واپسی"، "خوابِ سحر" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

نظم آوارہ میں شاعر کی ذہنی کشمکش اور نفسیات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں میں ٹھوکر کھایا ہوا شخص کس درجہ ذہنی کرب میں مبتلا ہے کہ کبھی وہ احساسِ کمتری اور کبھی احساسِ برتری کا شکار نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ کمزوری و بے چارگی کا شدت ... احساس ہے۔

جب وہ اپنے شہر میں ناشاد و ناکارہ گھومتا ہے تو یہی احساس اس کے اپنے شہر کو غیر کی بستی میں تبدیل کرنے لگتا ہے اور اس پر شدید افسردگی طاری ہو جاتی ہے۔ ساری دنیا کے عیش و عشرت کے سامان و لوازمات اس کی نظر میں رسوائیوں کا باعث بنتے ہیں۔ ان بندوں میں آپ بھی شاعر کے ذہنی کرب اور نفسیاتی کشمکش کو ملاحظہ کیجیے ؎

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اس ذہنی کشمکش کے ردِ عمل میں شاعر کے اندر جانفشانی اور جاں بازی کا جذبہ عود کر آتا ہے اور اس میں ایک احساس برتری جاگنے لگتا ہے اور ان تمام سماجی حالات کو جو سدِ راہ تھے، بدل ڈالنے کی خواہش اور سب کچھ کر گذرنے کا عزم پیدا ہو جاتا ہے جو ایک فطری، نفسیاتی ردِ عمل ہے ؎

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پہ اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونکدوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونکدوں
تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونکدوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

یہاں شاعر کی نفسیات اور ذہنی کشمکش کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ماں باپ کا قدم قدم پر بے جا لاڈ پیار اور چھوٹی چھوٹی تمام تر خواہشات کو توجہ اور محبت سے پورا کر دینے سے ان میں عملی دنیا میں جد و جہد اور دشواریوں کو عبور کر کے اپنی راہ پر آگے بڑھنے کے حوصلے کی جو کمی پیدا ہو گئی تھی اس کا ازالہ انکی تصوراتی دنیا میں ہوتا نظر آتا ہے وہ شاعر جو اپنی عملی دنیا میں ذرا سی دشواری سے برداشتہ ہو جاتا ہے وہ اپنی شالی اور تصوراتی دنیا میں کس قدر پر جلال و پر جوش اور با عزم دکھائی دیتا ہے۔ بقول عصمت چغتائی:

"مجاز عجب قسم کا بزدل ہے۔ ویسے تو قلم کے بل بوتے پر خون کی آندھیاں چلا سکتا ہے۔ سرخ طوفان لا سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس کے سامنے ایک ننھی سی چوہیا کی ٹانگ میں ڈورا باندھ کر کھردری سڑک پر گھسیٹیں تو وہ رو پڑے گا۔"[1]

یہی مجاز کی متضاد شخصیت کے دو نفسیاتی پہلو ہیں ایک پہلو کی کمی دوسرے پہلو میں "مجھ کو یہ دعوی کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں" کہہ کر پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کی نظموں "تعارف"، "بزدل"، "اندھیری رات کا مسافر"، "دلی سے واپسی"، "آہنگ نو"، "عشرت تنہائی" اور "فکر" میں ان پہلوؤں کی نشاندہی ملتی ہے۔

سب کے بربادیاں ہونے کے باوجود شاعر کا تصوراتی عزم اور عظمت انسانیت کا تصور زندہ رہتا ہے جس کی وجہ سے ایک تازہ جنون تمام وقت

---

[1] عشق مجازی۔ از عصمت چغتائی۔ مجاز ایک آہنگ۔ ص ۲۴۶

اس کے ذہن میں کارفرما رہتا ہے ؎

مٹ کے برباد جہاں ہو کے بھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں
کارفرما ہے کوئی تازہ جنونِ تعمیر
دلِ مضطر ابھی آ آ جگہ یاس نہیں

یہی جنونِ تعمیر سارے غموں اور کرب کے باوجود اسے سوچنے پہ مجبور کر دیتا ہے کہ ؎

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

ذرا سوچیے جس کی دنیا صرف غم ہی غم رہی ہو اس میں یہ احساس کہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ شاعر کی عملی دنیا کی شکست کی آواز ہے جس کو اس نے اس جہاں کے "بہت کچھ اور" میں بھلانا چاہا ہے اور بحیثیت مجموعی ایک ایسے خوش آیند تصور کو جنم دیا ہے کہ تمام شوریدہ سری کے باوجود وہ شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے: ؎

بہ ایں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

انسان کی ایک عام نفسیات ہے کہ جو چیز اس کی دسترس سے دور ہوتی نظر آتی ہے تو اس کی خواہش یا فت تیز تر اور شدید ہو جاتی ہے جب حوصلے ٹوٹنے لگتے ہیں تو ایک عجیب اور مخصوص طور کی بلند حوصلگی کا اظہار زور و شور سے ہونے لگتا ہے۔ مجاز بھی اس نفسیاتی کشمکش کا شکار ہے جس نے ان کی شاعری کو مذکورہ بالا قسم کی بلند حوصلگی بھی عطا کی ہے: ؎

میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرت میں ہے رازِ غم و حسرت پنہاں

ان کے آخری دور کی شاعری پہ جو ایک کرب و درد کا پرتو نظر آتا ہے اس کی وجہ غالباً اس کی معاشی اور رومانی دنیا کی شکست تھی جس نے باوجود

سارے عزائم کے شاعر کو اس کی بربادیوں کا احساس دلایا تھا اور جس نے اس کے دل و دماغ اور ذہن سبھی کو بے حد متاثر کر رکھا تھا یوں تو وہ یہ کہہ دیتا ہے کہ ؎

مری بربادیوں کا ہم نشینو
تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

اور یہ کہنا صاف اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ شاعر کے ذہن کا کرب اسے ہر وقت اذیت دیتا رہتا ہے ورنہ یہ خیال کہاں سے پیدا ہوتا: ؎

روئیں نہ ابھی اہل نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

حقیقت دیکھیے تو یہ صرف یوں ہی سا اعتراف یا طفننِ طبع کا اظہار نہیں بلکہ اس کے پیچھے شاعر کا وہ ذہنی کرب چھپا ہے جو بظاہر تو اپنی بربادیوں پر غم نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے لیکن وہ اس عام نفسیات کا شکار ہے جس میں کسی خامی یا کمی کے شدت احساس کو اپنی زبان سے اعتراف کر کے کم کر دینا چاہتا ہے۔

وہ شاعر جس کی دنیا میں حسن و عشق کی رنگینیوں کی فراوانی تھی اور جس نے بے وفائی کی شکایت کبھی محبوبہ سے نہ کی اور کبھی کوئی جگہ کی بھی تو محبت پہ پہرا لگانے والے ان قوانین کہن سے جو اس کی راہ میں حائل تھے۔ ؎

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی ان زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوقِ رسوا کی پذیرائی

مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے ان پاسبانوں سے
نہ لینے دی جنھوں نے فطرتِ شاعر کو انگڑائی

زمانے کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے

اپنی شکست کو کسی قیمت پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا حالانکہ اس کو ان زہرہ جبینوں سے بھی شکوہ نہ سہی تو بھی تکلیف تو ضرور پہنچی ہے اس کی نظر میں

جس کی وجہ نظام زنگ آلودہ قوانین کہن اور آئین فرسودہ ہیں جو ایک کُل (WHOLE) کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے جزُ کی حیثیت اس کے پاک باطن نکتہ چیں رہے، تہذیب کے پاسباں ہیں دیر وحرم کے آستاں ہیں آفتادگان عیش وعشرت اور صاحبان جاہ و ثروت ہیں جن سے اس کو تکالیف پہنچی ہیں اور شکست کا منھ دیکھنا پڑا ہے۔ پھر بھی وہ "شکوہ کُل" کا کرتا ہے اور سب کو قابل معافی سمجھتا ہے۔ لیکن پیہم شکست نے شاعر کے اندر ایک ایسا نفسیاتی ہیجان بھی پیدا کیا کہ وہی شاعر محبوبہ کی بے وفائی کا شاکی نظر آنے لگتا ہے:۔

آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا
جل بجھے کتنے خلیل آگ گلستاں نہ بنی
ٹوٹ جانا در زنداں کا تو دشوار نہ تھا
خود زلیخا ہی رفیق مہ کنعاں نہ بنی ۔۔۔۔ وغیرہ

اور شاعر کو خود کے اندر گداز دل مرحوم کی کمی اور مجروح جوانی نظر آنے لگی وفاداری کا گیت گانے والا شاعر یہ اعتراف کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے اور جرأت مندانہ انداز میں اظہار خیال کرتا ہے: ع

میں وفادار نہیں ہاں میں وفادار نہیں

عشق کی راہ میں سب کچھ کر گذرنے کا عزم رکھنے والا شاعر انتقام کے ردعمل سے پیدا ہونیوالی اپنی جرأتوں سے ڈرنے لگتا ہے:۔

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
مری فریاد جگر دوز مرا نالۂ زار
شدت کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاق طرب آگیں کا شکار
وہ گداز دل مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں
مرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو

اپنی جرأت کی قسم اب مری جرأت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو میری محبت سے ڈرو

اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں ہاں میں وفادار نہیں

اعتراف کا ایک ایک بند ——— اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ زمانے کے ناسازگار حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر شاعر ذہنی و نفسیاتی کرب کا شکار ہو گیا اور اس کے اندر احساس شکست و پشیمانی پیدا ہو گیا اور اسی احساس شکست نے مجاز کے ذہن کو بھی کسی حد تک شکستہ و مجروح کر دیا۔ مجاز جس کی شاعری میں سرشاری، سرمستی جوش و خروش، بانکپن اور نشاط کی کمی نہیں تھی۔ اس کے آخری ایام میں اس پر ایک درد و کرب کشمکش و اضطراب اور حزن و ملال کا ایک ایسا پرتو پڑنے لگا تھا جس کی وضاحت کے لیے چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں:

کیوں جوانی کی مجھے یاد آئی
میں نے ایک خواب سا دیکھا تھا

یہ جہاں بارگہ رطل گراں ہے ساقی
اک جہنم مرے سینے میں تپاں ہے ساقی

میرے ہر لفظ میں بیتاب مرا سوز دروں
مری ہر سانس محبت کا دھواں ہے ساقی

مٹا دیا ہے مجھے عشق نے مجاز مگر
ستانے والے ابھی تک ستائے جاتے ہیں

مئے گلفام بھی ہے ساز عشرت بھی ہے ساقی بھی
مگر مشکل ہے آشوب حقیقت سے گذر جانا

کیوں خوش ہے کوئی خستہ و درماندۂ طوفاں
یہ موج بلا ہے کوئی ساحل تو نہیں ہے

دل کو محو غم دل دار کیے بیٹھے ہیں
رند بنتے ہیں مگر زہر پیے بیٹھے ہیں

خرمن دل جلا رہا ہوں میں
نقش ہستی مٹا رہا ہوں میں

تو نہ مغموم ہو مگر اے دوست
تیری ہی سمت آ رہا ہوں میں

سینۂ شوق میں وہ زخم کی لو دے اٹھے
اور بھی تیز زمانے کی ہوا ہو ساقی

یہ شدید احساس شکست مجاز کو موت سے قریب تر کرتا گیا اب اُسے ہر وقت
موت کے قدموں کی بڑھتی ہوئی آہٹ محسوس ہونے لگی ؎

سانس کے پردوں میں بجتا ہی رہا ساز حیات
موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی

اور پھر: ؎

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

اس دنیا سے غم و الم کو دور کر کے صبح نو کی خواہش میں اپنی ہستی کو
مٹا کر بھی دنیا میں خوشی و مسرت کی نمود اور بہتات و فراوانی دیکھنا چاہتا
ہے اور اپنے اور یہ شام غریباں کو ختم ہوتا ہوا خیال کرتا ہے: ؎

پھر اس کے بعد صبح ہے اور صبح نو مجاز
ہم پر ہے ختم شام غریبان لکھنؤ

مجاز کی شاعری کا فنی تجزیہ

فن کی تعریف مختلف نظریوں کے حامی مشاہیر وقت نے مختلف انداز میں کی ہے۔ فن لیوٹالسٹائی کے مطابق انسانی رسم و راہ کا ذریعہ ہے۔ تمام دوسرے ذرائع رسم و راہ سے الفاظ کے ذرائع اس لیے زیادہ ممتاز ہیں کہ ان سے انسان لفظوں کی مدد سے اپنے خیالات کی ترسیل دوسروں تک کرتا ہے اور فن کے ذریعہ انسان اپنے جذبات کی ترسیل کا کام لیتا ہے۔ لیکن کاؤنٹ ٹالسٹائی کے خیال میں فن انسانی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور الفاظ اس کے خیالات کی اور میرے خیال میں الفاظ جذبات وخیالات دونوں ہی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جب انسان اپنے ذاتی تجربوں کے تحت پیدا شدہ جذبات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے اندرونی طور پر متاثر ہو کر خارجی علامتوں کے ذریعہ اظہار کرتا ہے تو یہی فن کی تخلیق کا باعث بنتا ہے یا فن اس وقت ظہور میں آتا ہے جب انسان اپنے اندر خارجی ماحول کی حقیقتوں کے اثرات کے تحت خیالات و جذبات کی رست وخیز پاتا ہے تو ان کا اظہار مخصوص شکلوں جیسے خوب صورت الفاظ، رنگ و نقوش میں کرتا ہے۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ کسی چیز کو خوب صورت بنا کر پیش کرنا ہی آرٹ ہے۔ اس خوب صورت بنا کر پیش کرنے میں انسان کی ذہنیت کا دخل ہوتا ہے۔ اور یہ ذہنیت وقت کی پیداوار ہوتی ہے اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے شاعری بھی ایک فن ہے جس میں الفاظ کے توسط سے خیالات و جذبات کو خوب صورت بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور کوئی بھی فن کار نہ خلاء میں نہ مصنوعی بہشت میں زندگی بسر کر سکتا ہے اسے اسی ارضی وہم عصری اجتماعی زندگی سے ناطہ جوڑنا ہی پڑے گا۔ مجاز کی شاعری کا اگر فنی تجزیہ کیا جائے تو اس کے ذہنی ارتقاء کے نقوش کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کی پرچھائیاں گہری ملتی ہیں مجاز نے جس دور میں اپنی شاعری کا آغاز کیا وہ دور ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ آزاد اور حالی کی حقیقت نگاری کی تحریک نے مجاز کے عہد تک پہنچتے پہنچتے مختلف چولے بدلے تھے کہیں اس نے مشرقی روایات پر نئی

رحب الوطنی کا روپ اختیار کیا ہے کہیں سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم و جبر کے ردعمل میں انقلاب کی نقیب بن گئی۔

مجاز کا دور صنعتی انقلاب کا دور تھا پرانے جاگیردارانہ نظام کی جگہ نئے سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی تھی جس کا اثر سماجی اور تہذیبی زندگی پر پڑ رہا تھا۔ وہ لوگ جو اب اس ظلم و تشدد کو اور اس قدیم دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے انھیں بھی ان تبدیلیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ خصوصاً نوجوان طبقے میں ان ناآسودگیوں اور معاشی مسائل اور سیاسی بحران کی وجہ سے ایک بیزاری کی سی کیفیت پائی جاتی تھی دوسری طرف آزادی کا خوش آیند تصور اور نئی زندگی کا حسین خواب ہر نوجوان کو دعوت عمل دے رہا تھا۔ لیکن جلد ہی وہ دور بھی آگیا جب خواب ٹوٹنے لگے۔ بے روزگاری دبے اطمینانی بڑھنے لگی۔ تحریک ترک موالات اور آزادی ایک خواب گراں بن کر رہ گئی۔ اس شدید بے چینی کے دور میں نئی نسل کی نفرت اپنے عروج پر تھی۔ مجاز نے جو گیت گائے ہیں اس میں اس کے اپنے دور کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں جن میں معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی محرکات اور اس دور کی ذہنی حالت کے بتدریج ارتقا کا شعور ملتا ہے جن کے اثرات شاعری کو پارۂ دل گداختہ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مجاز نے اپنی رومانی سرشاری و سرمستی کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق انقلابی آہنگ دے دیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے فردوس حسن و عشق کے نغمے گائے ہوں یا حیات نو کے لیے جان کی بازی لگائی ہو کہیں بھی ان کا کلام اثر آفرینی کے اعتبار سے پھیکا نہیں پڑنے پایا ہے بلکہ اس اعتبار سے فن پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ ان کی شاعری کے خدوخال کی تشکیل ایک رچے اور نکھرے ہوئے افتاد طبع اور نظریۂ رومان کا نتیجہ نظر آتی ہے۔

مجاز کی یہ صحت مند رومانیت ہی تھی کہ ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور اس کے تقاضوں کو بحسن و خوبی پورا کرنے کے باوجود کبھی خطیبانہ یا واعظانہ رنگ اختیار نہیں کیا بلکہ ان کے انقلابی رنگ میں نیا جمالیاتی شعور کا پتہ ملتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز کبھی بے اثر نہیں ہونے پائی۔ بقول فیض:

"اس کے کلام میں خطیب کے نطق کی کڑک نہیں۔ باغی کے دل کی آگ نہیں۔ نغمہ سنج کے گلے کا دفور تھا"۔[1]

مجاز کو اپنی اردو شاعری کی روایت سے گہرا تعلق اور رشتہ تھا۔ اور انھوں نے کلاسیکی روایات کا پورا پورا اہتمام کیا تاکہ شعری خوبیوں اور فنی خصوصیات کا کہیں بھی خون نہ ہو۔ موضوع کے اعتبار سے اس باغی شاعر نے فرسودہ اور خام خیالات سے احتراز وانحراف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی روایات سے ہٹ کر انھوں نے اپنی رومانی شاعری میں پرانے امردپرستی کے انداز کو یکسر ترک کر کے محبوب کو عورت کی شکل میں پیش کیا ہے گو کہ اختر شیرانی بھی اس سے قبل معشوق کو عورت کے پیکر میں دیکھ چکے تھے۔ لیکن وہ اس مادی دنیا سے پرے ایک آسمانی خواب تھی۔ لیکن مجاز نے جس معشوق کا تصور پیش کیا ہے وہ اسی دنیائے آب وگل کی عورت ہے جس کو وہ عاشق کے دوش بہ دوش اس کارزارِ ہستی میں دعوتِ عمل دیتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ اسے انقلاب میں بھی حصہ لینے کی تلقین کرتے ہیں۔ اسی عورت کو ایک آئیڈیل عورت کے روپ میں بھی دیکھتے ہیں۔ یہ تبدیلی انھیں بدلتے ہوئے حالات کی مرہونِ منت تھی جس میں سروجنی نائیڈو۔ خالدہ ادیب خانم جیسی عورتوں کی مثالیں شاعر کے تصور میں اس طرح کی روشن خیالی پیدا کر رہی تھیں۔ لہذا شاعر بھی اپنی روش کو تبدیل کرنے اور نئے انداز میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ ع

ہٹ کر چلے ہیں رہ گذرِ کارواں سے ہم

مجاز کے فن کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے دل کی آواز ہے وہ انفرادی تجربوں کے راستے سے اجتماعی شعور تک پہنچتے ہیں۔ اکثر ناقدین کی رائے ہے کہ مجاز کی شاعری میں فکر کی گہرائی اور مطالعے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ میرے خیال میں بعض لوگوں میں تاریخی و فکری بصیرت اس قدر تیز ہوتی ہے کہ ان کی تہہ تک فلسفی اور مورخ بھی نہیں پہنچ پاتے۔

---

[1] مطرب انقلاب دیباچہ آہنگ از فیض احمد فیض۔ ص

اور مجاز نے اپنی شعری تخلیق میں کسی مطالعے کو اپنا رہبر نہیں بنایا بلکہ اپنے ذاتی تجربات اور داخلی جذبات کی کارفرمائی کی ممنون ہے۔ ان کے یہاں دل کی آواز کا احساس ہوتا ہے جس میں آورد کا نام بھی نہیں ہے۔ بقول حالی جو شعر شاعر کی زبان یا قلم سے فوراً بے ساختہ ٹپک پڑتا ہے وہ اس شعر سے زیادہ لطیف و بامزا ہوتا ہے جو بہت دیر میں غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو۔[1]

ان کی پوری شاعری اکتسابی نہیں رہی ہے جس کی وجہ سے بے ساختگی اور جذبہ کی صداقت مسلّم ہے۔ کہیں بھی اور کبھی بھی انھوں نے پروپیگنڈہ اور مختلف نظریوں کی خاطر شاعری کو اس کے فطری رنگ و آہنگ سے ہٹنے نہ دیا نہ اس کی تاثیر سے محروم ہونے دیا۔ ان کی شاعری میں جو سماجی بصیرت کا احساس ملتا ہے وہ بھی ان کے ابلاغ نظر اور ان کی ذاتی زندگی کی تلخیوں کی دین تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع سے آخر تک ان کا کلام کہیں بھی اثر آفرینی کے حسن سے محروم نہیں ہوتا۔

ان کے کلام میں شگفتگی۔ سرمستی۔ جذب و کیف اور وفور و وارفتگی ہے جو ان کی شخصیت کی بھی عکاس ہے جہاں اجتماعی مسائل کا شعور اور فکر کی گہرائی اس کے شعری ادراک کا جزو کم بن پائی ہے۔ اس کی وجہ سائنٹیفک علمی مطالعے کی وسعت کی کمی ہو سکتی ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی شاعری کو کاوشِ ذہنی سے مرصع و مزین نہیں کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں فکر و فلسفہ کی گہرائی کم ملتی ہے لیکن تاریخ و تہذیب کا گہرا شعور ضرور ملتا ہے خواہ ظاہری تاریخیت کا فقدان ہو۔ بہر حال مجاز کی تیز شاعرانہ نگاہ خود اپنی جگہ قدر کی چیز ہے۔

ان کی شاعری میں ایک اعلیٰ تہذیب و تادیب کا پتہ ملتا ہے۔ جس کا اثر یہ ہے کہ پستی، ابتذال، سستی جنسیت انفعالیت اور حرص و ہوس کا شائبہ بھی ان کی شاعری میں نہیں ملتا۔ بلکہ ان کی جگہ ایک خوش گوار کیفیت بڑی برجستگی

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری۔ از حالی۔

اور والہانہ انداز میں ملتی ہے۔

خالص فنی اعتبار سے مجاز کو مشاہدہ کی صحت، سہولت الفاظ اور پیکر پیش کر دینا اچھے شاعر کا گراں قدر کارنامہ ہوتا ہے۔ تشبیہوں اور استعاروں کے سلسلے سے مجاز نے کافی التزام رکھا ہے اور ان کا تنوع و ندرت قاری کے ذہن کو تازگی اور نظر کو وسعت بخشتے ہیں۔

فکری و ہیئتی شعور

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک نے جہاں اردو کو نئے نئے مضامین و موضوع دے کر اسے وسعت بخشی اور زندگی کی حقیقتوں سے دوچار کرایا وہیں فکری و ہیئتی وسعت بھی عطا کی کیونکہ ان مختلف النوع موضوع کے اظہار کے لیے غزلوں کا پیرایہ ناکافی سمجھا گیا اس لیے پیرایہ اظہار میں فنی و ہیئتی تبدیلیاں لازم تھیں۔ چونکہ یہ تحریک قومی بین قومی، عالمی شعور و ادراک کو ادب میں سمونا چاہتی تھی اس لیے بین الاقوامی سطح پر جو فنی اور ہیئتی تبدیلیاں ہوئیں اردو نے بھی ان اثرات کے تحت اپنے یہاں اپنے مزاج کے مطابق تبدیلیاں کیں اسی لیے اس نے خیال کے مکمل اظہار کی کاوش کے نتیجے میں آزاد اور معرّیٰ نظموں تک کے تجربوں کو اپنایا جس کا بعد میں اردو شاعری میں چلن عام ہو گیا۔ بڑے بڑے غزل کے شعراء جنھیں خاص غزل کا مزاج داں سمجھا جاتا تھا وہ بھی صرف غزل کی دنیا سے کچھ ناآسودہ نظر آنے لگے اور طریقِ اظہار کے بدلتے ہوئے میلان کی طرف جستجو آمیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ غزل بھی کچھ نظم نما ہونے لگی اور جگر صاحب تک نے بھی اس ضرورت کو محسوس کیا ہے

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آجکل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

رہی ہیئت، فارم، تکنیک اور موضوع کی بحث تو یہ ادب کی دنیا میں روزِ ازل سے چلی آ رہی ہے۔ کس کو کس پر فوقیت حاصل ہے اس کا دو ٹوک فیصلہ کرنا مشکل کام ہے۔ جب کوئی شاعر کوئی نیا تجربہ کامیابی سے کر گزرتا ہے اور اس نے کسی خاص موضوع اور ہیئت کو اپنا کر آفاقی فنی پارہ تخلیق

کرتا ہے تو وہی چراغ رہ بن جاتا ہے۔ اور دوسرے آنے والے شعرا اسی ٹکنیک، فارم یا انداز بیان کو اپنانے اور برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عربی اور فارسی اثرات اور روایات کی دی ہوئی قافیوں اور ردیف کی بندشیں اردو شاعری کو کھل کر آزادانہ طور پر خیالات و موضوع کے اظہار میں دشواریاں پیدا کرتی رہیں۔ ردیف اور قافیہ کی اسیر ہو کر اردو شاعری کسی قدر غیر فطری ہو رہی تھی۔ حالیؔ سب سے پہلے شاعر و ناقد ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو وزن اور قافیہ و ردیف کی قید و بند سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ قافیہ و ردیف کی جکڑ بندیاں شاعر کو اپنے فطری جذبات و خیالات کے اظہار سے باز رکھتی ہیں:

"قافیہ بھی ہمارے یہاں شعر کے لیے ایسا ہی ضروری سمجھا گیا ہے جیسے کہ وزن مگر درحقیقت وہ بھی نظم ہی کے لیے ضروری ہے نہ شعر کے لیے۔ اساس میں لکھا ہے کہ یونانیوں کے یہاں قافیہ بھی (مثل وزن کے) ضروری نہ تھا ... اگرچہ قافیہ بھی وزن کی طرح شعر کا حسن بڑھا دیتا ہے جس سے کہ اس کا سننا کانوں کو نہایت خوش گوار معلوم ہوتا ہے اور اس کے پڑھنے سے زبان زیادہ تر لذت پاتی ہے مگر قافیہ اور خاص کر ایسا جیسا کہ شعرائے عجم نے اس کو نہایت سخت قیدوں سے جکڑ بند کر دیا ہے اور پھر اس پر ردیف اضافہ فرمائی ہے۔ شاعر کو بلا شبہ اس کے فرائض ادا کرنے سے باز رکھتا ہے۔ جس طرح صنائع لفظی کی پابندی معنی کا خون کر دیتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بہت زیادہ قافیہ کی قید ادائے مطلب میں خلل انداز ہوتی ہے۔ شاعر کو بجائے اس کے کہ اول اپنے خیال کو ترتیب دے کر اس کے لیے الفاظ مہیا کرے سب سے پہلے قافیہ کو تجویز کرنا پڑتا ہے اور پھر اس کے مناسب کوئی خیال ترتیب دے کر اس کے ادا کرنے کے لیے ایسے الفاظ مہیا کیے جاتے ہیں جن کا سب سے آخر جزو قافیہ مجوزہ قرار پا سکے کیوں کہ اگر ایسا نہ کرے تو ممکن ہے کہ خیال کی ترتیب کے بعد کوئی مناسب قافیہ بہم نہ پہنچے اور اس خیال سے دست بردار ہونا پڑے۔ پس درحقیقت شاعر خود کوئی خیال نہیں باندھتا۔ بلکہ

قافیہ جس خیال کے باندھنے کی اسے اجازت دیتا ہے اس کو باندھ دیتا ہے
.... سچ یہ ہے کہ شعر کو زیادہ خوشنما بنانے کے لیے اس میں ایک ایسی قید لگانی
جس سے شعر کی اصلیت باقی نہ رہے بعینہٖ ایسی بات ہے کہ لباس کے زیادہ
خوشنما بنانے کے لیے اس کی ایسی قطع رکھی جائے جس سے لباس کی غرض غائی
یعنی آسائش اور پردہ دونوں فوت ہو جائیں۔ الغرض وزن اور قافیہ جن پر
ہماری موجودہ شاعری کا دارومدار ہے اور جن کے سوا اس میں کوئی خصوصیت
ایسی نہیں پائی جاتی جس کے سبب شعر پر شعر کا اطلاق کیا جا سکے یہ دونوں شعر کی
ماہیت سے خارج ہیں"۔[1]

حالیؔ کے ان انقلابی خیالات کا ثمرہ یہ ہوا کہ ہمارے شعرا نے مروجہ
شعر و شاعری کے لوازمات پر حالیؔ کے نظریہ شاعری کے تحت از سرِ نو محاسبہ
کیا تو انھیں احساس ہوا کہ اب مزید روایت پرستی و ماضی پرستی اردو شاعری
کے لیے سودمند نہیں ہے لہٰذا یہ بات طے پائی کہ اب محض ردیف قافیہ کی
حدود میں کی گئی باتوں کو شاعری کے زمرہ سے خارج سمجھا جائے۔ شعر و شاعری
کے صحیح مفہوم کے لیے معنی اور متنوع خیالات کو پیش نظر رکھا جائے اور
ہیئت کی جگہ موضوع و خیال کو ترجیح دی جائے کیوں کہ ہیئتیں صرف ان کے
اظہار کا خوبصورت وسیلہ ہیں۔

ان باتوں کو محسوس کرتے ہوئے سب سے پہلے اسمٰعیل میرٹھیؒ نے
بے قافیہ نظم "تاروں بھری رات" لکھی اکبرؔ نے بھی اس پر تجربے کیے سب
سے نمایاں تجربہ نظم طباطبائیؔ نے گورِ غریباں لکھکر کیا اور بقول شرر اردو میں
اسٹینزا (STANZA) کہتے کی ابتدا اسی نظم سے ہوئی۔ پھر عظمت اللہ خاں نے
بلینک ورس کے کامیاب تجربے کیے اس کے بعد حامد اللہ افسرؔ نے ٹیگور سے
متاثر ہوکر فارسی کی روایتی پابندیوں سے ہٹ کر ہندی و سنسکرت کی بحروں
کو لے کر جن میں غنائی عناصر زیادہ تھے، تجربے کیے تاکہ ہندوستانی موسیقی سے

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری از حالیؔ۔ ص ۱۳۵ تا ۱۳۶

ہم آہنگ ہو سکیں۔ لیکن کلام میں معنی آفرینی اور گہرائی کی عدم موجودگی کی بنا پر ان کے یہ اقدام ایک نئے تجربے کی حد تک رہ گئے اور ان کے کلام کو عظمت نہ بخش سکے۔ اس کے برعکس عظمت اللہ خاں کے تجربوں میں سماجی پہلو کی پرکھ اور زبان و بیان کا علم اور فنی شعور رچا ہوا ہے۔ اس لیے ان کے تجربوں اور خیالات نے ہمارے شعراء کو زیادہ متاثر کیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد نوجوان شعراء کے سامنے نئی راہیں، نئے موضوعات و خیالات آنے لگے۔ اور نئی بنیادوں پر سوچنے لگے۔ رومانی شعراء بھی نئی بنیاد و طرز پر شاعری کی ہئیت میں نئے نئے تجربے کر رہے تھے ان کے مروجہ فارم میں تبدیلیاں کر کے اپنا رہے تھے۔ مغربی ادب کے اثرات بھی تیزی کے ساتھ ہمارے ادب میں رونما ہو رہے تھے جس کے زیر اثر نئے خیالات نئے موضوعات اور مواد کی سہل اور آسان طور پر ادا کرنے کے تجربے بھی کیے جا رہے تھے۔ جنگ اور سرمایہ دارانہ نظام کی لادی ہوئی معاشی پریشانیوں نے عوام کو بے حد پریشان اور بے روزگار کر رکھا تھا۔ شاعر خود بھی انھیں میں شامل تھا اس کی بھی معاشی حالت سقیم تھی لہٰذا وقت کا تقاضا تھا کہ بات سیدھے سادے اور موثر انداز میں لوگوں تک پہنچائی جائے۔ ان حالات کے تحت بیشتر شعراء جو قافیہ و ردیف کو برت کر اپنی بات واضح طور پر کہنے سے قاصر تھے آزاد نظم کی طرف راغب ہوئے اور اس کا رواج زور پکڑنے لگا۔ اسی دور میں فرائڈ کے نظریات کا بھی اثر ادب نے قبول کیا اور اس کے تحت نظریہ خواب۔ خواب بیداری۔ جنس اور لاشعور کی گتھیوں کو ادب میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی جن کے اظہار کے لیے بے قافیہ آزاد نظم کا بطور خاص استعمال کیا گیا۔ کیونکہ یہ آسانی سے ان کیفیتوں کی ترجمانی کی متحمل ہو سکی ہیں۔

ن۔ م۔ راشد اور عبدالعزیز خالد وغیرہ پہل کرنے والے شعراء میں سے ہیں جنھوں نے ان میں نئے نئے تجربے ہیئت اور مواد دونوں کے اعتبار سے کیے اور انھیں مقبول عام بنایا کیوں کہ یہاں پرانے اصولوں سے صرف انحراف نہ تھا بلکہ اس میں بھرپور داخلی اور خارجی اور فنی و فکری خوبیاں

موجود تھیں۔ اس کے بعد میراجی کا نام آتا ہے جنھوں نے اس صنف میں ہیئتی تجربے بہتات سے کیے ہیں اور اسی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ان کے یہاں ہیئتی جدت پسندی کے علاوہ جنسی موضوعات کی بھی بھرمار ہے کیوں کہ وہ جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو ہی قدرت کی سب سے بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت و برکت سمجھتے ہیں۔

"جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب و تمدن نے جمع کر رکھی ہے وہ انھیں ناگوار ہے۔ اس کے ردعمل میں وہ ہر بات کو جنس کے تصور کے آئینہ میں دیکھنے کے قائل ہیں اور اسے عین فطرت سمجھتے ہیں اور اسی کو اپنا آدرش مانتے ہیں۔" [۱]

میراجی مفہوم کے اظہار کو زیادہ آزادی سے نظم کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ عام طور پر الجھ جاتے ہیں اور مفہوم ابہام پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ سلام مچھلی شہری بھی انھیں کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں اور ان کا کلام بقول مجاز ترجمہ کا محتاج نظر آتا ہے۔

اس کے بعد آزاد نظم کے تجربے سردار جعفری، فیض اور فراق نے بھی "نئی دنیا کو سلام"، "آدھی رات" اور "تنہائی" لکھ کر کیے جو مروجہ بحروں اور ردیف قافیوں سے الگ ہٹ کر خیالات و محسوسات کی شدت کو قلم بند کرنے کی بہترین کوشش ہے۔

ان تجربے کرنے والوں نے جہاں بہترین نظمیں لکھیں وہیں ایسی نظموں کی بھی بہتات ملتی ہے جو معنی و مفہوم کے لحاظ سے مبہم اور گنجلک ہیں اور جس کی وجہ سے ابہام پرستی کو ہوا ملی اور آخر ش اسے شاعری کا حسن گردانا جانے لگا۔

اس موضوع اور ہیئت کے زیر بحث اردو شاعری میں دو گروپ بن گئے۔ ایک گروپ ترقی پسندوں کا تھا جو موضوع کو سب کچھ سمجھتا تھا

---

[۱]

اور اپنے خیالات کے اظہار میں رکاوٹ سمجھ کر ہئیت کو نظر انداز کرنے پر مجبور پاتا تھا۔ اس گروپ کے شاعروں نے کبھی آزاد نظموں پر طبع آزمائی کی ہے۔ فیض۔ مخدوم۔ سردار جعفری اور اختر الایمان وغیرہ نے بڑی حد تک کامیاب آزاد نظمیں لکھیں اور اردو شاعری کو حقیقتاً غزل کی بندشوں سے نجات ملی۔ قافیہ ردیف کا تصور بدلا۔ اکثر بیشتر ان کا التزام بھی ختم ہو گیا۔ دوسرا گروپ ہئیت پرستوں کا جن کا خیال تھا کہ موضوعی شاعری نہ رہ کر منظوم تقریریں بن گئی ہیں اور اس گروپ نے کچھ ایسی نظمیں لکھنی شروع کیں جو ہئیت کے اعتبار سے کسی قدر کامیاب تھیں۔ لیکن مفہوم کے اعتبار سے بے معنی و مبہم تھیں۔ ان شعراء میں قیوم نظر یوسف ظفر۔ ممتاز مفتی۔ انجم رومانی کے نام قابل ذکر ہیں۔

مجاز وہ تنہا شاعر تھے جنھوں نے ان سارے تجربات سے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور فیض۔ سردار۔ ن م راشد۔ سلام مچھلی شہری اور میرا جی سے قربت کے باوجود کبھی انھوں نے اس میدان میں قدم رکھنے کی کوشش نہ کی اور ہمیشہ میانہ روی اختیار کی۔ موضوع کی اہمیت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان اور ہئیت کو نظر انداز کر کے نئے نئے تجربے نہیں کیے۔ بقول اسلوب احمد انصاری :۔

"تکنیک کے معاملے میں وہ پرانی روش سے سرمو انحراف نہیں کرتے انھوں نے جدید وضع کے تجربوں سے ہمیں روشناس نہیں کرایا۔" [1]

یہ بات صحیح ہے کہ انھوں نے پرانی وضع سے انحراف نہیں کیا۔ لیکن حالات اور زمانے کے تقاضوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ وہ غزل نگاری

---

[1] مجاز۔ از اسلوب احمد انصاری۔ مجاز ایک آہنگ۔ ص ۹۸

سے نظم نگاری کی طرف مائل ہو گئے اور ان کی تمام تر شہرت کا باعث نظمیں ہی ہوئیں۔ ان کی نظموں میں کچھ ایسی خصوصیات ملتی ہیں جن میں پرانا انداز اختیار کیا گیا ہے اور مثنوی کی طرح ہر شعر کے مصرعے ہم قافیہ اور ہر شعر کا قافیہ الگ الگ ہے ان میں نرس کی چارہ گری (نورا) ننھی پجارن (۱۹۳۶ء) نذر علی گڑھ (۱۹۳۶ء) انقلاب (۱۹۳۳ء) دلی سے واپسی (۱۹۳۶ء) بربط شکستہ (۱۹۳۷ء) سرمایہ داری (۱۹۳۷ء) خواب سحر (۱۹۳۹ء) بتانِ حرم (۱۹۴۲ء) شامل ہیں۔ کچھ نظمیں غزل کی ساخت و ہیئت پر لکھی ہیں۔ اس قسم کی غزل نما نظم جوش و اختر نے بھی لکھی ہیں۔ ان نظموں میں غزل کی طرح پہلا شعر مطلع کے انداز کا یعنی دونوں مصرعے ہم قافیہ اس کے بعد کے تمام شعر ایسے قافیہ و ردیف میں کہے گئے ہیں۔ جوش نے تو کہیں کہیں آخری شعر میں تخلص لا کر اسے مقطع کی شکل بھی دے دی ہے مجاز نے بھی ایسی غزل نما نظمیں لکھی ہیں جن میں آج کی رات (۱۹۳۳ء) رات اور ریل (۱۹۳۳ء) مسافر (۱۹۳۶ء) شوق گریزاں (۱۹۳۴ء) تعارف (۱۹۳۵ء) نذر دل (۱۹۳۶ء) مجبوریاں (۱۹۳۶ء) طفلی کے خواب (۱۹۳۶ء) نوجوان سے (۱۹۳۷ء) نوجوان خاتون سے (۱۹۳۶ء) مزار رہنما (۱۹۳۹ء) ساقی (۱۹۳۷ء) حسن و عشق (۱۹۴۰ء) شہر نگار (۱۹۴۲ء) عیادت (۱۹۴۴ء) مادام (۱۹۴۴ء) آج بھی (۱۹۴۴ء) لکھنؤ (۱۹۴۵ء) الہ آباد سے (۱۹۴۵ء) آج (۱۹۴۵ء) وطن آشوب (۱۹۵۰ء) سانحہ (۱۹۵۰ء) خراج عقیدت (۱۹۵۱ء) زہراب حسین (۱۹۵۲ء) "نیا کشمیر اور کیوں"[1] (نذر جوش)۔

ان کے علاوہ جو نظمیں ہیں ان میں "ایک جلا وطن کی واپسی"، "آہنگ نو" "اعتراف"، "مہمان"، "نذر خالدہ" ہیں جن میں چار ہم قافیہ مصرعوں کے بعد ایک مختلف القافیہ شعر۔ اور "مجھے جانا ہے ایک دن"، "آوارہ"۔

---

[1] اردو کا عنفوانی شاعر مجاز۔ از انجم اعظمی۔ مجاز ایک آہنگ۔ ص ۱۲۶

پردہ اور عصمت"۔ "اندھیری رات کا مسافر" میں تین ہم قافیہ مصرعوں کے بعد ایک مصرعے کی تکرار۔ کچھ ایسی نظمیں ہیں جن میں تین تین یا چار چار ہم قافیہ مصرعوں کا بند ایک مصرع ٹیپ کا سارے ٹیپ کے مصرعے ہم قافیہ ہیں ان میں سے "عشرت تنہائی"، "کس سے محبت ہے"، "مزدور کا گیت"، "ادھر بھی آ"، "پہلا جشن آزادی"، "فکر اور شرارے" جیسی نظموں میں چار چار مصرعوں کے بند ہیں جن میں دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہے۔ تین تین مصرعوں کے بند جن میں تینوں مصرعے ہم قافیہ ہیں۔ "ان کا جشن سالگرہ" میں آئے ہیں۔ "بول اری او دھرتی بول" میں چھ مصرعوں کے بعد دو مصرعوں کی تکرار ہے۔

ہیتی و فنی اعتبار سے مجاز نے اپنے ہم عصروں کے خلاف آزاد نظم نظم معریٰ یا بے قافیہ نظم کو بالکل نہیں اپنایا۔ بقول انجم اعظمی :-

"اس کی شاعری میں ہیئت کے تجربے نہیں ملتے کیونکہ مجاز جیسے شعرا ہیئت کے تجربوں کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔"[1]

یہ حقیقت ہے کہ مجاز کو ہیئت میں نئے تجربوں کی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ ان کو ابتدا ہی سے ادائے مطلب میں عبور حاصل تھا۔ الفاظ کی صحت اس کے انتخاب اور برمحل استعمال کا بہت گہرا شعور تھا اور برجستہ رواں مترنم ڈھلے ڈھلائے مصرعے کہنے پر ان کو ابتدا ہی سے بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ الفاظ اس طرح ترتیب دیتے کہ ان میں ایک آہنگ سا پیدا ہو جاتا۔ لیکن زبان و الفاظ کے قواعد و ضوابط کے لیے وہ آہنگ و معنی کا کہیں کہیں خون بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ سقم کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک شعر یوں کہا تھا جو بعد میں تبدیلی کے بعد شامل نظم کیا گیا ہے :-

حسن نے سامنے وہ لعل و گہر ڈال دیئے

---

[1] اردو کا عنائی شاعر۔ مجاز۔ از انجم اعظمی۔ مجاز ایک آہنگ۔ ص ۱۶

میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈال دیے

اس شعر کو بعد میں یوں کر دیا:ے

حُسن نے جب بھی محبت کی نظر ڈالی ہے

میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈالی ہے

میرے خیال میں پہلا شعر معنی و آہنگ میں دوسرے شعر سے کہیں بہتر ہے لیکن صرف سپر کے مذکر بندھ جانے سے انھوں نے پورے شعر کو بدل دیا تاکہ قواعد کا سقم نکل جائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو قواعد و ضوابط کا کتنا خیال تھا۔ بقول حنیف فوق:۔

"موضوع کے اعتبار سے اس باغی شاعر کے یہاں کلاسیکی ہئیت کا پورا اہتمام اور سلیقہ نظر آتا ہے۔" [1]

نظم نگاری کی حیثیت سے بھی مجاز ایک کامیاب شاعر ہیں۔ منطقی تسلسل اور جزئیات نگاری جو نظم کے لیے اجزائے ضروری سمجھے جاتے ہیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ساتھ ہی ان خصوصیات کی مدد سے جہاں لمحہ بہ لمحہ منزل بہ منزل نظم کی بساط پر پھیلتا چلا جاتا۔ تخیل کی اُتھک اور مستقل پرواز شروع سے ملتی ہے۔ "رات اور ریل" سے لے کر "آوارہ"، "خواب سحر" اور "ایک غمگین یاد" سب ان خصوصیات کی حامل ہیں۔ "آوارہ" عصری نوجوان کی انفرادی روح کے کرب اور غم، ساتھ ہی متوسط طبقے کی ذہنی جذباتی اور معاشی بے اطمینانی و غیر آسودگی کی ترجمان ہے۔ "خواب سحر" کا لہجہ متوازن اور خیال انگیز ہے۔ اس کے آخری چند اشعار میں اجتماعی شعور کا پتہ ملتا ہے۔

ان کی فنی چابک دستی کا ایک اہم جز رچا ہوا فارسی آمیز انداز بھی ہے۔ فارسی ادب کے اثرات جو اردو کو وراثت میں ملے تھے۔ مجاز کے انداز بیان و زبان میں حل سے ہو گئے ہیں اور ان کی شاعری کے داخلی

---

[1] مجاز کی انقلابی رومانیت۔ از حنیف فوق۔ مجاز ایک آہنگ۔

شعور اور مزاج کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ کلاسیکی شعراء زبان فارسی پر فخر کرتے تھے۔ مگر مجاز کے دور میں اس کی تعلیم تقریباً معدوم ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ان کے یہاں فارسی کا رچاؤ، برمحل اور خوشگوار فارسی ترکیب اور فارسی آمیز ٹکڑے بڑی زیبائی و رعنائی کے ساتھ ملتے ہیں۔ جن میں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور ان کی شاعری میں رنگینی، حسن اور لطف سخن کے اضافے کر دیتے ہیں اور یہی مجاز کے منفرد رنگ و آہنگ اور اسلوب کی تشکیل میں معاون و مددگار ہیں۔ اس تشکیل میں ان کے الفاظ کی در و بست ان کی نکھری ہوئی غنائیت ذوق کی نفاست، رومانوی مزاج، رچی ہوئی فارسیت کا بہت بڑا ہاتھ ہے ان کی پوری شاعری میں بلا کی صفائی اور روانی ساتھ ہی واضح خیال اور تہذیب نفس ہے جو تہذیب یافتہ ذہن کا ثبوت ہے اسی لیے ابہام و اشکال سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ بقول مجتبیٰ حسین "ان کے سامنے جو چیز بھی ہے جیسی بھی ہے واضح ہے .... ان کا نغمہ سخت مقامات کو بھی آسانی سے طے کر لیتا ہے۔ ان کے نغمے کی لَے میں گہرائی کی جگہ وسعت ہے۔ آہستہ روی کی جگہ تیز رفتاری ہے۔"[۱]

مجاز کی شاعری کی خوبی و دل کشی یہ ہے کہ جذبات کے سمندر میں ڈوبی ہوئی نہیں ہے بلکہ اپنے دلنواز ترنم میں گم کر دینے والی ہے۔ مجموعی طور پر ان کی نظموں میں فراوانی جذبات۔ اضطراب انفرادیت و مرکزیت سے گریز، حقیقی جذباتیت۔ تخیلی شادابی۔ تسلسل اور بہاؤ سب ہی کچھ ہے۔ ان میں رومانیت کے تمام عناصر ملتے ہیں۔ اصلی و واقعی جذبات سے ان کی نظموں کو تحریک ملتی ہے جس و عشق کے واردات قلبی کے تاثرات کی جھلک ان کی نظموں کے ہر شعر میں نمایاں ہے۔ کوئی بھی شعر ان سے خالی نظر نہیں آتا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کے بے چین حساس و مضطرب دل کے تاثرات ہیں خواہ ان کے پس منظر میں تجربات محدود ہی کیوں نہ ہوں لیکن انفرادی مسرت و غم کی

۱۔ مغنی آتش نفس از مجتبیٰ حسین۔ مجاز ایک آہنگ۔ ص ۶۶۵ - ۶۶۶

اس وقت اہمیت بڑھ جاتی ہے جب یہ کسی نادر معنی خیز پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جس سے ان میں عمومیت و آفاقیت کا رنگ آجاتا ہے۔ ان کی نظموں میں منظم تربیت یافتہ تخیل کی قدرے کمی ضرور محسوس ہوتی ہے لیکن سرمستی و سرشاری اپنے عروج پر ملتی ہے۔ جذبے کی صداقت اس کی تہذیب و تادیب اور رلمسیاتی احساس شدید ان کی نظموں میں عام طور پر نمایاں ہے تجربوں کے محدود ہونے کے باوجود انھیں غنائیت و سرشاری میں ڈبو کر بڑے دلفریب و دلنواز انداز میں پیش کیا ہے جس کی ان کے دور کے شعرا کے یہاں کمی ہے۔

زبان و بیان کی سحر انگیزی دلربائی اور اثر انگیزی جدید شعرا سے کہیں زیادہ ہے۔ شاعرانہ صداقت کے مطالبے سے صرف نئے پن اور نئے ہیئتی تجربوں کی خاطر روگردانی نہیں کی ہے۔ اپنے جذبات کی رو اور اس کے پیرایہ پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ فن کے کلاسیکی رجحان و ہیت کے باوجود خیالات کے اظہار کے پیرایہ میں ایک تازگی اور حسن پایا جاتا ہے۔ فکر و فلسفہ کو شاعری میں نام نہاد داخل کر کے چیستاں گوئی نہیں کی ہے۔ بلکہ اپنی نسل کے سرکش ترجمان کی حیثیت سے صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ کیوں کہ اس نئی نسل کے ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہ تھا: ؎

مجھ میں تو روح سرمدی نہ پھونک
رونق بزم دلبراں نہ بنا
دشت ظلمات میں بھٹکنے دے
میری راہوں کو کہکشاں نہ بنا
اس زمیں کو زمیں ہی رہنے دے
اس زمیں کو تو آسماں نہ بنا

مجاز کا ادبی مرتبہ

اقبال اور جوش کے فوراً بعد جو نئی نسل سامنے آئی اس کے شعرا جذبی۔ جاں نثار اختر۔ مجاز فیض اور راشد نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ ہماری شاعری معاشرتی مسائل اور حسن و عشق کے معاملات کو یکسر ایک نئے انداز سے دیکھ رہی تھی۔ ملکی وغیر ملکی حالات ایک بحرانی کیفیت سے دوچار تھے اور یہ نسل ولولہ انگیز خیالات سرکشی۔ بغاوت۔ ماضی کی روایات سے روگردانی کی نسل کہی جا سکتی ہے۔ اس نے اپنا کام بہت مختصر عرصہ میں بڑی تیز رفتاری سے انجام دیا ہے۔ یہی تیز رفتاری سرکش دباغی شاعر و ادیب اور سرفروش سیاست داں پیدا کر رہی تھی اور ہندوستان ایک تحریک و کیفیت خاص کی علامت بن گیا تھا۔ رومانوی سرشاری، معاشی مسائل، ذاتی محرومیاں، شکست یہ تمام چیزیں نئے لکھنے والوں کی زندگی کی اساس بنے ہوئے تھے اور ان میں یہی لطف تھا۔ مجاز بھی اسی دور کے ترجمان تھے۔ وہ زندگی کی سختیوں و محرومیوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت و ہمت رکھتے تھے اسی لیے ان کے کلام میں ایک لطف سخن ہے۔ شدائد و مصائب نے نہ ان کی اپنی زندگی کو اور نہ ان کی شاعری کو بے لطف کیا بلکہ ان کی وجہ سے اس میں لطافت اور قبول خاطر جو اچھی شاعری کا بنیادی وصف ہے پیدا ہو گیا۔ یہ وصف نہ صرف زبان دانی اور ہلکے پھلکے مترنم الفاظ سے آتا ہے، بلکہ شاعر کے مخصوص کیفیت و مزاج۔ اس کی بصیرت، لمیاتی احساس کی شدت اور خارجی حالات و عوامل سے پیدا شدہ جذباتی ردِ عمل کا ایک کیمیادی مرکب یا حاصل ہے۔ اس کے لیے شعری پہلوؤں کا شعور اور ان سے باخبری ضروری ہے۔ شاعری کو قبول خاطر ہونے کے لیے اپنے ماحول اور گرد و پیش سے گہری وابستگی بھی ضروری ہے۔ جس کے پس منظر میں انسانیت کا قرب اور اس کا درد کار فرما ہو۔

مجاز کے یہاں ان اوصاف کے علاوہ ان کی شاعری کو اپنے دور کی ذہنی کیفیت سے ایک تعلق خاطر ہے جس کی یہ کامیاب ترین ترجمان ہے اور

اس میں اس دور کی جیتی جاگتی تصویریں "آوارہ" "اندھیری رات کا مسافر" اور خواب سحر ایسی نظموں میں صاف جھلکتی ہیں۔ اس دور کی اس نئی نسل کے سامنے کچھ منزلیں تھیں جن کے حصول کے لیے وہ صدق دل سے کوشاں تھی۔ احتیاطات و مآل اندیشی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ تمام تر ذاتی ناکامیوں و محرومیوں کے باوجود اس میں احساس شکست نہ تھا۔ مجاز بھی ان میں سے ایک تھے ان کے یہی اپنے دور کی دی ہوئی کشادہ دلی، بے ساختگی اور وارفتگی ہے جس کے زیر اثر ان کی شاعری کا پھیلاؤ ہے جو آخر میں "اعتراف" کی بڑی جراءت مندانہ منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

ان کی شاعری کی تاریخی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس مختصر مگر اہم دور کی پوری تاریخ پر محیط ہے جو ۱۹۳۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء تک ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اس درمیانی دور کے سب سے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے اس دور کی سیاسی تاریخ کو اپنی شاعری میں سمو کر تہذیبی تاریخ کا روپ دے دیا ہے۔ جس میں نئی نسل کی سرکشی و سرشاری سرایت کی ہوئی ہے۔

مجاز نے اپنی رچی ہوئی شخصیت کی نغمگی کو پورے دور کی نغمگی میں مدغم کر دیا ہے اور ایک آہنگ کو عطا کیا ہے۔ جس میں اس وقت کے پورے ہندوستان کی لے شامل تھی۔ مجاز کی نغمگی حسن و عشق کے نغموں اور انقلاب کے جوش و خروش سے برگشتوں سے مزین ہے۔ اس میں ذاتی شکست و ریخت کی چاشنی ہے جو مزہ دے رہی ہے۔ یہ نغمگی مجموعی طور پر اپنے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر ان کی شاعری کو شادابی جوانی بخش رہی ہے مختصراً ان کی شاعری ان کے اپنے مختصر دور کی بہت پر اثر روداد ہے جس کے پیچھے ہماری ادبی و سماجی شعور کی تاریخ منعکس ہے۔

اختتامیہ

ہیں کہ برباد نگارانِ دل آرا ہی سہی
ہیں کہ رسوائے مے و ساغر و مینا ہی سہی
ہیں کہ مقتولِ گل و نرگسِ شہلا ہی سہی
پھر بھی خاک رہِ صاحب نظراں ہوئے درست

وہی ادبی فن پارہ لائقِ تحسین ہے جس میں تہذیب و ثقافت، اخلاقیات سماجیات، معاشیات اور سیاسیات کا زیادہ سے زیادہ شعور رہا ہو اور شدتِ احساس کے ساتھ ہی تاریخی تسلسل اور اس کے عہد و نسل کی ترجمانی بھی شامل ہو۔ ایسے تو نہ جانے کتنے ادیب و شاعر جنم لیتے ہیں لیکن ان کا نام صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ بقائے دوام صرف ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اپنی تخلیقات کو صرف لمحاتی تقاضے پورا کرنے کا آلۂ کار نہ بنائیں بلکہ انھیں اجتماعی شعور و ادراک سے مزین کر کے آفاقیت عطا کر سکیں اور ایسے ہی فن پارے یا کارنامے رہتی دنیا تک قائم و دائم رہتے ہیں۔ زمانے کی تیز روی میں خود کو زندہ اور سرگرمِ عمل رکھ کر اگر فن کار اپنی تخلیقات میں نجی و ذاتی مشاہدات و تجربات کو پرو سکے تو ایسی تخلیقات وقت تیز رفتار کی گرد میں دفن نہیں ہو سکتیں کیوں کہ اس کا تاریخی تسلسل نمایاں ہو کر قاری کو اُس دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

مجاز کی شخصیت میں بھی تاریخی تسلسل اور تبدیل ہوتی ہوئی سماجیات اور اس کے نفسیاتی ردِ عمل کے ساتھ ساتھ اجتماعی طور پر چھائی عمومی تہذیب کی چھاپ شامل ہے جو ان کی ہی نہیں بلکہ اس دور کے تمام زمیندارانہ خاندانوں کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ دوسری طرف جاگیردارانہ نظام کی قہر بانیوں سے ایک عمومی کراہیت و نفرت ابھر رہی تھی۔ ساتھ ہی سامراجی سرمایہ دارانہ نظام نے بھی عوام کے کرب دبے جینی میں اضافہ کرنا شروع کر دیا تھا اور اس وقت کا کوئی بھی ذی حس اور باشعور انسان ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مجاز جو ذی حس بھی تھے اور باشعور بھی مزید برآں ان تبدیل ہوتے ہوئے عوامل کے قریب سے مشاہدہ و تجربہ کرنے والے بھی تھے۔ لہٰذا ان کی

شخصیت میں مجموعی طور پر اودھ کی تہذیب کے معائب و محاسن کے ساتھ ساتھ انسانیت پر ہوتے ہوئے ظلم اور دست درازیوں کے ردعمل میں شدید انسان دوستی، مظلوموں و مجبوروں سے گہری ہمدردی کا جذبہ ان کی فطرت کا ایک جز بن گیا اور اشتراکی خیالات و نظریات نے اس پر جلا کا کام کیا اور ان کی شخصیت کے انھیں پہلوؤں کا عکس ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو سے آشنا لوگوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو مجاز کی شخصیت و شاعری سے واقف اور متاثر نہ ہو۔

مجاز عجب انداز سے اردو ادب کی دنیا میں آئے اور اپنی نظم "آوارہ" "اندھیری رات کا مسافر"، "رات اور ریل"، "خواب سحر"، "اعتراف" اور "فکر" جیسی نظموں کے ساتھ دلوں میں اتر گئے اور ایک نسل کے جذبات و خیالات کا مجسم بن گئے انھوں نے اپنے قلیل عرصہ حیات میں نہ جانے کتنی نظمیں اور غزلیں ایسی کہہ دیں جنھوں نے انھیں اردو ادب میں لافانی بنا دیا لیکن یہ مول تول اور زرگری کی دنیا اور یہ زمانہ ایسا نہیں ہے کہ شاعر اس میں صحیح معنوں میں اپنے خلاق ذہن کے ساتھ زندہ و باور رہ سکے۔ چنانچہ یہی مجاز کے ساتھ بھی ہوا۔ شاعری انھیں شہرت دوام دے سکتی تھی اور یہ خصوصیت ان کے حصے میں آئی لیکن زر پرست معاشرے میں ایک ایسے انسان کو جو صرف ایک شاعر ہو، دینے کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔ سرمایہ داری کے تخریبی عمل نے مجاز کو بھی تباہ کیا۔ اور وہ ایک باعزت گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں کی خاطر عمر بھر ترستے رہے کڑھتے رہے اور اپنی ناکامیوں و نامرادیوں کے احساس شدید کو غالب کے اس شعر اور اپنی زندگی میں ہم طرحی دیکھتے ہوئے غرق مئے ناب کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ؎

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

مجاز کو دو ایک بار ملازمتیں بھی ملیں لیکن ESTABLISH MENT

کے اندرونی جوڑ توڑ، عصبیت و تنگ نظری، خشک فرائض اور بے جا پابندیوں نے کچھ ایسی صورتیں اختیار کر لیں کہ یہ ملازمتیں بھی برقرار نہ رہ سکیں اور زندگی بھر بے کاری، تنہائی کا ساتھ رہا۔ اس عالم میں ماں کی خوش نودی و دلجوئی حاصل کرنے کے سلسلے میں مجازؔ کی نفسیات ان کے اس چھوٹے سے جملے میں بھی کتنے واضح طور پر ابھر آئی ہے:

"ماں۔ اس گھر میں اب دو ہی لوگ بے کار رہ گئے ہیں ایک میں اور ایک تم ...؟"

حیات کی کشمکش اور تلخیوں کے ساتھ شراب نوشی بڑھتی گئی۔ دہلی کے دوران قیام دل نے ایک ایسی چوٹ کھائی جس کا زخم زندگی بھر مندمل نہ ہو سکا۔ غم جاناں و غم دوراں کی مسلسل ناکامیوں نے ان کے پورے وجود کو ایک ناسور بنا کر رکھ دیا تھا۔ شدت غم نے کئی بار اعصابی خلل (نروس بریک ڈاؤن) کی شکل بھی اختیار کر لی۔ گھر والوں نے ان کے زخم پر مرہم رکھنے کے لیے ان کی شادی کرنے کی کوششیں بھی کیں لیکن تہی دست شاعر کی پیش کش کون قبول کرتا۔ شاعر کو ہر بار شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ اور اس کے چہرے کی تابانی پر بے بسی کا پردہ گہرا ہوتا گیا۔ وہ چوٹیں کھاتے رہے اور خاموشی سے سب کچھ سہتے رہے۔ لیکن یہ خاموشی کب تک سہتے رہتے۔ انجام کار ۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو زندگی کی چوالیس۴۴ برسایتں جھیلنے کے بعد اور دنیا کی بے رحمی کا شکار ہو کر عوام کا یہ محبوب شاعر اپنے لافانی نقوش چھوڑ کر اس عالم آب و گِل سے رخصت ہو گیا۔

مجازؔ کی شاعری کی ابتدا فانیؔ کے زیر اثر ہوئی لیکن ان کے کلام میں کہیں بھی یاسیت کی وہ گہری تاریکی نہیں جو روایتی غزل گو شعرا میں عام تھی۔ اس کے برخلاف رجائیت، سربلندی کے جذبے، ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا جو حوصلہ اور امنگ مجازؔ کی شاعری کے بنیادی محرکات ہیں۔ زندگی کے درد و غم سے واقف ہو کر اور شکست دل کا تماشا دیکھ کر

کبھی انھوں نے جینے کا حوصلہ نہیں چھوڑا۔ اور ہمیشہ یہی کہتے رہے ے

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں

شاعر محفل وفا مطرب بزم دلبراں

مجاز کی شاعری اس دنیا اور اس کے عشق کی شاعری ہے اس طرح انھوں نے حُسن و عشق کا ایک نیا اور مادی تصوّر پیش کیا ہے۔ مجاز کی محبوبہ ایک ایسی عورت کے پیکر میں نظر آتی ہے جو نہ لطف محض ہے نہ قہر مسلسل۔ مجاز کا عشق جسمانی، ذہنی، ارضی و حقیقی ہے مگر تعیش کوش نہیں۔ مجاز نے جس عورت کا تصور پیش کیا ہے وہ عورت با عصمت، باکردار، پُر جلال ہونے کے ساتھ ساتھ محبت کے فطری تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہے شکست پیہم کے باوجود مجاز نے عورت کو بے وفائی کا الزام نہیں دیا بلکہ اس کی کمزوری کی ذمہ داری سماج کے فرسودہ نظام پر رکھی ہے

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی اُن زہرہ جبینوں سے

ہوئی جن سے نہ میرے شوق رسوا کی پذیرائی

مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے ان پاسبانوں سے

نہ لینے دی جنھوں نے فطرت شاعر کو انگڑائی

مجھے شکوہ نہیں آقادگانِ عیش و عشرت سے

وہ جن کو میرے حال زار پر اکثر ہنسی آئی

زمانہ کے نظام زنگ آلودہ سے شکوہ ہے

قوانین کہن آئین فرسودہ سے شکوہ ہے

مجاز اپنے عہد کے شعراء میں وہ تنہا شاعر ہیں جنھوں نے عورت کو کارزارِ زندگی میں پیچھے رکھنے کی کوشش کبھی نہیں کی اور نہ علم کو عورت کے حسن کی توہین سمجھا بلکہ انھوں نے اسے جد و جہد اور عمل پیہم کی دعوت دی اور مرد کے لیے محض عیش و عشرت کا ذریعہ نہ سمجھ کر اس کی سماجی اور انفرادی حیثیت اور اس کے مساواتی انسانی حقوق کو بھی تسلیم کیا۔ اردو شاعری

میں یہ تصور بالکل نیا تھا اور اس تحریک آزادی کی دین تھا جس نے
جھانسی کی رانی، بیگم حضرت محل وغیرہ سے لے کر سروجنی نائیڈو جیسی بے شمار
ہندوستانی خواتین کو جنم دیا تھا۔ اس لیے مجاز نے اپنی نظم "نوجوان
خاتون سے" میں کہہ دیا کہ ؎

ترے ماتھے کا ٹیکہ مرد کی قسمت کا تارہ ہے
اگر تو سازِ بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا
یہ تیرا زرد رخ یہ خشک لب یہ وہم یہ وحشت
تو اپنے سر سے یہ بادل ہٹا لیتی تو اچھا تھا
سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجاز کا عشق مادی اور مجازی ہے جو ہوسناکی سے بہت دور ہے۔
تصورِ حسن میں پیکر تراشی کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے ان کے خدوخال شوخ و
دلکش رنگوں سے بنائے گئے ہیں ساتھ ہی وہ انتہائی لطیف بھی ہیں۔ ان کی
محبوبہ سراپا حسن ہونے کے باوجود عاشق سے التفات و محبت کا سلوک کرتی ہے
اور اس کی بے جا حرکتوں پر فہمائش کرتی ہے۔ مجاز کو اس فرسودہ اور از کار
رفتہ معاشرے سے سخت شکایت ہے جس نے حسن کی لطافت اور عشق کی پاکیزگی
دونوں کو پابہ زنجیر کر رکھا ہے۔ پھر بھی وہ زندگی سے فرار کے بجائے
نظامِ کہن جو تباہیوں بربادیوں اور خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔ اسے بدل
دینا چاہتے ہیں۔ اس خیال کی بنا پر دعوتِ انقلاب دیتے ہوئے
کہتے ہیں: ؎

آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

یہاں مجاز کا اصل روپ نظر آتا ہے۔ رومان پرستی کے ساتھ بغاوت کی ہمت اور تغیر کا عزم دکھائی دیتا ہے۔ رومانیت یہاں حقیقت پسندی سے مل جاتی ہے اور ان کی SYNTHESIS انقلابی رومانیت... (REVOLUTIONARY ROMANTICISM) کی شکل میں ہوئی ہے۔ یہ جذبۂ بغاوت اس ظلم و تشدد کو ختم کرکے ایک نئے نظام کی تشکیل میں کوشاں نظر آتا ہے۔ "آوارہ"، "اندھیری رات کا مسافر"، "خواب سحر" وغیرہ اس رجحان کی اہم نظمیں ہیں۔

"آوارہ" اس بے کار نوجوان کی تصویر ہے جو اپنی نہ جانے کتنی آرزوئیں، امنگیں حسرتیں اور تمنائیں لے کر اپنی ہی بستی میں تنہا مارا مارا پھر رہا ہے مگر جینے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ پھر بھی ساتھ ہے ؎

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مجاز کی شاعری تحریک آزادی کی امنگوں اور ولولوں سے بھی ہم آہنگ ہے۔ انھوں نے سارے ہندوستان کے باشندوں کو آزادی کے لیے اس سامراجی حکومت کے خلاف، جس کے لیے تمام ہندوستانی عوام کے دل میں نفرت تھی، بغاوت پر آمادہ کیا، اور ساتھ ہی وہ حصول آزادی سے پہلے مذہب کی بے جا قید و بند کو مٹا دینے کی دعوت دیتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ یہ بے جا پابندیاں انسان کی فطری آزادی کا خون

کر دیتی ہیں ؎

کفر کیا تثلیث کیا، الحاد کیا اسلام کیا
تو بہر صورت کسی زنجیر میں جکڑا ہوا
توڑ سکتا ہو تو پہلے توڑ دے یہ قید و بند
بیڑیوں کے ساز پر نغمات آزادی نہ گا

اس بغاوت کے اظہار کے باوجود مجاز کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی سیاسی و سماجی نظمیں بھی ترنم، شستگی، روانی، سلاست، لطافت، آہنگ اور نغمگی سے کہیں بھی خالی نہیں بلکہ یہ ان کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں کہ رومانی و انقلابی دونوں نظموں میں کہیں بھی ان کے لحن اور موسیقیت میں کمی نہیں ہونے پائی ہے۔ اور نہ ہی ان کی نظموں میں کہیں جذباتی رنگ غالب آنے پایا ہے۔ بلکہ ہر جگہ ان کے لہجے کی شیرینی بانکپن اور سرمستی نمایاں ہے

بہر کیف مجاز کی تمام تر غزلوں اور سیاسی و سماجی نظموں میں ان کا اپنا ایک مخصوص لب و لہجہ اور متنوع انداز بیان ہے اور موضوع کے اعتبار سے پھیلاؤ اور وسعت ان کی شاعری میں نہ سہی لیکن اس کی گہرائی اور گرفت اور جذبہ کی گہرائی سے تو شاید ہی کوئی منکر ہو سکے۔ انسان انکی نظر میں سب سے اہم اور مقدم ہستی ہے اسی لیے مجاز تمام دنیا کے انسانوں کو مسرت سے لبریز اور سرشار دیکھنا چاہتے ہیں ؎

اب یہ ارماں کہ بدل جائے جہاں کا دستور
ایک اک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک اک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب و سمور
اب یہ بات اور ہے خود چاک گریباں ہوں میں

مجاز نے ایک قلیل عرصہ حیات کے باوجود جو ادبی مرتبہ حاصل کیا اس سے انکار ناممکن ہے۔ ان کی شاعری اس مختصر مگر اہم دور کی تاریخ پر محیط

ہے جو ۱۹۳۰ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک کی تاریخ کی ایک کڑی کی حیثیت سے باقی رہتا ہے۔ وہ اس مذکورہ بالا دور کے سب سے اہم شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے اس دور کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کو شاعری میں سمو کر تہذیبی تاریخ کا روپ دے دیا ہے جس میں نئی نسل کی سرکشی اور سرشاری سرایت کی ہوئی ہے۔ مجازؔ نے اپنی شخصیت کی نغمگی کو پورے دور کی نغمگی میں مدغم کر کے ایک آہنگ نو عطا کیا ہے۔

آخر میں مجازؔ کا تعارف خود ان کی زبان میں ہی پیش کر دینا بہتر ہو گا۔ جس سے ان کی بھرپور شخصیت سامنے آجاتی ہے اور ان کی شاعری کے اساسی خیالات اور نظریات عیاں ہو جاتے ہیں۔

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنس الفت کا طلب گار ہوں میں

خواب عشرت میں ہیں ارباب خرد
اور اک شاعر بیدار ہوں میں

عیب جو حافظ و خیام میں تھا
ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں

زندگی کیا ہے گناہِ آدم
زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

اہل دنیا کے لیے ننگ سہی
رونق انجمن یار ہوں میں

حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں
نوع انساں کا پرستار ہوں میں

آخر میں ہمیں یہی کہنا ہے کہ بقول ملک راج آنند :۔

"ادب (جو) انسانیت کے حصول کا، ذہنی، سماجی زندگی کے نشو و نما کا، شعور کے ارتقار کا اور خود ارتقار کا ایک وسیلہ ہے"۔ لہ

شعر و ادب کی ایسی خصوصیات نے مجاز کی شاعری میں جلا پائی اور پروان چڑھیں۔

لہ ہفتہ وار حیات۔ نئی دہلی جلد ۱۷، نمبر ۴۴ (۴ر نومبر ۱۹۷۹ء)

کتابیات

کتابیات

(اے)

1- INDIAN NATIONAL MOVEMENT AND CONSTITUTIONAL DEVELOPMENT OF INDIA BY R.N. AGGARWALA II EDDISION

2- KARL MARKS AND INDIA BY- KARL MARKS

3- INDIA TODAY BY RAJNI PAMDUTT

4. MAHATMA GANDHI BY ROMAN ROUAND

5. HISTORY OF INDIAN NATIONAL CONGRESS BY PATTBHAI RAMYYA

6- ADVENT OF INDEPENDENCE BY A.K MAJUMDAR

7- GANDHI BY P. BRIJNATH SH: A

8- SOCIAL PSYCOLOGY BY SECORD AND BACKMAN

9- ART AND SOCIAL LIFE BY G. PLEKHANOV

10- INDIAN PROBLEM BY REV. C.F. ANDREWS.

10(A) DICTIONARY OF LITERARY TERMS BY KARL BACKSON

10(B) Do — Do — BY ARTHUR

۱۱- نوائے آزادی - مرتبہ عبدالرزاق قریشی
۱۲- شعر الہند جلد اول از مولانا شبلی نعمانی
۱۳- ترقی پسند ادب از سردار جعفری
۱۴- ہندوستانی سوراج کے لیے جدوجہد از سبھاش چندر بوس
۱۵- گذشتہ لکھنؤ - از عبدالحلیم شرر
۱۶- اردو شاعری کا سماجی پس منظر - از ڈاکٹر اعجاز حسین
۱۷- مذہب و شاعری - از ڈاکٹر اعجاز حسین
۱۸- اپنی یادیں ردولی کی باتیں از علی محمد زیدی
۱۹- رسالہ صبا - حیدرآباد کانفرنس نمبر
۲۰- علی گڑھ میگزین - علی گڑھ نمبر
۲۱- ڈسٹرکٹ بارہ بنکی
۲۲- نقوش شخصیات نمبر ۵۵
۲۳- مجاز ایک آہنگ - مرتبہ صہبا لکھنوی
۲۴- مجاز فن و شخصیت - مرتبہ اختر نعمانی
۲۵- مجاز حیات و شاعری از منظر سلیم
۲۶- نقوش شخصیات نمبر ۵۹ - ۶۰ - اکتوبر ۵۶ء
۲۷- لکھنؤ کی پانچ راتیں - از علی سردار جعفری
۲۸- علی گڑھ میگزین مجاز نمبر
۲۹- شب تاب - مجموعہ کلام مجاز
۳۰- ادب اور تہذیب (مجاز - کچھ یادیں کچھ باتیں)
از: فرحت اللہ انصاری
۳۱- عشق مجازی از عصمت چغتائی (نئے ادب کے معمار)
۳۲- قومی آواز - مورخہ ۱۹ دسمبر ۵۵ء
۳۳- قومی آواز - مورخہ ۱ر دسمبر ۵۵ء

۳۴۔ قومی آواز۔ مجاز نمبر۔ دسمبر ۵۶ء
۳۵۔ نقوش مکاتیب نمبر ۵۶ء
۳۶۔ زیر لب از صفیہ اختر
۳۷۔ قومی آواز ۶؍ دسمبر ۵۵ء
۳۸۔ روشنائی از سجاد ظہیر
۳۹۔ پاسبان لکھنؤ۔ مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی (مجاز نمبر)
۴۰۔ جدید شاعری۔ از عبادت بریلوی
۴۱۔ مقدمہ شعر و شاعری از الطاف حسین حالی
۴۲۔ شاعر خصوصی نمبر ۷۷-۶۷-۵
۴۳۔ مجاز لطیفے از احمد جمال پاشا
۴۴۔ مجاز کے لطیفے از پرکاش پنڈت
۴۵۔ میری کہانی۔ جواہر لال نہرو
۴۶۔ شعریات (بوطیقا) از ارسطو۔ مترجمہ شمس الرحمان فاروقی
۴۷۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن
۴۸۔ زندگی اور ادب از ڈاکٹر ظل حسنین
۴۹۔ آب حیات از محمد حسین آزاد
۵۰۔ ترقی پسند ادب از عزیز احمد
۵۱۔ یادیں۔ از سجاد ظہیر و نیا ادب جنوری فروری ۴۱ء
۵۲۔ سویرا۔ لاہور۔ شمارہ ۸
۵۳۔ ادب اور انقلاب از اختر رائے پوری
۵۴۔ نیا ادب سہ ماہی۔ شمارہ (۱) ۴۳ء
۵۵۔ آہنگ۔ مجموعہ کلام مجاز
۵۶۔ عکس اور آئینے۔ از احتشام حسین
۵۷۔ اردو غزل گوئی۔ از فراق گورکھپوری۔

۵۸- ادب اور ادیب۔ از ڈاکٹر اعجاز حسین

۵۹- میراجی کی نظمیں۔ از میراجی

۶۰- کلیات اختر شیرانی

۶۱- مجموعہ کلام سردار جعفری

۶۲- کلیات نظیر اکبرآبادی

۶۳- کلیات میر

۶۴- کلیات ذوق

۶۵- کلیات اقبال

۶۶- کلیات ولی

۶۷- کلیات سودا

۶۸- دیوان غالب

۶۹- دیوان کلیم

۷۰- انتخاب کلام جوش

۷۱- مسدس حالی

۷۲- کلام شبلی

(ب)

۱- شاعر شہر نگاراں

۲- رود کوثر۔ از شیخ اکرام

۳- موج کوثر از شیخ اکرام

۴- میری کہانی۔ از جواہر لال نہرو

۵- افادی ادب از اختر انصاری

۶- ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمن اعظمی

۷۔ نیا ادب از کشن پرشاد کول
۸۔ ترقی پسند ادب از ہنسراج رہبر
۹۔ نئے زاویے از کرشن چندر
۱۰۔ نیا ادب کیا ہے۔ مرتبہ سبط حسن
۱۱۔ رپورٹ انجمن ترقی پسند مصنفین از ڈاکٹر عبدالعلیم
۱۲۔ اردو شاعری پر ایک نظر از کلیم الدین احمد
۱۳۔ نگار۔ جدید شاعری نمبر ۳۶ء
۱۴۔ رسالہ ہنس۔ ۱۹۳۵ء۔ مدیر پریم چند
۱۵۔ نیا ادب۔ ۴۰-۴۱۔ جنوری سے فروری تک۔
مرتبہ: سبط حسن (لکھنؤ)
۱۶۔ نیا ادب۔ خاص نمبر ۱۹۳۶ء
۱۷۔ آفتاب۔ علی گڑھ۔ ایڈیٹر ملک حامد حسین
۱۸۔ بیسویں صدی کا اردو ادب نمبر مرتبہ ملک حامد حسین
۱۹۔ آج کل۔ ۱۵، ۱ اپریل ۴۴ء
۲۰۔ ساقی۔ اپریل، مئی ۴۴ء (دہلی) مرتبہ شاہد احمد دہلوی
۲۱۔ ادب لطیف لاہور۔ مرتبہ مرزا ادیب سالنامہ ۴۸ء
۲۲۔ جھلکیاں۔ از محمد حسن عسکری
۲۳۔ نیا ادب سہ ماہی ۴۴ء مرتبہ قاضی عبدالغفار
۲۴۔ نیا پرچم کانفرنس نمبر جون ۴۹ء
۲۵۔ ہمارا ادب گورکھپور۔ جولائی ۱۹۵۳
۲۶۔ شاہراہ۔ مرتبہ۔ ساحر لدھیانوی ۴۸ تا ۴۹ء
۲۷۔ رسالہ ماحول۔ شمارہ ۱۳-۱۴۔ مرتبہ ظفر ادیب
۲۸۔ اردو شاعری اور مسائل زمانہ از ڈاکٹر ظل حسنین
۲۹۔ شاعری اور شاعری کی تنقید۔ از عبادت بریلوی

۳۰۔ نقد حیات۔ از ممتاز حسین

۳۱۔ نیا دور۔ بنگلور (مجاز کی شاعری)

۳۲۔ نیا دور۔ کراچی۔ (مجاز کی رومانی شاعری از احتشام حسین)

۳۳۔ نیا دور خاص نمبر ۳۶ء مصنفین کے حالات

۳۴۔ علی گڑھ تحریک از نسیم قریشی

۳۵۔ علی گڑھ اور سیاست ہند، از ڈاکٹر محمد اشرف

۳۶۔ اسباب بغاوت ہند از سرسید احمد خاں

۳۷۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد

۳۸۔ اردو ادب ۱۹۵۸ء ایڈیٹر آل احمد سرور (علی گڑھ)

۳۹۔ اردو ادب ۱۹۵۹ء ایڈیٹر آل احمد سرور (علی گڑھ)

۴۰۔ شاعر (آگرہ) ۱۹۵۰ء ایڈیٹر اعجاز صدیقی

۴۱۔ افکار۔ مجاز نمبر مرتبہ صہبا لکھنوی (کراچی)

۴۲۔ شبستاں مجاز نمبر

۴۳۔ علی گڑھ میگزین ۵۵-۱۹۵۶ء از نسیم قریشی

۴۴۔ دو ادبی اسکول از علی جواد زیدی

۴۵۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۴۶۔ لکھنؤ کی تہذیبی میراث از ڈاکٹر سید صفدر حسین

۴۷۔ تحقیق و تنقید (جدید) از اختر اورینوی

۴۸۔ ادبی تنقید از ڈاکٹر محمد حسن

۴۹۔ تنقیدیں از خورشید الاسلام

۵۰۔ تنقیدی زاویے از عبادت بریلوی

۵۱۔ نئے ادبی رجحانات از سید اعجاز حسین

۵۲۔ ادب اور نظریہ از آل احمد سرور

۵۳۔ نئے اور پرانے چراغ از آل احمد سرور

۵۴۔ ادب اور زندگی از مجنوں گورکھپوری

۵۵۔ نقوش و افکار از مجنوں گورکھپوری

۵۶۔ ادب اور سماج از سید احتشام حسین

۵۷۔ روایت اور بغاوت از سید احتشام حسین

۵۸۔ بوطیقا (ارسطو) از عزیز احمد (انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی)

۵۹۔ نیا ادب میری نظر میں۔ مرتبہ آغا سرخوش قزلباش۔

۶۰۔ غزل اور مطالعہ غزل از عبادت بریلوی

۶۱۔ غزل اور درس غزل۔ از اختر انصاری

۶۲۔ تنقیدی تناظر از ڈاکٹر قمر رئیس۔

۶۳۔ جدید تنقید اور اصول و نظریات از ڈاکٹر شارب ردولوی

۶۴۔ حقائق از (ڈاکٹر) پروفیسر گیان چند جین۔

۶۵۔ دلی کا دبستان شاعری از نور الحسن ہاشمی

۶۶۔ اردو ادب میں طنز و مزاح۔ از غلام احمد فرقت کاکوروی

67- SHORT HISTORY OF INDIAN NATIONAL CONGRESS BY M.V. RAMAN RAO

68 INDIAN NATIONAL MOVEMENT BY - JEOTI PRSAD

69 INDIAN MUSLIM BY DR. MUJEEB.

70 ART AND LITERATUR BY KARL MARHS AND ANGLE

71 MARKISM AND POETRY BY GEORGE THOMSON

72 ANOTOMY OF MELONCHOLY BY PRAZ

73 DECLINE OF ROMANTICAL IDEALS BY - C.N. BAWRA

74 - PSYCOGY BY ABRAHAM - P. SPE MADE

75 - THE FIRST TOW KINGS OF OUDH BY - A.L. SRIVATVA

75 - THE DAWN OF A NEW AGE BY W.W. PEARSON

77 - POETRY OF PHILO SOPHY BY KARL MARKS.

میں معیزہ عثمانی کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میرے دوست کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سے زیادہ اس عہد کے ایک خوبصورت نغمے کو پہچاننے کے لئے قلم اٹھایا ہے۔

سردار جعفری
بمبئی

مجھے خوشی ہے کہ معیزہ عثمانی نے مجاز پر تحقیقی مقالہ لکھ کر الٰہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور اس طرح انھوں نے مجاز کے بارے میں تمام مواد کو یکجا کر کے ان کی شاعرانہ اہمیت کے بارے میں نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں ان کی اس ادبی کاوش کے لئے انھیں مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ کوشش ادبی حلقوں میں پسند کی جائیگی اور اس طرح کے کاموں کی طرف دوسرے لکھنے والوں کو متوجہ کریگی

شارب ردولوی
دلی

مجاز کی زندگی اور شاعری پر یہ پہلی کتاب ہے جس میں زندگی اور شاعری دونوں کے تمام پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب بے حد اہم بن جاتی ہے۔
معیزہ نے اس کتاب میں اپنی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا بھرپور ثبوت فراہم کیا ہے حالات کا تجزیہ کرنے، زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے شخصیت کی گرہیں کھولنے اور شخصیت و شاعری کے باہمی رشتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی جو کوشش انھوں نے کی ہے اسے دیکھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ مستقبل میں ان سے بہت ساری امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں

اجمل اجملی
اوکھلا دلی

PRICE : Rs. 35

تصویر بہ شکریہ آرٹ صاحب
پبلی کیشن ڈویژن دلی